لہو کی موجیں
کربلا کی لہو رنگ داستان
محمّد علی سیّد

بسم الله الرحمن الرحيم

مدینے کے یزیدی گورنر ولید بن عقبہ
نے یزید کی بیعت کا مطالبہ کیا تو
امام حسین علیہ السلام نے فرمایا:

"ہم خاندانِ نبوت، سر چشمۂ رسالت، فرشتوں کی آمد و رفت کا مرکز اور رحمتِ خدا کے نازل ہونے کا مقام ہیں۔ خداوندِ متعال نے اسلام کو ہمارے ہی خاندان سے شروع کیا اور ہمارے ہی ہمراہ آخر تک لے جائے گا جب کہ یزید جس کی بیعت کا تم مجھ سے مطالبہ کر رہے ہو، ایک شراب خور انسان ہے۔ اس کے ہاتھ بے گناہ افراد کے خون سے آلودہ ہیں۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جس نے احکام خداوندی کی حدود کو توڑا ہے اور علی الاعلان لوگوں کے سامنے فسق و فجور میں مبتلا ہوتا ہے (جان لو) کہ مجھ جیسا شخص یزید جیسے کی بیعت نہیں کر سکتا۔" (طبری ج ۷ ص ۲۱۷۔۲۱۸)

لہو کی موجیں

محمّد علی سیّد

دوسرا ایڈیشن

یہ ناول ماہنامہ معصوم اسلام آباد اور ماہنامہ خواجگان لاہور میں

"نقاب پوش"

کے نام سے قسط وار شائع ہوتا رہا ہے۔

کتاب کا نام	لہو کی موجیں
مصنف	محمد علی سید
پہلا ایڈیشن	ایک ہزار
اشاعتِ اول	اپریل ۲۰۰۰ء
دوسرا ایڈیشن	ایک ہزار
اشاعتِ دوم	اپریل ۲۰۰۱ء
کمپوزنگ	ثاقب پرنٹرز۔ ناظم آباد کراچی
سرورق	امتیاز عباس نقوی
لے آوٹ	اسلم رضا
طباعت	العصر پبلشرز۔ ناظم آباد کراچی

فرات پبلشرز

F-14 رضویہ سوسائٹی۔ ناظم آباد کراچی

ای میل: alisyed @ hotmal.com

شرفِ انتساب

اللہ رب العالمین کا فضل و احسان ہے
کہ میں اپنی اس دوسری کتاب کو
امام زمانہؑ، ولی عصرؑ، قائم آلِ محمدؐ حضرت حجت ابن الحسنؑ
کے توسط سے ان کی جدّۂ محترمہؑ
جنابِ زہرا صلوات اللہ علیہا کی خدمتِ اقدس میں
پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔
کسی عطا کرنے والے سے
اسی کی عطا کردہ نعمتوں پر انعام و اکرام کی امید کرنا
بہ ظاہر عجیب سا لگتا ہے!
کربلا کے لازوال اور لافانی خزانوں میں
اپنی ان ٹوٹی پھوٹی سطروں کو پیش کرنا ایسا ہی ہے
جیسے کوئی ملازم گھر کی صفائی کے دوران ملنے والی
معمولی رقم اٹھا کر گھر کی مالکن کو دے دے۔
گھر کے ملازم اسی طرح اپنی ایمان داری جتانے کی
کوشش کرتے ہیں۔
آپ رحمت للعالمینؐ کی صاحبزادی،
امیر المؤمنینؑ کی شریکِ حیاتؑ
اور کائنات پر حکمرانی کرنے والے
گیارہ اماموںؑ کی ماں ہیں۔

اپنی کارگزاری دکھانے کی اس معمولی سی کوشش کو
آپ نے شرفِ قبولیت عطا کیا
تو میری، میرے والدین اور میرے بیوی بچوں کی
ابدی زندگی آرام و آسائش سے گزرے گی۔
اور جب آپ جیسی ہستی سے مانگ رہا ہوں
تو اپنے دوستوں، پڑوسیوں، رشتے داروں،
اس کتاب کے پڑھنے والوں اور اس کی اشاعت
کے مختلف مرحلوں میں کام اور مدد کرنے والوں
کے لیے بھی اسی انعام و اکرام
کا طلب گار ہوں
جو آپ اپنے اس ملازم کو عطا کریں۔
ہم گناہ گار بھی ہیں اور آپ کے مجرم بھی۔
لیکن شہزادی! صبح عاشور طلوع ہونے تک
حر ابنِ یزید ریاحیؒ بھی تو ہم ہی جیسا تھا!
ہم سب بھی آپ کے فرزند حسین ابن علیؑ
کی توجہ کے محتاج ہیں،
زندگی میں بھی، قبر میں بھی، حشر میں بھی
اور کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی
کے ایک ایک لمحے میں بھی۔

اس ناول کی تیاری میں بنیادی طور پر درج ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

	کتاب	مصنف	ناشر
۱۔	چودہ ستارے	مولانا نجم الحسن کراروی	امامیہ کتب خانہ، لاہور
۲۔	مقتل ابو مخنف	مترجم: تبشر رضا کاظمی	ثقلین پبلی کیشنز، اسلام آباد
۳۔	اشقیائے فرات	فیض الحسن موسوی انبالوی	دبستان انیس، پنڈی
۴۔	ریاض الاحزان	آقائے سید محمد حسن قزوینی	ولی العصر ٹرسٹ۔ جھنگ
۵۔	قیام امام حسینؑ کا جغرافیائی جائزہ	سید علی شرف الدین موسوی	دار الثقافہ، کراچی

اس ناول میں بیان کیے گئے واقعات کو عالمِ اسلام کی درج ذیل شہرہ آفاق کتابوں میں بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ روضۃ الشہداء ۲۔ بحار الانوار ۳۔ کبریت احمر ۴۔ صواعقِ محرقہ
۵۔ کشف الغمہ ۶۔ ناسخ التواریخ ۷۔ انوار المجالس ۸۔ خلاصۃ المصائب
۹۔ تاریخ کامل ۱۰۔ الدمعۃ الساکبہ ۱۱۔ نور الابصار ۱۲۔ مطالب السئول
۱۳۔ نور العین ۱۴۔ تاریخ ابو الفداء ۱۵۔ حیات الحیوان ۱۶۔ جلاء العیون
۱۷۔ طبری ۱۸۔ تاریخ اعثم کوفی ۱۹۔ مقتل عوالم ۲۰۔ ذکر العباسؑ
۲۱۔ تاریخ ابن الوردی ۲۲۔ وسائل مظفری ۲۳۔ ینابیع المودۃ

فہرست

محمد علی سید کی یہ تحریر آسان زبان میں واقعہ کربلا کی تصویر بنانے کی ایک عاجزانہ کوشش ہے۔ اس عظیم سانحہ کو الفاظ کی مدد سے مکمل طور پر بیان کرنا تو شاید کسی کے لئے بھی ممکن نہیں لیکن اس کتاب کو پڑھنے کے بعد کربلا کے بارے میں کب، کیوں، کہاں اور کیسے جیسے بنیادی سوالوں اور ان کے ذیل میں اٹھنے والے بہت سے دوسرے سوالات کے جواب آپ کو ضرور مل جائیں گے۔

زبانیں پھولوں سے لدی پھندی اس بیل کی طرح ہوتی ہیں جن کے اوپری سرے پر تازہ کلیاں اور کونپلیں پھوٹتی رہتی ہیں اور نچلا سرا بتدریج پھولوں پتوں سے خالی ہوتا جاتا ہے۔ آج ہماری زبان ہرگز وہ نہیں جو آج سے ساٹھ ستر برس پہلے لکھی بولی اور سمجھی جاتی تھی جب کہ دینی و مذہبی موضوعات پر آج بھی زیادہ تر کتابیں اسی زبان اور انداز میں تحریر کی جارہی ہیں۔ عربی اور فارسی کے علمی ذخیروں سے جو کتابیں اردو زبان میں ترجمہ ہورہی ہیں ان کا معاملہ زیادہ سنگین ہے۔ یہ کتابیں خواص کی سمجھ میں ضرور آتی ہوں گی لیکن عربی اور فارسی کا پس منظر نہ رکھنے والے عام طلبہ، بچے، گھریلو خواتین، نوجوان، بزرگ، ڈاکٹرز، انجینئرز، ملازمت پیشہ لوگ یا کاروباری افراد ان کتابوں سے کم ہی استفادہ کرپاتے ہیں۔

محمد علی سید نے آسان اور زندہ زبان میں لکھنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ قرآن، تفسیر، تاریخ، سیرت، اخلاق، احکامات اور سائنس جیسے مشکل موضوعات پر صحت اور سند کے ساتھ آسان زبان اور دلچسپ انداز بیان میں لکھنا توفیق ایزدی کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ یہ سارے موضوعات بچوں کے رسالے ''معصوم'' میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور ہر گھر میں دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔

فرات پبلشرز نے محمد علی سید کے اسی طرز تحریر کی بنا پر اس تاریخی ناول کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس تحریر کو پڑھنے کے بعد آپ ہماری نظر انتخاب کی داد ضرور دیں گے۔ یہ ناول، فرات پبلشرز کی اشاعتی خدمات کا نقطۂ آغاز ہے۔ مستقبل قریب میں انشاء اللہ ہم ایسی ہی مستند معتبر، پر اثر تحریریں آپ کی خدمت میں پیش کرتے رہیں گے۔

کتاب کے مطالعے کے دوران جب آپ کو رخساروں پر بہتے آنسوؤں کی موجودگی کا احساس ہو تو تمام مومنین و مومنات کے لئے دعا کرتے وقت ہمیں بھی ضرور یاد رکھئے گا۔

احمد علی واسطی
فرات پبلشرز۔ کراچی

حجۃ الاسلام والمسلمین علّامہ طالب جوہری کی رائے

اس ناول کے بارے میں حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ طالب جوہری کی رائے

محمد علی سید پچھلی دو دہائیوں سے ایک معروف قلم کار اور معتبر صحافی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں لیکن میں انھیں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ ایک خوش فکر شاعر بھی تھے اور چند بے حد پُر اثر طویل کہانیوں کے مصنف بھی۔ پھر اچانک ہی ان کا ذہنی رویہ تبدیل ہوا اور انھوں نے فلسفۂ دعا پر ایک طویل مقالہ تحریر کیا جو بعد میں "رب العالمین، دعا اور انسان" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ زیر نظر کتاب "لہو کی موجیں" محمد علی سید کے قلم کا ایک تازہ نمونہ ہے۔ یہ کتاب ایک ایسے واقعے پر مشتمل ہے جو کائنات کا سب سے سچا اور انوکھا واقعہ ہے۔

سچی کہانیوں کے بیان کی روایت بہت قدیم ہے۔ شاید تاریخ انسانی کے گمنام ماضی کے اس عہد سے کہانیاں انسان کی ہم سفر ہیں جب تہذیب انسانی گھٹنیوں چلنا سیکھ رہی تھی۔ سچی کہانیاں آسمانی کتابوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ قرآن مجید نے تو خصوصیت کے ساتھ سچے قصوں کو اپنا موضوع بنایا ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات کو احسن القصص کہا گیا۔ قرآن کتاب ہدایت ہے۔ اس کے قصوں کا مقصد حصول عبرت، کائنات میں تدبر، ماضی سے آگاہی، حال کی منصوبہ بندی اور مستقبل کی تعمیر ہے۔ اس بات سے ہم یہ استنباط کرنے میں حق بہ جانب ہیں کہ صحیح حدود میں رہتے ہوئے قصوں کا بیان کرنا ایک مستحسن اور مثبت اقدام ہے۔

ناول کے متعلق یہ عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا مواد فرضی واقعات پر مبنی ہوتا ہے لیکن انسائیکلوپیڈیا کے مطابق "ناول" نثر میں بیان شدہ ایسے قصے کو کہا جاتا ہے جو اپنی طوالت کے سبب ایک یا ایک سے زائد جلدوں پر مشتمل ہو۔ اس کے کردار فرضی یا خیالی بھی ہو سکتے ہیں اور بالکل سچے اور حقیقی بھی۔

اردو زبان کے متعدد ادیبوں نے ناول کی مخصوص فارم سے استفادہ کرتے ہوئے ضخیم تاریخی ناول تحریر کیے ہیں۔ یہ ناول آج بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں لیکن ان میں بیان کردہ واقعات کی سچائی بیشتر صورتوں میں مشکوک نظر آتی ہے۔ بہت سے لکھنے والے انہی تاریخی ناولوں کی مدد سے اصل تاریخ کو مسخ کرنے یا بہت سے حقائق کو مشکوک بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

محمد علی سید کا یہ ناول "لہو کی موجیں" تاریخ انسانی کے ایسے سچے کرداروں پر مشتمل ہے جو اسلام کے اصل ہیرو ہیں اور جن کے سچے جذبوں، بے مثال قربانیوں اور پیغام کو روکنے، مسخ کرنے، حقائق کو دھندلانے یا ان واقعات کی اثر انگیزی کو کم سے کم کرنے کیلئے سرکاری مورخوں کی ایک فوج ظفر موج گزشتہ چودہ سو برس سے بھرپور وسائل اور بے پناہ قوت کے ساتھ مصروف عمل رہی ہے۔ اس کے برعکس موجودہ زمانے کے مطابق جدید اسلوب بیان اور عام فہم زبان میں اپنے قلم کے ذریعے حق بیان کرنے والوں کی صفیں غیر منظم اور بے ترتیب نظر آتی ہیں۔

گہرے علمی و تحقیقی مقالوں کی اہمیت اپنی جگہ لیکن آج ہمیں عام فہم زبان اور جدید اسلوب میں لکھنے والوں کی بھی سخت ضرورت ہے۔ تراجم سے قطع نظر اردو زبان میں ایسے لکھنے والے مفقود نہیں تو کمیاب ضرور ہیں جن کی تحریریں محمد علی سید کی تحریروں کی طرح عام قاری کے دل کو چھو سکیں، اس کی روح کو جھنجھوڑ سکیں۔

مجموعی طور پر یہ کتاب عزائی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اس لئے کہ جو روح اس پوری کتاب میں جاری و ساری ہے وہ ہے حسین شناسی، کربلا شناسی اور اس کے نتیجے میں خود شناسی۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری نسل نو خاص طور پر اس کتاب کا خاطر خواہ خیر مقدم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کتاب کے مندرجات میں بھی غور و فکر کرے گی۔ میں درگاہ خداوندی میں دست بہ دعا ہوں کہ محمد علی سید بہ طفیل آئمہ طاہرینؑ بیش از پیش علم و دین کی خدمت کی توفیق حاصل کرتے رہیں۔

طالب جوہری

۱۱ فروری ۲۰۰۱ء

اس کتاب کے بارے میں

معروف دانش ور، ادیب اور شاعر

پروفیسر سردار نقوی کی رائے

محمد علی سید ہمارے عہد کے ایک معتبر قلم کار ہیں۔ ان کی تخلیقات ایک طویل مدت سے ملک کے موقر ادبی جریدوں میں اشاعت پذیر ہو کر قارئین سے داد تحسین وصول کرتی رہی ہیں۔ گذشتہ پانچ سال سے وہ بچوں کے لئے شائع ہونے والے رسالے ماہنامہ ''معصوم'' کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ابھی حال ہی میں انہوں نے نوجوان نسل کی خواتین کے لئے شائع ہونے والے جریدے ''طاہرہ'' کی ادارتی ذمہ داریاں بھی قبول کرلی ہیں۔ ان دونوں جریدوں کا صوری اور معنوی حسن ان کی ادبی اور ادارتی صلاحیتوں کی گواہی کے لئے کافی ہے۔

محمد علی سیّد ایک ایسے قلم کار ہیں جنہیں صرف لکھنے کا شوق ہی نہیں پڑھنے کا ذوق بھی ہے اس لیے ان کا گلشن تحریر الفاظ کے پھولوں سے مزین ہونے کے ساتھ ساتھ افکار کی خوشبو سے معطر بھی ہے۔ ان کی تخلیقات میں فکر اور اسلوب کا تعلق خوشبو اور پھول کی طرح لطیف ہے اس لیے ان کی تحریروں میں ثقالت کی بجائے لطافت کا حسن پایا جاتا ہے۔ ان کی نثر کی نمایاں خوبی سلاست اور روانی ہے۔ وہ مشکل مضامین کو آسان زبان میں بیان کرنے کا فن جانتے ہیں اسی لیے ان کی تحریروں کو پڑھ کر بے ساختہ یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

عہد جدید جسے سائنس اور ٹیکنالوجی کا عہد کہا جاتا ہے اب انفارمیشن ٹیکنالوجی کے عہد میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اہل مغرب اس عہد کو اطلاعات کے عہد (Age of Information) کے نام سے موسوم کر رہے ہیں۔ اس عہد کی نمایاں خصوصیات (مسئلہ) مغرب کی وہ ثقافتی یلغار ہے جس نے مشرق کی دینی اور تہذیبی اقدار کو سنگین بحران سے دوچار کر دیا ہے۔ محمد علی سیّد کو اس مسئلے کا گہرا ادراک اور شعور حاصل ہے، اس کے ساتھ ہی وہ اپنی مسئولیت کا شعور بھی رکھتے ہیں اور اس مسئلے سے نمٹنے کے لئے اپنے قلم کی تمام

رعنائیوں اور توانائیوں کو بروئے کار لانے میں مسلسل مصروف اور منہمک نظر آتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب انہی کوششوں کا ایک تسلسل ہے۔ اس کتاب کا موضوع واقعۂ کربلا ہے اور اسے ناول کے اسلوب میں تحریر کیا گیا ہے، یہ ناول بچوں کے رسالے "معصوم" میں قسط وار چھپتا رہا ہے، اب اسے کتابی صورت میں مدون کر کے شایع کیا جا رہا ہے۔

ابھی حال ہی میں کربلا کے حوالے سے تحریر کردہ عصمت چغتائی کا ناول "ایک قطرۂ خون" ادبی حلقوں میں موضوع گفتگو رہا ہے، اس سے قبل پریم چند کے ناول "کربلا کے چاند" کی بھی خاصی شہرت رہی، لیکن محمد علی سیّد کے ناول کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ناول کا اسلوب اختیار کیے جانے کے باوجود تاریخی صحت کا اہتمام کیا گیا ہے تا کہ قارئین، خصوصاً نئی نسل کے قارئین کے سامنے کربلا کے واقعات کا ایسا خاکہ پیش کیا جا سکے جو تاریخی اعتبار سے درست اور صحیح ہو۔

محمد علی سیّد کے اس ناول کی نمایاں خصوصیت واقعات کی تاریخی صحت ہے لیکن ہر واقعے کے کچھ محرکات ہوتے ہیں اور کچھ مضمرات۔ محرکات سے مراد وہ اسباب و عوامل ہیں جو اس واقعے کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتے ہیں اس لئے کسی واقعے کی معنویت اور اہمیت کو سمجھنے کے لئے اس کے محرکات اور مضمرات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ زیر تبصرہ ناول میں واقعۂ کربلا کے محرکات اور مضمرات پر جو روشنی ڈالی گئی ہے وہ مصنف کے تاریخی شعور کی گیرائی اور بصیرت فکر کی گہرائی کا نہایت روشن ثبوت ہے۔

واقعۂ کربلا اپنی اہمیت اور معنویت کے اعتبار سے تاریخ اسلام کا ایک منفرد واقعہ ہے، محمد علی سیّد نے کربلا کی معنویت کو حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی قربانی کی روایت کے تناظر میں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، اس تناظر میں کربلا کی حقیقت خود دین اسلام کی حقیقت کا مظہر نظر آتی ہے بقولِ اقبال

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم — نہایت اس کی حسینؑ ابتدا ہیں اسمٰعیلؑ

کربلا نے حقیقی اسلام اور حکومتی اسلام کے درمیان شہادت کے لہو سے خط فاصل کھینچ کر حقیقی اسلام کی ابدیت کو استقلال اور استحکام عطا کر دیا۔

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری — بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

کوفی و شامی دین کی ایسی تعبیر پیش کر رہے تھے جس کا مقصد دنیا کا حصول تھا جبکہ پیغمبر اسلامؐ کے چھوٹے نواسے حسین ابن علیؑ اسلام کی اس ابدی حقیقت کے وارث اور محافظ تھے جو تمام انسانیت کے لئے

حریت، عدل اور امن کی بشارت ہے۔ امام حسینؑ کا مقابلہ اس مفاد پرست گروہ سے تھا جو دولت و اقتدار کے بتوں کی پرستش کرتا تھا مگر جس کے چہرے پر اسلام کی نقاب تھی۔ اس نقاب پوش گروہ کی اصلیت اور اس کی باطنی حالت کا نقشہ محمد علی سیّد نے اس طرح کھینچا ہے۔

"یہ لوگ بلا کے چالاک، بے رحم اور میڈیا کی جنگ کے ماہر تھے"

محمد علی سیّد خود ایک ایسے دور سے متعلق ہیں جو میڈیا کی جنگ کا دور ہے اس لیے وہ اس جنگ کی اہمیت اور میڈیا کے ہمہ گیر اثرات سے اچھی طرح واقف ہیں، میڈیا کی جنگ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنانے کا موثر ذریعہ ہے، حقیقی اسلام کو حکومتی اسلام میں بدلنے والا گروہ، اسلام کی حقیقی تعلیمات کو مسخ کرنے کے درپے تھا اہل بیتؑ اس (اسلام حقیقی) کے وارث اور محافظ تھے اس لیے یہ گروہ ان کے خلاف لوہے کی تلواروں کے ساتھ پروپیگنڈے کا ہتھیار بھی استعمال کر رہا تھا۔

مفاد پرستوں کے نقاب پوش گروہ کے پاس ہر طرح کے مادی اسباب تھے۔ ان کی فوجوں کی تعداد بہت کثیر تھی، ان کے پاس مادی اسلحے کی فراوانی تھی اور ان کی پروپیگنڈا مشنری بہت موثر تھی۔ رسولؐ اسلام کے نواسے حسینؑ ابن علیؑ نے حق و باطل کی اس معرکہ آرائی میں اپنے لئے اس راستہ کا انتخاب کیا جس کی منزل اول منیٰ اور منزل آخر کربلا ہے۔

محمد علی سیّد نے ان حقائق کو سمجھنے میں دقت نظر سے کام لیا ہے لیکن اس کے بیان کرنے میں سلاست اور روانی کا ایسا حسین پیرایہ اختیار کیا ہے جو دل کش ہونے کے ساتھ دل گداز بھی ہے۔ اس حوالے سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔

> "شہیدوں کے لہو کی موجیں فرعون کو اس کے لاؤ لشکر سمیت ہمیشہ کے لیے غرق کرنے کے لئے بے چین تھیں لیکن اس نئے فرعون کو دریائے نیل میں نہیں، نہر فرات میں ڈوب کر فنا ہونا تھا۔"

> "کربلا میں ڈوبنے والے آفتاب امامت کی روشنی نے بے خبری اور بے عملی کے اندھیروں میں سوئے ہوئے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنا شروع کر دیا تھا۔ ضمیر جاگنے لگے تھے، سوئے ہوئے جذبے بیدار ہو رہے تھے، یزیدی حکومت کے پروپیگنڈے کا جادو ٹوٹ رہا تھا۔"

"یزیدی حکومت واقعہ کربلا کو ایک صحرا میں دفن کر دینا چاہتی تھی لیکن امام حسینؑ کی جرأت اور بہادری، دین الٰہی سے محبت، یزیدی فوجوں کے ظلم تشدد اور امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی مظلومیت کی کہانی کربلا کے ریگزاروں سے نکل کر انسانوں کے دلوں کو فتح کرتی جا رہی تھی۔"

لہو کی موجوں کا سفر چودہ سو سال سے مسلسل جاری ہے۔ امام حسینؑ اور ان کے انصار و اقرباء کی مظلومیت کی کہانی انسانوں کے دلوں کو مسلسل فتح کیے جا رہی ہے۔ محمد علی سید کا ناول اس فتح کا اعلان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مزید امکانات کی نشاندہی کر رہا ہے۔ اس ناول کے ذریعہ انہوں نے اپنے قلم کی حرمت کو مزید اعتبار عطا کیا ہے۔ ان کی تحریر اس امر کی گواہی دے رہی ہے کہ ان کے قلم کا شجرۂ نسب اس قلم سے ملتا ہے جس کی قسم قرآن میں کھائی گئی ہے اور جس کی تعریف جوش ملیح آبادی کے اس شعر میں کی گئی ہے۔

اے قلم آخری لمحے کی تمنائے رسولؐ　　　نام تیرا سببِ جنبشِ لب ہائے رسولؐ

○

محلے کی چٹائیوں والے سرکاری اسکول سے محمد علی سیّد نے جو سفر شروع کیا تھا، وہ ''معصوم'' اور ''طاہرہ'' جیسے تہذیبی رسائل کی معصوم و طاہر گزرگاہوں سے ہوتا ہوا اس تاریخی ناول تک پہنچا ہے جس میں ''لہو کی موجیں'' کربلا کے افق سے اکیسویں صدی کی دہلیز تک آچکی ہیں۔

میرے لیے یہ جستجو ہمیشہ توجہ طلب اور زیادہ اہم رہی ہے کہ تخلیق کے پیچھے جس ہاتھ کے قلم کی توانائی ہے، وہ کس شخصیت کا ہاتھ ہے اور یہ شخصیت، شخص سے شخصیت تک، گردش زمانہ کی کن کروٹوں کے درمیان گزرتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے۔ اس کے تہذیبی سماجی و نفسیاتی محرکات میں ہمیں وہ سرا مل جاتا ہے جس سے تخلیق کا لنگر بندھا ہوتا ہے۔

شخصیت کا مطالعہ عموماً اس بستی، گاؤں یا شہر کے تذکرے سے شروع کیا جاتا ہے جہاں وہ پیدا ہوئی ہے جبکہ میری دانست میں وہ جگہ اور اس جگہ کے تاریخی و فکری آثار زیادہ اہم ہوتے ہیں جہاں اس شخصیت نے شعور کی آنکھیں کھولی تھیں۔

سندھ میں خیرپور میرس اس اعتبار سے ایک جداگانہ تہذیب کا مرکز تھا جہاں کئی بڑے گھرانے ہجرت کر کے آباد ہوئے۔ محمد علی سیّد کی پیدائش (۲۲ جنوری ۱۹۴۷ء) اگرچہ سہارنپور میں ہوئی اور یہ شہر ان کی بنیاد تھا، لیکن بنیاد کے بعد تعمیر کے جو مراحل ہیں ان کا آغاز خیرپور میرس کی سرزمین سے ہوا۔ انہوں نے خیرپور کے محلّہ بھرگڑی میں ہوش سنبھالا، ذہن کے دریچے یہیں کھلے اور شعور کی کونپلیں بھی یہیں پھوٹنا شروع ہوئیں۔

تقسیم کے بعد جو گھرانے ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے وہ اپنے ساتھ مال و زر، سامان خورد و نوش اور زیورات لے کر نہیں آئے لیکن انہوں نے اپنے آباء و اجداد کے علمی اور ادبی ورثے کی حفاظت کی اور اس خاندانی میراث کو جسم و روح سے جدا نہیں کیا۔ کتابوں کے نایاب ذخیروں کے ساتھ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مرثیوں کے لاتعداد نسخے بھی پاکستان منتقل ہوئے اور چیدہ چیدہ مرثیہ نگار بھی اس نئی مملکت کا حصہ بن گئے جن میں خیرپور کے حوالے سے حضرت نسیم امروہوی کا نام زیادہ تابناک ہے۔ انہوں نے سندھ میں مرثیے کو بہت ترقی دی۔ ان کے بعض عقیدت مند انہیں، ''انیسِ دوراں'' کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔

ان کے عہد میں خیرپور میں جن افراد نے فن تحت اللفظ کو عروج پر پہنچایا ان میں سیّد علی اسد نقوی مرحوم کا نام سب سے نمایاں ہے جن کے تحت اللفظ کی تعریف خود حضرت نسیم امروہوی نے ایک نظم میں کی۔ محمد علی سید ذاکر اہلبیتؑ سید علی اسد نقوی مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔

وحید عصر رواں ذاکری کی منزل میں
فرید مرثیہ خوانی کے کارواں میں اسدؔ
انیس کا وہ سخن اور تری ادائے نفیس
زباں تھی موجۂ کوثر ترے دہاں میں اسدؔ
رجز حبیبؑ کا پر رعب جیسے پیری میں
وہ طنطنہ تھا ترے لہجۂ جواں میں اسدؔ
شباب مرثیہ خوانی کا تھا ضعیفی میں
بہار جذب تھی گویا تری خزاں میں اسدؔ

محمد علی سیّد نے 1963 میں ناز ہائی اسکول خیرپور سے میٹرک کیا۔ انٹر اور بی۔اے کی تعلیم کراچی سے مکمل کی۔ نشریاتی ادارے سے ذریعۂ معاش کا آغاز ہوا۔ یہ ستر کی دہائی تھی جب ریڈیو پاکستان کا کراچی اسٹیشن یاور مہدی کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ بزم طلبا کی بڑی دھوم تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ٹیلی ویژن کی اسکرین نے ذہنوں کو اپنی گرفت میں نہیں لیا تھا۔ یاور مہدی کی نظر انتخاب نے محمد علی سیّد کو اسسٹنٹ پروڈیوسر کی حیثیت سے بزم طلبا میں لے لیا۔ تحت اللفظ مرثیہ خوانی کی ساعتوں میں پرورش پانے والے ذہن نے بزم طلبا میں صرف طلبا ہی نہیں اساتذہ تک کے تلفظ درست کیے۔ بزم طلبا سے ورلڈ سروس تک پہنچے۔ یہاں ہر طرح کے پروگرام کیے۔ بعض مواقع پر صدر اور وزیراعظم کی تقاریر کی ایڈیٹنگ بھی کی۔ لیکن مملکت کے اہم ترین نشریاتی ادارے سے وابستگی کی تان یہاں آکر ٹوٹی کہ 1978 میں ایک نااہل پروڈیوسر کی ماتحتی قبول کرنے سے انکار کر دیا اور استعفیٰ دے دیا۔ علامہ طالب جوہری کے مشورے پر جون ایلیا اور زاہدہ حنا انہیں عالمی ڈائجسٹ میں لے گئے۔ یہ اشاعتی اداروں سے وابستگی کا آغاز تھا۔ یہاں قلم کی توانائی سے کام لینے کے امکانات زیادہ تھے۔ لکھنؤ کے شب و روز پر ایسی زندہ کہانیاں لکھیں کہ خود اہلِ لکھنؤ ایڈیٹر کے نام خطوط میں دریافت کرتے تھے کہ یہ صاحب لکھنؤ کے کس محلے میں رہتے ہیں۔ عالمی ڈائجسٹ مالی بحران کا شکار ہوا تو ماہنامہ سچی کہانیاں اور دوشیزہ ڈائجسٹ میں بطور ایڈیٹر کام کرنے لگے۔ سہام مرزا نے روزنامہ

سویرا میں ۔ ۔ین ایڈیٹر بنادیا۔ اس تان یہاں ٹو فحاشی خلاف ورس ول ۔ رسے اخلاقی جہاد کے لئے جو قلم اٹھایا تھا اس نے معاش کے سلسلے بھی منقطع کردیے۔ گردش زمانہ نے معاشی تنگ دستی میں کچھ اور بھی سنگ میل طے کرائے۔

اسی تھکا دینے والے سفر میں ایک ایسا موڑ بھی آیا کہ جس نے زندگی بدل کر رکھ دی۔ پیغمبر آخرؐ کو خواب میں دیکھا، ان سے باتیں کیں، اپنے مسائل بیان کئے، محمد علی سید نے ایک خط میں لکھا ہے کہ اس خواب نے ان کی روح کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ وہ شوبزنس کی دنیا سے علم و ادب کی علمی و فکری وسعتوں اور لامتناہی سمتوں کی طرف چل پڑے۔ 1993 میں لاہور سے آئے ہوئے ان کے ایک دوست سید علی وجدان نے اس سفر کو اور مہمیز کیا اور شدت سے یہ اصرار کیا کہ مذہب کی کشادہ خیالی میں فکر و خیال کے سنجیدہ امکانات بہت زیادہ ہیں۔ انہی دنوں "دعائے ابو حمزہ ثمالی" مطالعے میں آئی۔ امام زین العابدینؑ کی اس دعا نے اندر سے جیسے دھو کر رکھ دیا۔ 1994 میں دعا کے موضوع پر ایک سنجیدہ کتاب شائع ہوئی۔ یہ محمد علی سید کی پہلی تصنیف تھی۔ اس کا نام تھا "رب العالمین، دعا اور انسان"۔ 1995 میں سید علی وجدان نے اسلام آباد میں آقائے سیستانی کے وکیل شیخ محسن نجفی سے ملاقات کروائی۔ محمد علی سید کی کتاب شیخ محسن نجفی صاحب کی نظر سے گزر چکی تھی۔ انہوں نے فرمایا۔ "ہمارے یہاں سے بچوں کا ایک رسالہ معصوم اور نوجوانوں کے لئے سہ ماہی ثقلین شائع ہوتا ہے ان جرائد کے مدیر کے فرائض انہی جیسا شخص ادا کر سکتا ہے۔"

معصوم اور ثقلین آج بہت سے سنجیدہ ذہنوں کی طہارت خیال کا ایک بڑا محور ہیں اور اس میں محمد علی سید کی جانفشانیوں کا بہت دخل ہے۔ اب گزشتہ سال سے انہوں نے "طاہرہ" کے نام سے کراچی سے خواتین کے لئے ایک پرچے کا اجراء کیا ہے۔ مقصد صرف ایک ہے وسعت خیال، ترویج علم، نئی نسل کے لئے علومِ جدید سے بتدریج آگہی کی تحریک، نئی روشنی کی تلاش، اپنی تاریخ سے ایک انتہائی صاف، شفاف باخبری۔

اس آخری نکتے کو وہ بہت اہمیت دیتے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھوں میں اس یقین کی مشعل لے کر اٹھے ہیں کہ ہماری تاریخ کے طویل سفر میں جس طرح سیاہ حاشیوں کے درمیان ہمارے خیالات محبوس ہو کر رہ گئے ہیں اس زنجیر اور اس چوکھٹے کو توڑ کر نئی نسل کو نکلنا پڑے گا۔ فتویٰ فروش ملاؤں اور مالِ غنیمت بٹورنے والے مورخوں کے سازشی ذہنوں نے تاریخ کو اتنا مسخ کر دیا ہے کہ صداقت کی تلاش آج کے انسان کے لئے آبِ حیات کی تلاش سے زیادہ سنگین مرحلہ بن گئی ہے۔

محمد علی سیّد کا تاریخی ناول "لہو کی موجیں" اسی سفر کا آغاز ہے جس میں نئی نسل کے ذہنوں کو تاریخ کی دشوار گھاٹیوں سے صحت و سلامتی کے ساتھ ان کی منزلوں تک لے کر جاتا ہے۔

اپنی اس وسیع الخیال تحریر کو جب وہ ایک ناول کے طور پر سامنے لے کر آرہے ہیں تو پھر ادب کے سنجیدہ تقاضے اسے تنقیدی نظر سے بھی دیکھنا چاہیں گے اور مذہب کے حوالے سے لکھی جانے والی اس تحریر کو محض جذباتی عقیدت مندی کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیا جائے گا۔ ادب شناس ارباب فن ابھی اس پر لکھیں گے۔ میں کتاب کے اس مقدمے میں بہت گہری بحث نہ سہی لیکن اختصار کے ساتھ بعض گوشوں کی طرف آپ کی توجہ مرکوز کرانے کی کوشش ضرور کروں گا۔

پہلی بات تو یہ کہ اس تاریخی ناول کو پڑھتے ہوئے نگاہ عصمت چغتائی کے ناول "ایک قطرۂ خون" پر ضرور جائے گی۔ عصمت چغتائی نے میر انیس کے مرثیوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے ناول کی کہانی تعمیر کی ہے۔ انھوں نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ یہ ان ۷۲ انسانوں کی کہانی ہے جنھوں نے انسانی حقوق کی خاطر سامراج سے ٹکر لی۔ وہ لکھتی ہیں کہ آج بھی دنیا کے کسی گوشے میں جب یزید سر اٹھاتا ہے تو حسینؑ بڑھ کر اس کی کلائی مروڑ دیتے ہیں۔ عصمت چغتائی کے اس ناول کے ساتھ ہی جب نظر محمد علی سیّد کے ناول پر آکر ٹھہرتی ہے تو ان ناولوں کے ناموں میں احساس کی یہ مماثلت ہماری توجہ اپنی طرف مرکوز کر لیتی ہے۔

ایک قطرۂ خون۔ لہو کی موجیں

دراصل خون کی وہ سرخی جو کربلا کے افق پر نمودار ہوئی، وہ ایک قطرۂ خوں جو تاریخ کے لمبے سفر کے بعد لہو کی موجوں میں تبدیل ہو گیا، وہ ان ناولوں میں انسانی قافلوں کو اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے۔

ایک قطرۂ خون بہت پختہ کہانی نویس کے قلم سے لکھی گئی ہے جب کہ محمد علی سیّد کے ہاں کہانی لکھنے کا وہ تجربہ نہیں ہے لیکن ان کے ذہن میں صداقت خیال کی اتنی فراوانی ہے کہ اس توانائی نے انہیں تجربہ کار کہانی نویس نہ ہوتے ہوئے بھی زندگی کی ایسی حقیقتوں سے قریب تر رکھا اور کربلا کی تاریخ سے گہری وابستگی نے انہیں ایک ایسا لہجہ عطا کیا کہ ان میں کہنہ مشقوں کی سی روانی نظر آتی ہے۔ عصری حسیّت کی جو بحث آج کے نقادوں میں چھڑی ہوئی ہے اور جس سے زندگی کے ادراک کے معانی کھلتے ہیں، وہ اس ناول میں ادبی رچاؤ کے ساتھ اپنی جھلکیاں رکھتی ہے۔ محمد علی سیّد اپنے عہد کے آدمی سے مخاطب ہیں۔ انھوں نے اپنے طرز اظہار کو کہیں الجھنے نہیں دیا۔ آج جس زبان میں ہمارا سماج گفتگو کر رہا ہے وہ تاریخ کربلا کے مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے اسی زبان اور اسی اصطلاح میں قاری کو واقعات کے گھمبیر حصے سنا رہے ہیں۔ وہ اپنی نسل

سے مخاطب ہیں اور ئی اس زبان اپ طرح ہے۔

"اس خفیہ منصوبے کے تحت یزیدی نوکر شاہی اور خفیہ ایجنسیوں نے کوفے میں آزادی اور حالات میں تبدیلی کا ایک مصنوعی ماحول پیدا کرنا شروع کیا۔"

"یہ لوگ بلا کے چالاک، بے رحم اور میڈیا کی جنگ لڑنے کے ماہر تھے۔"

"شہر کے قید خانے اسلام کے جاں نثاروں کے لئے ٹارچر سیل میں تبدیل ہو گئے تھے۔"

"کوفے میں ایمرجینسی نافذ تھی۔ گلیوں اور محلوں میں ہر وقت گھڑ سوار سپاہی، مسلح افراد اور فوجی دستے آتے جاتے نظر آتے تھے۔"

ان واقعات کے بیان میں وہ اپنے اسلوب کو کہیں بوجھل نہیں بناتے۔ کہانی کے ادبی مزاج اور تشبیہات کی فطری لطافتوں سے ان کا ذہنی رشتہ قائم رہتا ہے۔

"یہ قافلہ ایک دن منزل زبالہ پہنچا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ نارنجی رنگ کا سورج گرد و غبار کے مٹیالے کفن میں لپٹا صحرا کے مغرب میں اتر رہا تھا۔"

ہمارے ناول اور افسانے کی بڑی شخصیات مثلاً پریم چند، قرۃ العین حیدر، کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس، شوکت صدیقی، انتظار حسین اور اسی بڑی سطح کے دوسرے لکھنے والوں کے ناول عموماً ادب کے مخصوص اور سنجیدہ قاری ہی پڑھتے ہیں۔ محمد علی سیّد کے پڑھنے والے سنجیدہ قاری تو ہیں ہی لیکن ایک کثیر تعداد میں وہ طبقہ بھی ہے، جو غیر سنجیدہ تو نہیں لیکن غیر تربیت یافتہ ضرور ہے۔ اسکول کی کم عمر طالبات سے لے کر پختہ عمر کی گھریلو خواتین، بچے، نوجوان اور کم تعلیم یافتہ بزرگ بھی ان کی تحریروں کے قاری ہیں۔ محمد علی سیّد کے لئے زیادہ مشکل یہ ہے کہ وہ ان کے ذہن پر کس طرح دستک دیں کہ خفتہ ذہنوں کے کچھ دریچے تو کھل سکیں چنانچہ انہوں نے بہت سنبھل کر زبان کو برتا ہے، بیان میں الجھاؤ کہیں نہیں آنے دیا۔ خطوط و خطبات سے جو حوالے ہیں وہ بھی بہت اثر انگیز ہیں۔

ان کی یہ اثر انگیزی اس وقت بہت نمایاں ہو جاتی ہے جب وہ کسی بیانیہ تسلسل میں داخل ہوتے ہیں۔

عیسائیوں کے مذہبی رہنما جاثلیق سے یزید کی گفتگو، رومی سفیر کی باتیں، دربار میں کنیز کی زبانی خواب کا بیان یا خود جناب سکینہؑ کا خواب سنانا، ایسے لاتعداد مواقع ہیں جو اس ناول میں قاری کو بہالے جاتے ہیں جہاں کسی نہ کسی زاویے سے صداقت اپنی ظفر مندی تسلیم کرالیتی ہے۔ ان کے بے ساختہ فقروں میں سچائی، جھوٹ کی ہر سپر توڑ کر اپنے وار میں کامرانی سے ہم کنار نظر آتی ہے۔

کربلا کی تاریخ پڑھنے والوں نے دربار یزید کے اس منظر کو بارہا پڑھا ہو گا لیکن محمد علی سید کے بیان کی سادگی میں لہجے کی کاٹ اپنا اثر دور تک قائم کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ فقرہ دیکھیے

"اس وقت یزید نے اپنے درباری خطیب کی طرف اشارہ کیا۔ خطیب کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ اس کی ساری زندگی جھوٹ بولتے گزری تھی لیکن آج نہ جانے کیا بات تھی کہ زندگی میں پہلی بار جھوٹ بولنے کے خیال سے اس کا دل بیٹھا جارہا تھا۔"

اس تاریخی ناول کی ایک بڑی خصوصیت اس کے متحرک مناظر ہیں جن میں اطراف کا ماحول، درو بام، کردار کی رفتار و گفتار، لباس، حلیہ سب ہی بیک وقت ایک فریم میں نظر آنے لگتے ہیں۔ مصنف کی آنکھ کا حساس کیمرہ پوری فضا کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

"دربان الٹے قدموں پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ اندر داخل ہونے والے دروازے کے پاس جا کر اس نے ریشمی پردوں کو سرکایا۔ پردوں کے اس طرف عیسائی مذہبی رہنماؤں کے مخصوص لباس میں ایک ادھیڑ عمر شخص کھڑا تھا۔ اس نے سرخ رنگ کی عبا پہن رکھی تھی جس کے کناروں پر سونے کے تاروں سے خوبصورت بیل بوٹے کڑھے ہوئے تھے۔ سر پر سرخ رنگ کی ایک چوکور ٹوپی تھی۔ گلے میں چاندی کی صلیب لٹک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبا عصا تھا جس کے اوپر چاندی منڈھی ہوئی تھی۔ اس کی لمبی بے ترتیب داڑھی اس کے سینے تک پھیلی ہوئی تھی۔"

یہ کام اتنا سہل نہیں تھا۔ اس کے لئے انہیں کربلا کی تاریخ کے پس منظر کو محض پڑھنا ہی نہیں پڑا ہو گا بلکہ اس تاریخ کے مختلف ادوار، عربی عوام کی مخصوص ذہنیت، حکومتی اقدامات میں پیوست نیتیں، سیاسی و سماجی تغیرات کی تہہ میں پوشیدہ رویے، منافق معاشرے کی نفسیات، یہاں تک کہ امامت و خلافت کے Institution تک وہ ایک فکری سنجیدگی کے ساتھ گئے ہوں گے۔

پچیس ابواب پر مشتمل اس تاریخی ناول کے کم وبیش ہر باب کو پڑھتے ہوئے یہ احساس بہت نمایاں ہونے لگتا ہے کہ محمد علی سیّد کا مقصد اپنے قاری کو تاریخ کی ان صداقتوں کے قریب لانا ہے جن پر سازشوں کے پردے پڑے ہیں اور جن پر اتنی گرد جم چکی ہے کہ وہ گرد جم کر مضبوط تہہ کا حصہ بن گئی ہے۔ انہوں نے اپنے قلم سے اس دبیز تہہ کو کھرچا ہے۔ کوفے میں یزیدی انتظامیہ کی منصوبہ بندی، جعلی خطوط کی یلغار، مکے میں طواف کے دوران امامؑ کو شہید کرنے کی سازش، ایسے موضوعات ہیں جہاں وہ بہت احتیاط اور توازن کے ساتھ تجزیے کی منزلوں سے گزرے ہیں۔ یہ سنجیدگی ان حصوں میں بھی نمایاں ہے جہاں وہ خانوادۂ رسالتؐ کی مصیبتوں کو لکھتے ہیں۔ ان کا انداز کسی پیشہ ور ذاکر کی طرح نہیں ہوتا بلکہ صبر وضبط کے ٹھہراؤ اور درد کی گہری معنویت کے ساتھ وہ اس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ آنسو بے اختیار پلکوں کی صفیں توڑ کر نکل آتے ہیں۔

> "وہ لوگ جنہوں نے کبھی ان کا سایہ تک بھی نہیں دیکھا تھا آج انہیں کھلے سر دیکھ رہے تھے۔ راستے کے گرد وغبار نے خاک تیمم کی طرح ان کے چہرۂ مبارک کو چھپائے رکھا تھا رسول کی نواسیوں کے لیے اب صرف خاک ہی کا پردہ باقی رہ گیا تھا۔"

محمد علی سیّد کا مقصد محض مصائب کا بیان نہیں۔ اس کی حیثیت ان کے یہاں ثانوی ہے اگرچہ اس کی کاٹ ہر جگہ تڑپا دیتی ہے لیکن جس ارفع مقصد کے لئے انہوں نے ناول لکھا وہ اپنے اختتام پر پہنچ کر کتاب کے آخری صفحے کے ساتھ ہی اپنی تکمیل کو چھولیتا ہے۔

> "قاتلانِ حسینؑ پر زمین کی وسعتیں تنگ ہوگئیں۔ یا حسینؑ یا حسینؑ کے فلک شگاف نعرے جغرافیائی سرحدوں کو عبور کر کے اب ملکوں، قوموں، نسلوں، معاشروں، تہذیبوں، ذہنوں، مکانوں اور زمانوں میں سفر کر رہے تھے اور ہر جگہ ہر زمانے کے یزیدوں کو بے نقاب کرتے جا رہے تھے۔"

یہ ناول کا اختتام نہیں بلکہ یہ محمد علی سیّد کے فکری سفر کا وہ پہلا افق ہے جہاں سے وہ نئی نسل کو اکیسویں صدی کے سفر پر ساتھ لے کر نکل رہے ہیں۔

نقاب پوش

اسلام کے دشمن خفیہ سازشوں میں مصروف تھے
قرآن و حدیث کا مذاق اڑایا جا رہا تھا اللہ کے نمائندے
نے دشمن کے چہرے سے اسلام کی نقاب اتار پھینکنے کا
ارادہ کر لیا۔

باب۔ ا

شدید گرمی اور لو چلنے کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ ریتلے میدانوں میں سارے دن گرم ہوائیں چلتیں اور ہوا کے بگولے ریت کو اڑا کر آبادیوں پر بکھیرتے رہتے۔ سواری کے جانور سارے دن ہانپتے اور اس علاقے میں رہنے والے انسان گرمی سے بے حال ہو جاتے۔ آگ برساتا سورج مغرب میں اترتا تو لوگوں کی سانس میں سانس آتی۔ رات جوں جوں گزرتی، ہوائیں ٹھنڈی ہونے لگتیں اور رات کے آخری پہر تک موسم میں خنکی آجاتی۔ اس گرمی، لو، میدانوں کی ریت اور تپتے ہوئے سنگلاخ پہاڑوں کو دیکھ کر شہر میں آنے والے لوگ اللہ کے نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صبر، اللہ پر یقین اور ان کے جذبوں کی سچائی کو بے اختیار سلام کرتے۔

صدیوں پہلے تو یہ علاقہ بالکل ہی بنجر صحرا تھا۔ نہ کوئی پیڑ، نہ ہریالی، نہ سایہ، نہ پانی۔ سنگلاخ پہاڑوں اور ریت کے بیکراں سمندر کے علاوہ یہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ میلوں دور تک نہ کوئی جانور نظر آتا اور نہ آسمان پر کوئی پرندہ پرواز کرتا۔ بس پہاڑ کے دروں میں رینگنے والے جانوروں کا بسیرا تھا یا صحرا کی ریت پر زہریلے سانپ سرسراتے

نظر آتے تھے۔ لوگ سوچتے کہ واقعی ابراہیمؑ بہت عظیم، صابر اور اللہ پر یقین کامل رکھنے والے انسان تھے کہ اپنی بیوی اور نوزائیدہ بچے کو اس تپتے ہوئے صحرا میں اللہ کے حکم کے مطابق اکیلا چھوڑ کر یہاں سے واپس لوٹ گئے تھے!

لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بندے کے خلوص، یقین اور سچائی کا بدلہ اس طرح دیا کہ نوزائیدہ بچے کی نرم و نازک ایڑیوں کی رگڑ سے خشک صحرا میں پانی کا کبھی نہ تھمنے والا چشمہ پھوٹ پڑا۔ دو ٹیلوں کے درمیان دوڑتی ہوئی ماں' ابراہیمؑ کے مالک کا یہ معجزہ دیکھ کر بے اختیار سجدے میں گر گئی اور اللہ رب کریم نے اپنی اس کنیز کو ایسی لازوال عزت بخشی کہ کرہ ارض پر قائم اللہ کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے گھر کا طواف کرنے والے مرد و عورت قیامت کے دن تک اللہ کی اس ایمان والی کنیز کے قدموں کے نشانوں پر بالکل اس کنیز کی طرح دوڑتے رہیں گے جو اپنے بچے اور اللہ کے نبی اسماعیل علیہ السلام کی زندگی بچانے کے لئے پانی کی تلاش میں بے قراری کے ساتھ ریتیلے ٹیلوں کے درمیان دوڑ رہی تھی۔

☆☆☆

صدیوں پر صدیاں گزرتی رہیں۔ اللہ کے دین کی روشنیاں بندوں کی بد اعمالیوں، دھوکے بازیوں اور ناشکر گزاریوں کے سبب عام انسانوں کو دکھائی دینا بند ہو گئیں۔ عرب کے اس ریگزار میں اب صرف چند افراد ہی ان روشنیوں کو دیکھ سکتے تھے کہ روشنیاں صرف انہی کے سینوں کو منور کر رہی تھیں۔ پھر کوہ فاران کی چوٹیاں اللہ کے نور سے جگمگا اٹھیں اور ان صاحب ایمان لوگوں کی اولاد سے اللہ نے اپنے آخری نبیؐ کو مشعل نبوت دے کر اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے صحرائے عرب کی ان

تاریکیوں میں بھیجا۔

یہی وہ دور تھا جب اس شہر کی قسمت دوبارہ چمکنا شروع ہوئی۔ کعبہ بتوں سے پاک ہوا، اسلامی نظام حکومت قائم ہوا اور اسی دور میں اس صحرائی علاقے میں شجر کاری اور پانی کی فراہمی کے لیے مختلف علاقوں اور راستوں میں کنویں کھودنے کا آغاز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام اور اہل بیتؑ کے دوسرے افراد نے کیا۔

شجر کاری کے ذریعے موسم کو تبدیل کرنے اور ماحول کو سرسبز و شاداب بنانے کے لئے حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے جو کنویں خود اپنے ہاتھوں سے کھودے تھے، سن ساٹھ ہجری کے موسم حج میں دور دراز کے علاقوں سے آنے والے مسلمان مکے اور مدینے کے مختلف مقامات پر آج بھی ان سے اپنی پیاس بجھا رہے تھے۔ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے لگائے ہوئے سایہ دار پیڑ آج بھی اسی طرح ترو تازہ تھے اور مسافروں کو اپنے سائے میں پناہ دے رہے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۴۹ سال پہلے اس دنیا سے جا چکے تھے۔ آپؐ کے دنیا سے جانے کے بعد حالات تیزی سے بدلنے لگے۔ چند مہینے بعد رسول کریمؐ کی صاحبزادیؑ دنیا سے رخصت ہو گئیں اور اس کے انتیس سال بعد امت رسولؐ کی رکھوالی کرنے والا عظیم انسان منافقوں کے ہاتھوں شدید تکالیف اور صدمے برداشت کر کے سن چالیس ہجری میں مسجد کوفہ میں شہید ہو گیا۔

دشمنوں کی سازشیں بڑھتی گئیں۔ اسلام دشمن طاقتوں نے اسلام کے ستونوں کو ایک ایک کر کے گرانا شروع کیا اور سن پچاس ہجری میں رسول اکرمؐ کے

بڑے نواسے حضرت امام حسن علیہ السلام کو زہر کے ذریعے شہید کر دیا گیا۔

دشمن کا اصل نشانہ افراد نہیں دین اسلام تھا۔ جو شخص بھی دین اسلام کے تحفظ کے لئے اٹھتا، سازشی ٹولے کے بااثر، ظالم اور چالاک افراد اسے پراسرار حالات میں موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ قتل کی منصوبہ بندی اس چالاکی اور رازداری کے ساتھ کی جاتی کہ اکثر قاتل کو بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس کے لئے کام کر رہا ہے۔

چالاک دشمن جس نے اب اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا قاتل کے ذہن میں یہ بٹھا دیتا کہ تم یہ قتل کر کے دین اسلام کی خدمت کرو گے اور سیدھے جنت میں جاؤ گے۔ کبھی قاتلوں کو دنیاوی آرام و آسائش اور مال و دولت کا لالچ دیا جاتا اور کبھی ان کے جذبہ انتقام کو ہوا دی جاتی۔ ان تمام سازشوں کا مقصد حکومت اسلامی پر قبضہ کرنا اور اسلام کے سایہ دار درخت کی ایک ایک شاخ کو کاٹ کر اللہ کے دین کو مٹا دینا تھا۔

مسلمانوں کے اسلامی کردار کا جو زوال امیر المومنین علیہ السلام کی شہادت کے بعد سے شروع ہوا، سن ساٹھ ہجری میں وہ اپنی انتہاء کو چھونے لگا۔ غریبوں کے گھروں کے چولہے بجھنے لگے، حکمرانوں، درباریوں، گورنروں اور فوجیوں کے خزانے لوٹ مار کی دولت سے چھلکنے لگے۔ مساوات کا تصور مٹ گیا۔ اقربا پروری اور لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا۔ غریبوں کی عزت طاقت وروں کا کھلونا بن گئی۔ قرآن کو لپیٹ دیا گیا اور نمازیں محض عادتاً پڑھی جانے لگیں۔

اس دور میں سادہ لوح مسلمان ظاہری عبادات میں مصروف تھے۔ مسجدیں نمازیوں سے چھلکی پڑتیں لیکن ان کے پیش نماز اسلام سے بغاوت کرنے والی حکومت کے بدکردار گورنر ہوتے۔ دینی تعلیمات مسخ ہونے لگیں، امن بھائی چارے اور

مساوات کے جو پرچم رسول کریمؐ نے بلند کیے تھے' شام اور مصر کے درباروں میں انہیں قدموں تلے روند دیا گیا۔ ایمان کی روشنی بجھنے لگی' کفر کی تاریکیاں امنڈ پڑیں اور جہالت کی آندھیاں علم کے چراغوں کو بجھانے لگیں۔

بہت سے مسلمانوں نے جو حقیقت سے واقف تھے' سچ اور جھوٹ میں تمیز کر سکتے تھے اور اللہ کے عذاب سے بھی ڈرتے تھے مگر وہ سچ بولنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے، حالات سے گھبرا کر مسجدوں میں پناہ لے لی اور لمبی لمبی نمازیں پڑھ کر یہ سمجھنے لگے کہ انہوں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔

☆☆☆

نواسۂ رسولؐ ،امام وقت حضرت امام حسین علیہ السلام مسجدوں، نمازوں، روزوں، حج، زکوٰۃ اور دین اسلام کی تمام تر تعلیمات کو بچانے کے لیے ۲۸ رجب سن ساٹھ ہجری کو مدینے سے نکلے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کی محترم عورتوں، بچوں، اپنے بہادر' نڈر اور آزمودہ کار بھائیوں 'بیٹوں اور دوستوں کے ساتھ تین شعبان کو مکہ معظّمہ پہنچ گئے۔ مکہ معظّمہ کے مسلمانوں کو نواسۂ رسولؐ کے آنے کی خبر ہوئی' تو وہ ان کے والہانہ استقبال کے لیے گھروں سے نکل آئے۔

وہاں کے یزیدی گورنر سعید بن عاص نے امام حسین علیہ السلام سے مکے کے مسلمانوں کی یہ عقیدت و محبت دیکھی تو شہر سے فرار ہو گیا۔ مدینے جا کر اس نے یزید کو ایک خط کے ذریعے تفصیلی رپورٹ لکھ کر بھیجی۔ یزید اور اس کے مشیروں نے اس نئی صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی نئی حکمت عملی ترتیب دی۔

یہ لوگ بلا کے چالاک، بے رحم اور میڈیا کی جنگ لڑنے کے ماہر تھے۔ ان کے

دماغ شیطان کے قبضے میں تھے جو انہیں ظلم وستم کرنے گناہوں کو پھیلانے، مسلمانوں میں اختلافات پیدا کرنے اور زمین پر فساد پھیلانے کی نت نئی راہیں سجھاتا رہتا تھا۔ مکے کے گورنر کی رپورٹ کو سامنے رکھتے ہوئے یزید کی فوجی انتظامیہ اور اس کی خفیہ ایجنسیوں نے بیک وقت دو شیطانی منصوبے تیار کیے۔ اگر پہلا منصوبہ کامیاب ہو جاتا تو دوسرے پر عمل کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ پہلا منصوبہ اس یقین کی بنیاد پر تیار کیا گیا تھا کہ حسین علیہ السلام فریضہ حج ضرور ادا کریں گے۔ اس منصوبے کے لیے شامی فوج کے تین سو سے زیادہ سفاک، چالاک اور تجربہ کار سپاہیوں کا انتخاب کیا گیا۔ ان کی ڈیوٹی تھی کہ وہ حرم کعبہ میں طواف کے دوران امام حسینؑ پر خنجر کے وار کر کے انھیں قتل کر دیں اور ہجوم میں غائب ہو جائیں۔

یہ کام ایک آدمی بھی کر سکتا تھا لیکن تین سو فوجیوں کو کسی بھی ایمر جنسی سے نمٹنے اور مکے کے حالات کو کنٹرول کرنے کے لیے تعینات کیا گیا تھا۔ اس منصوبے کی کامیابی یزید کی راہ کی تمام رکاوٹیں دور کر سکتی تھی۔ یزید دراصل ایک ہی تیر سے بہت سارے شکار کرنا چاہتا تھا۔

امام حسین علیہ السلام طواف کے دوران قتل ہو جاتے اور ان کا قاتل ہجوم میں غائب ہو کر ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا۔ نواسہ رسولؐ کی اس طرح شہادت مختلف علاقوں سے آئے ہوئے حاجیوں پر قیامت بن کر ٹوٹتی اور وہ مختلف گروہوں میں بٹ کر ایک دوسرے پر اس سنگین جرم کا الزام لگانے لگتے۔ یزید کے خفیہ ایجنٹ ان کے جذبات کو ہوا دے کر انھیں ایک دوسرے کے خلاف تلوار کھینچنے پر مجبور کر دیتے اور امن کے شہر مکہ معظمہ کی گلیاں انسانی لہو سے رنگین ہو جاتیں۔

کچھ عرصے کی خونریزی اور خانہ جنگی کے بعد امن وامان قائم کرنے کے بہانے یزیدی فوجی وہاں ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر یزید باقاعدہ آنسو بہاتا، حکومت سوگ مناتی اور امام حسینؑ کے قتل کا الزام مکے اور مدینے میں موجود ان لوگوں پر عائد کر دیا جاتا جنھوں نے یزید کی بیعت سے انکار کر دیا تھا۔ ان میں عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ، عبداللہ ابن عمرؓ اور عبداللہ ابن زبیرؓ جیسے لوگ شامل تھے۔ یزیدی حکومت ان تینوں افراد کو امام حسین علیہ السلام کے قتل کے الزام میں قتل کر دیتی اور اس طرح اسے خلافت کے تمام دعوے داروں سے بہ یک وقت نجات مل جاتی۔

دوسرا منصوبہ پہلے منصوبے کی ناکامی کی صورت میں روبہ عمل لانا تھا کہ اگر امام حسین علیہ السلام پر حملہ ہوا اور وہ قتل نہ ہو سکے تو سارے مسلمانوں کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہو جائیں گی۔ ایسے میں ان پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں رہے گا۔ ایسی صورت حال کے لیے ان شیطانی دماغوں نے ایک متبادل منصوبہ تیار کیا تھا۔ اس منصوبے کا آغاز کوفے سے ہزاروں خطوط لکھوانے اور انھیں بلا روک ٹوک مکے میں امام حسین علیہ السلام تک پہنچانے سے کیا گیا۔

کوفہ اب یزیدی فوجیوں کی چھاؤنی تھی۔ بیس سال پہلے حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی شہادت کے بعد یہ شہر مکمل طور پر شامی حکومت کے کنٹرول میں چلا گیا تھا۔ گزشتہ بیس برسوں میں شامی فوجیوں نے یہاں علی ابن طالبؑ کے چاہنے والوں کا کوئی گھر باقی نہیں رہنے دیا تھا۔ یہاں کے زیادہ تر باشندے خردماغ فوجی تھے۔ اپنے سے بڑے افسر کا حکم ماننا ہی ان کا مذہب تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ اہل بیتؑ کے چاہنے والے افراد بھی یہاں بس گئے تھے۔ ان چند افراد سے یزیدی فوجیوں کو کوئی خاص خطرہ نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ہم جب چاہیں گے ان کا صفایا کر دیں گے۔ یہ لوگ بڑے خوف کے عالم میں اپنی زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ ایک امید انہیں زندہ رکھے ہوئے تھی کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ ایک دن ضرور ایسا آئے گا کہ حالات بدلیں گے اور یزید کی ظالم حکومت ختم ہو جائے گی۔ حالات بدلنے کی امید میں ان کی نگاہوں کا مرکز رسول کریمؐ کے نواسے حسین ابن علیؑ کی ذات تھی۔ مختار ثقفیؓ، ہانی ابن عروہؓ، کثیر ابن شہابؓ، حبیب ابن مظاہرؓ، مسلم ابن عوسجہؓ، میثم تمارؓ، عابس شاکریؓ، طوعہؓ نامی خاتون اور چند دوسرے افراد ایسے ہی لوگوں میں شامل تھے۔

اس خفیہ منصوبے کے تحت یزیدی نوکر شاہی اور خفیہ ایجنسیوں نے کوفے میں آزادی اور حالات میں تبدیلی کا ایک مصنوعی ماحول پیدا کرنا شروع کیا۔ یزیدی فوجی کھلے عام امام حسینؑ کے نام خط لکھتے اور آپس میں اس طرح کی باتیں کرتے جیسے وہ یزید کے ظلم و ستم اور اس کی غیر اسلامی حرکتوں سے سخت بیزار ہیں اور چاہتے ہیں کہ ملک میں حقیقی اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ یزیدی ایجنٹ شہروں، بازاروں اور دکانوں پر کھڑے ہو کر کھلم کھلا یہ بھی کہتے کہ ہمیں ایک رہنما کی ضرورت ہے جو ہمیں متحد کر سکے۔ وہ بار بار مکے میں موجود امام حسین علیہ السلام کا نام بھی لیتے کہ خلافت و حکومت ان کا حق ہے۔ وہ اگر کسی طرح یہاں آجائیں تو سارے مسلمان متحد ہو سکتے ہیں۔

یہ ایک گہری سازش تھی۔ اس سازش کے تحت کوفے کے فوجیوں نے بارہ ہزار جعلی خطوط لکھے۔ حتیٰ کے اہل بیتؑ کے چاہنے والے چند افراد بھی اس چال کا شکار

ہو گئے۔ انہیں اپنا اسلامی حکومت کے قیام کا دیرینہ خواب پورا ہوتا نظر آنے لگا تھا۔
انہوں نے بھی امام حسین کو خط لکھے اور ان سے درخواست کی کہ یہاں حالات سازگار
ہیں۔ آپ یہاں تشریف لائیں اور بکھرے ہوئے لوگوں کو متحد کریں۔ ہم بغیر امامؑ
کے ہیں اور سخت ظلم وستم کا شکار ہیں۔ آپ ہماری مدد کو پہنچیں۔

سفیر حسینؑ

انہیں کوفے کے گورنر ابن زیاد کو دھوکے سے
قتل کرنے کا بہترین موقع مل گیا تھا لیکن۔۔۔
حق کا نمائندہ باطل کی نقل نہیں کر سکتا تھا۔

باب۔ ۲

شام کا حاکم یزید ابن معاویہ خود تو ایک کم عقل انسان تھا لیکن اسے جوڑ توڑ کے ماہر وزیروں، مشیروں' سخت مزاج صوبائی گورنروں اور چرب زبان مذہبی رہنماؤں کی ایک بڑی تعداد وراثت میں ملی تھی۔ نواسۂ رسولؐ کے قتل کی منصوبہ بندی یزید کی دیرینہ خواہش اور وراثت میں ملی ہوئی چالاک' سفاک گمراہ وزیروں' مشیروں اور مذہبی رہنماؤں کے ٹیم ورک کا نتیجہ تھی۔

بیس سال پہلے کوفہ شیعیان علیؑ کے مضبوط مرکز کی شہرت حاصل کر چکا تھا لیکن بیس سال کی فوجی حکومت نے اس شہر کا نقشہ ہی بدل ڈالا تھا۔ لوگوں کے مزاج بدل چکے تھے۔ ایمانداری' درگزر' رحم برداشت اور وفاداری کی جگہ دھوکے بازی' بدی' انتقام' سفاکی اور بے وفائی نے لے لی تھی۔ اب لوگ وقتی فائدہ اٹھانے کے لئے بڑے سے بڑا گناہ کرنے سے بھی نہیں جھجکتے تھے۔

یزیدی منصوبے کے تحت امام حسین علیہ السلام کو جو تین شعبان سے مکے میں ٹھہرے ہوئے تھے کوفے سے روزانہ سیکڑوں خطوط موصول ہو رہے تھے۔ اب

تک ملنے والے ہزاروں خطوط میں چند خطوط کوفے کے ان افراد کے بھی تھے جو ماحول کو بدلتا دیکھ کر اچھے دنوں کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ یہ لوگ دین اسلام کی سربلندی کے خواہش مند تھے۔ امام حسین علیہ السلام کو کوفے آنے کی دعوت انھوں نے دل کی گہرائیوں سے دی تھی اسی لیے مرتے دم تک نواسہ رسول کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ بعد میں رونما ہونے والے حالات میں انہوں نے پہلے سفیر حسینؑ حضرت مسلم بن عقیل کا ساتھ دیا اور ان کے ساتھ شہادت پائی۔ ان میں وہ لوگ جو قتل یا گرفتار ہونے سے بچ گئے وہ کوفہ چھوڑ کر امام حسین علیہ السلام کے قافلے میں شامل ہو گئے اور کربلا کے میدان میں اپنا وعدہ وفا کر دکھایا۔

☆☆☆

کوفے سے جب کئی معتبر لوگوں کے خطوط بھی امام حسین علیہ السلام کو موصول ہوئے تو آپؑ نے پندرہ رمضان ۶۰ ہجری کو اپنے چچازاد بھائی حضرت مسلم بن عقیل کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے مکہ معظمہ سے کوفے روانہ کیا۔

جناب مسلم بن عقیل نے امیر المومنینؑ ہی کے گھر میں حسنؑ و حسینؑ، عباسؑ اور محمد ابن حنفیہؒ جیسے شب زندہ داروں اور بہادروں کے درمیان زندگی بسر کی تھی۔ وہ جنگ صفین میں اپنی تلوار کے جوہر دکھا چکے تھے۔

بے پناہ بہادری کے ساتھ ساتھ وفاداری اور اسلام کے نام پر جان قربان کر دینے کا فطری جذبہ ان کے خون میں موجود تھا۔ آپ شب زندہ دار بزرگ، دلیر سپاہی، گہری سوچ کے مالک، حاضر جواب، قرآن و سنت کے عالم، اس دور کی سیاست کو سمجھنے والے اور حضرت علی علیہ السلام کے طرز حکومت کو جاننے والے انسان تھے۔

انہی تمام خوبیوں کی وجہ سے امام وقت حضرت امام حسین علیہ السلام نے انہیں اپنا نائب بنا کر کوفے روانہ کیا تھا۔ علامہ مجلسی نے لکھا ہے۔ "حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے چچازاد بھائی کو کوفے بھیجا۔ مسلم بن عقیلؓ علم کی بلندی، عقل و تدبر، نیکی، سچائی بہادری، سخاوت اور متانت میں سب سے نمایاں تھے۔"

حضرت امام حسینؑ نے مسلم بن عقیلؓ کو کوفے والوں کے نام ایک خط بھی دیا۔ اس خط میں آپ نے کوفے والوں کو لکھا۔

> "یہ خط حسین ابن علیؑ کی طرف سے گروہ مومنین اور مسلمانوں کی طرف ہے۔ اللہ کی حمد اور اللہ کے رسولؐ پر درود و سلام۔ تم نے لکھا ہے کہ ہمارا کوئی امام نہیں جو ہماری رہنمائی کرے اس لیے کوفہ آیئے۔۔۔ تو میں اپنے بھائی اور چچا کے بیٹے اور اہل بیتؑ میں سے معتبر شخص مسلم بن عقیل کو تمہاری طرف بھیج رہا ہوں۔ اگر انہوں نے تمہارے اتحاد و اتفاق سے مجھے باخبر کیا تو میں بھی کوفے آسکتا ہوں۔"

☆☆☆

امام حسین علیہ السلام کا انداز جنگ ساری دنیا سے نرالا تھا۔ دشمن ان کے خلاف طاقت جمع کر رہا تھا اور آپ قدم قدم پر اپنی طاقت کو منتشر کرتے جا رہے تھے۔ اس زمانے میں مشہور تھا کہ چار بہادر آدمی عرب میں ایسے ہیں کہ یہ جس کے ساتھ ہوں وہ بڑی سے بڑی فوج کو شکست دے سکتا ہے۔ یہ افراد تھے حسین ابن علیؑ، ابوالفضل العباسؑ، محمد بن حنفیہؓ اور مسلم بن عقیلؓ۔ حضرت امام حسین نے محمد بن حنفیہؓ کو مدینے

میں چھوڑا، مسلم بن عقیل جیسے دلیر کو قافلے سے الگ کر کے کوفے روانہ کر دیا۔ حضرت عباسؓ جیسے بہادر کو لڑنے کی اجازت نہیں دی اور خود صرف اتنی جنگ کی کہ دنیا یہ نہ سمجھے کہ حسینؓ اپنی کسی کمزوری کی وجہ سے قتل ہو گئے۔ تمام رشتے داروں اور دوستوں کی شہادت کے بعد یزید کی ٹڈی دل فوج پر آپ کا آخری حملہ ایسا تھا کہ ساری یزیدی فوج صحرا میں بکھر کر رہ گئی تھی۔ حتیٰ کہ فوج کے کئی دستے امام حسینؓ کی تلوار سے بچنے کے لیے کوفے کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

حضرت مسلم بن عقیل پندرہ رمضان کو نائب امام بن کر مکے سے نکل کھڑے ہوئے۔ ابھی وہ مکے سے تھوڑی دور گئے تھے کہ انہوں نے ایک شکاری کو دیکھا جو ایک ہرن کو پکڑ کر ذبح کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر آپ کا ماتھا ٹھنکا اور آپ واپس مکے چلے آئے۔ امام علیہ السلام سے یہ واقعہ بیان کیا اور بولے کہ یہ ایک فال بد ہے۔ میرے خیال میں یہ سفر مبارک نہیں ہو گا۔

آپ دین دار مسلمان ضرور تھے لیکن امامؑ کی طرح معصوم نہیں تھے۔ اس طرح شگون لینا عرب کے معاشرے میں عام تھا۔ امام حسین علیہ السلام نے انہیں دلا سا دیا۔ ”بھائی! اگر کسی خوف کی وجہ سے لوٹ آئے ہو تو کوئی بات نہیں۔ میرے ساتھ رہو۔ میں کسی دوسرے کو بھیج دوں گا۔“

حضرت مسلم بن عقیلؓ تڑپ کر رہ گئے ”آقا! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ میں نے جو دیکھا اور سوچا تھا آپؑ سے عرض کر دیا۔ آپ امامؑ وقت ہیں۔ آپ حکم دیں تو دریا میں کود پڑوں یا آگ کے شعلوں سے گزر جاؤں بس مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں یہ آپ کی آخری زیارت نہ ہو۔“ یہ کہہ کر آپ امام علیہ السلام کے قدموں میں جھک

گئے۔ امام نے انہیں بازؤوں سے پکڑ کر اٹھایا، ان کی پیشانی پر بوسہ دیا اور وہ دوبارہ کوفے کی طرف روانہ ہو گئے۔

امام حسین علیہ السلام سے اس ملاقات کے بعد حضرت مسلم بن عقیل کے آنسو راستے بھر نہیں رکے۔ باربار ان کا دل دھڑکتا اور کوئی آواز سرگوشی کرتی کہ اب تم اپنے امام کو دوبارہ نہیں دیکھ سکو گے۔

☆☆☆

رمضان کے آخری دن تھے۔ عید کا چاند حضرت مسلم بن عقیلؑ کو راستے میں نظر آیا اور پانچ شوال کو رات کے آخری پہر آپ کوفے پہنچ گئے۔ آپ مختار ثقفی یا سلیمان بن صرد کے گھر ٹھہرے۔ صبح ہوتے ہوتے سفیر حسین کے کوفے پہنچ جانے کی خبر پورے شہر میں پھیل گئی۔ لوگ جوق در جوق بیعت کے لیے آنے لگے۔ اہل بیتؑ سے محبت کرنے والوں کا حال یہ تھا کہ جناب مسلم کے پرنور چہرے کو دیکھتے اور رونے لگتے۔

ان بیعت کرنے والوں میں سچے مسلمان بھی شامل تھے اور سازشی افراد بھی۔

چند ہی روز میں بیعت کرنے والوں کی تعداد اٹھارہ ہزار تک پہنچ گئی یہ حالات دیکھ کر حضرت مسلم بن عقیلؑ نے حضرت امام حسینؑ کو اطمینان بھرا خط لکھا اور انہیں کوفے آنے کی دعوت دی۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے سارا کوفہ امام حسین کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے۔

یہ خط حضرت مسلم بن عقیلؑ نے امام حسینؑ کے جاںنثار جناب عابس شاکری کے حوالے کیا۔ عابس شاکری جسے ہی سفیر حسین کا یہ خط لے کر کوفے سے نکلے، یزیدی گورنر نے کوفے میں مصنوعی آزادی کا جو ڈراما رچا رکھا تھا وہ اختتام کو پہنچ گیا۔ اب اس کی

ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ کوفے کی انتظامیہ مسلم بن عقیل سے امام حسین علیہ السلام کے نام ایک خط لکھوانا چاہتی تھی۔ ایک ایسا خط جسے پڑھتے ہی حسین علیہ السلام لاکھوں مسلمان حاجیوں کے حصار سے نکل کر کوفے جیسے دور افتادہ علاقے کی طرف چل پڑیں اور انھیں صحرا میں کہیں گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

اسی لیے عابس شاکری کے کوفے سے نکلتے ہی سارا شہر سیل کر دیا گیا۔ شہر کے داخلی دروازوں پر خوں خوار فوجی متعین کر دیے گئے جگہ جگہ چیک پوسٹیں بن گئیں اور آیندہ چند دنوں میں نعمان بن بشیر کی جگہ بصرے کے سخت گیر گورنر عبیداللہ بن زیاد کو کوفے کا اضافی چارج دے دیا گیا۔

☆☆☆

یہ خط مکے میں امام حسین علیہ السلام کو موصول ہوا تو آپؑ نے بصرے کے باشندوں کے نام بھی ایک خط لکھا۔

"یاد رکھو کہ سنت رسولؐ کو مردہ کر دیا گیا ہے۔ اگر تم نے میری دعوت پر لبیک کہا اور اطاعت قبول کی تو رشد و ہدایت کے راستے پر پہنچو گے۔"

امام علیہ السلام کے ایک غلام جن کا نام دراع تھا یہ خط لے کر بصرہ پہنچے اور مومنین کی ایک جماعت سے جا کر ملے۔ جن لوگوں کو جمع کر کے یہ خط سنایا گیا وہ اپنے قبیلوں کے سردار اور بااثر افراد تھے۔ ان میں سے زیادہ تر افراد اہل بیتؑ کے چاہنے والے تھے لیکن ایک شخص جس کا نام منذر بن جارود تھا بعد میں حکومت کا جاسوس ثابت ہوا۔ اس کی لڑکی کی شادی عبیداللہ ابن زیادہ سے ہوئی تھی جو اس وقت بصرے کا گورنر تھا۔

منذر بن جارود نے بہ ظاہر امام علیہ السلام کا ساتھ دینے والوں کی مخالفت نہیں کی لیکن وہ امام علیہ السلام کے قاصد کو دھوکے سے ابن زیاد کے پاس لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ ابن زیاد جیسے دشمن اسلام کو خط کا مضمون معلوم ہوا تو اس نے امام علیہ السلام کے اس قاصد کو قتل کر کے سولی پر لٹکا دیا۔ جناب وراعؓ سلسلہ کربلا کے پہلے شہید ہیں۔

کوفے میں اس وقت نعمان بن بشیر حکمران تھا۔ حضرت مسلم بن عقیلؑ نے کوفے آکر اپنی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کیا تو نعمان ابن بشیر نے ان کے خلاف کوئی سخت قدم نہیں اٹھایا۔ کوفے کی اکثریت اہل بیتؑ کی دشمن اور یزید کی وفادار تھی۔ ان میں کوفے کے وہ قبائلی سردار بھی شامل تھے جنہیں یزیدی حکومت نے وفاداری کے بدلے میں بڑی بڑی مراعات دے رکھی تھیں۔ ان سرداروں نے جب حضرت مسلم بن عقیلؑ کے ارد گرد لوگوں کو جمع ہوتے دیکھا تو انہیں اپنی مراعات خطرے میں نظر آنے لگیں۔ انہوں نے ایک تیز رفتار قاصد کے ذریعے دمشق میں یزید کو اس صورت حال سے آگاہ کیا اور اسے لکھا کہ نعمان ابن بشیر کو معطل کر کے کسی سخت آدمی کو کوفے کا چارج دیا جائے ورنہ حسینؑ کے چاہنے والے کوفے پر قبضہ کر سکتے ہیں۔

کوفے کا مراعات یافتہ طبقہ ابوسفیان کے خاندان کی سازشوں اور چالاکیوں کو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ نعمان بن بشیر نے جو مصنوعی آزادی دے رکھی تھی وہ دراصل حکومتی سازش کا ایک حصہ تھی۔ یزید کو ایک خاص وقت پر عبید اللہ ابن زیاد جیسے آدمی کو تو کوفے کا گورنر مقرر کرنا ہی تھا۔ اب کوفے کے مراعات طبقے کی درخواست پر وہ گورنر کی تبدیلی کے ذریعے اس طبقے کو بھی زیر احسان کرنا چاہتا تھا۔

اس خط کے ملتے ہی یزید نے فوری طور پر بصرے کے سخت گیر گورنر عبید اللہ ابن زیاد کو کوفے کا بھی گورنر مقرر کر دیا اور اسے لکھا کہ وہ نعمان ابن بشیر کو معطل کر کے خود کوفے کی حکومت سنبھال لے۔ اس نے ابن زیاد کو حکم دیا کہ اس خط کو پڑھتے ہی بصرہ چھوڑ کر کوفے روانہ ہو جاؤ۔ سستی اور کاہلی کا مظاہرہ نہ کرنا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم علیؓ کی نسل میں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑو اور مسلم بن عقیل کا سر کاٹ کر میرے پاس روانہ کر دو۔

یہ خط بصرے پہنچا تو وہاں حسین علیہ السلام کا قاصد پہلے ہی شہید کیا جا چکا تھا۔ خط کو پڑھ کر ابن زیاد کی ظالم اور سفاک طبیعت خوش ہو گئی۔ اسے قتل و غارت گری کا ایک نیا بہانہ ہاتھ آگیا تھا۔ اس نے اسی دن اپنے بھائی عثمان ابن زیاد کو بصرے میں اپنا قائم مقام بنایا اور خود مسلح سواروں کے ساتھ کوفے کی طرف روانہ ہو گیا۔ مسلم بن عمر باہلی، منذر بن جارود اور شریک بن اعور اس کے ساتھ تھے۔

☆☆☆

کوفے میں جمعہ کی نماز کے دوران یہ خبر پھیل گئی کہ شہر سے باہر ایک قافلہ آکر ٹھہرا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی مسلمانوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ سمجھے کہ نواسۂ رسولؐ کوفے آن پہنچے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہو نہ ہو یہ حسین علیہ السلام کا قافلہ ہے۔ یہ خبر گلیوں بازاروں میں پھیلی تو اہل بیتؑ سے محبت رکھنے والے مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور بچوں نے والہانہ انداز میں شہر کے بیرونی حصے کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔

اس وقت شام ہو رہی تھی۔ رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ابن زیاد سر پر سیاہ عمامہ باندھے سفید لباس پہنے چادر لپیٹے، منہ پر ڈھاٹا باندھے، آلات جنگ جسم پر سجائے ایک

اونچے چچر پر سوار، اپنے سپاہیوں کے ساتھ اندرون شہر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

آسمان پر چاند نکل آیا تھا لیکن اس کی ہلکی ہلکی روشنی رات کے اندھیرے کو دور کرنے میں ناکام تھی۔ اس اندھیرے میں کوفے کے سادہ لوح مسلمان ابن زیاد کو نہ پہچان سکے۔ وہ اسے نواسۂ رسولؐ سمجھ رہے تھے۔ "مرحبا مرحبا فرزند رسولؐ" کے نعروں سے ابن زیاد کا استقبال کیا گیا۔ لوگ عقیدت بھرے نعرے لگاتے ہوئے اسے گھیرے ہوئے کوفے کے گورنر ہاؤس تک لائے۔ نعمان بن بشیر بھی ابن زیاد کو نہیں پہچان سکا تھا اسی لیے اس نے گورنر ہاؤس کے دروازے بند کرا دیئے تھے۔ گورنر ہاؤس کے بند دروازوں کو دیکھ کر ابن زیاد نے اچانک ہی اپنی نقاب ہٹائی اور نعمان بن بشیر کو حکم دیا کہ دروازے کھول دو۔

ابن زیاد کے چہرے سے نقاب ہٹی تو لوگوں نے اسے پہچان لیا۔ ایک شخص نے گھبرائی ہوئی آواز میں چیختے ہوئے کہا۔ "خدا کی قسم! یہ حسین علیہ السلام نہیں۔ یہ ابن زیاد ہے مرجانہ کا بیٹا۔" اس آواز کا سننا تھا کہ مجمع ادھر ادھر بکھرنے لگا۔ گورنر ہاؤس کے دروازے کھل چکے تھے اور ابن زیاد اپنی چالاکی سے کوفے کے مسلمانوں کے جذبات کا اندازہ لگا چکا تھا۔

اگلے دن نماز کے بعد ابن زیاد تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہوا۔ سب سے پہلے اس نے حاظرین سے سوال کیا۔ "تم لوگ جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟"

ابھی تک تمام لوگوں کو معلوم ہی نہیں ہو سکا تھا کہ رات کے وقت کوفے میں داخل ہونے والا بصرے کا گورنر تھا۔ انھوں نے تو یہی سنا تھا کہ حسینؑ کوفے پہنچ گئے ہیں اس لیے کئی لوگوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ "آپ حسین ابن علیؑ ہیں۔"

یہ سن کر زیاد کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے غراتے ہوئے کہا۔ "میں حسین نہیں، عبید اللہ ابن زیاد ہوں۔ امیر المومنین یزید ابن معاویہ کی تلوار۔"

اس کے بعد اس نے ایک سخت تقریر کی اور اپنے افسروں کو حکم دیا کہ جو لوگ مسلم بن عقیل کی حمایت کر رہے تھے ان کے نام لکھے جائیں۔ ایسے لوگوں کو ان کے گھروں کے دروازے پر پھانسی دے دی جائے اور گھر کا سازو سامان لوٹ کر ان کے بیوی بچوں کو قید کر لیا جائے۔

☆☆☆

کوفے کے بدلتے ہوئے حالات کی خبریں حضرت مسلم بن عقیلؑ تک پہنچ رہی تھیں۔ مختار ثقفی جن کے مکان میں وہ ٹھہرے ہوئے تھے پہلے ہی حکومت کی نظر میں تھے۔ وہاں کسی وقت بھی چھاپہ پڑ سکتا تھا اس لیے انھوں نے اپنے بااعتماد ساتھیوں کو روپوش ہونے کی ہدایت دے کر خود وہ مکان چھوڑ دیا اور عام سے لباس میں گھر سے نکل کر کوفے کے رئیس اور صحابی رسول جناب ہانی ابن عروہؓ کے مکان میں پناہ لے لی۔

ابن زیاد کے جاسوس کتوں کی طرح ان کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ آخر انہیں حضرت مسلمؑ کی نئی پناہ گاہ کا پتا چل گیا۔ ہانی ابن عروہؓ چونکہ قبیلے مدحج کے رئیس تھے۔ ابن زیاد کے فوجی براہ راست ان کے گھر پر حملہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے یہ اطلاع ملتے ہی ابن زیاد جناب ہانیؓ کی مزاج پرسی کے بہانے خود ان کے گھر پہنچ گیا۔

حضرت مسلمؑ کے وفادار ساتھیوں نے ان سے کہا کہ جب ابن زیاد، ہانی ابن عروہؓ کے پاس آکر بیٹھے تو آپ اچانک پیچھے سے آکر اسے قتل کر دیں۔ اس طرح آپ کو ایک بڑے فتنے سے نجات مل جائے گی۔ لیکن حق کے نمائندے کے لیے یہ ممکن نہیں تھا

وہ با ے۔ جناب ؓ نے موقع ملنے کے باوجود ابن زیاد پر حملہ نہیں کیا اور وہ حالات کی سن گن لے کر واپس چلا گیا۔

ابن زیاد کا شک یقین میں بدل چکا تھا کہ مسلم بن عقیل ہانی کے گھر میں موجود ہیں اسی لیے واپس جا کر اس نے جناب ہانیؓ کو دربار میں طلب کر کے ان سے کہا کہ وہ مسلم بن عقیل کو حکومت کے حوالے کر دیں لیکن جناب ہانی نے انکار کر دیا۔ ان کے انکار کے بعد ابن زیاد کے حکم پر ان بزرگ صحابیؓ کو پانچ سو کوڑے مار کر شہید کر دیا گیا۔

شہادت کی خبر چھپانے کی کوشش کے باوجود یہ خبر گورنر ہاؤس سے نکل کر سارے کوفے میں پھیل گئی اور قبیلہ مدحج کے ہزاروں مسلح افراد نے گورنر ہاؤس کا گھیراؤ کر لیا۔ اس وقت قاضی شریح نے باہر آ کر لوگوں کے سامنے قسم کھائی کہ ہانی کے قتل کی خبر غلط ہے۔ انہیں ابن زیاد نے مشوروں کے لیے روکا ہوا ہے۔ بہت سے لوگ قاضی شریح کی سفید داڑھی' بزرگی اور اللہ رسولؐ کی قسموں سے دھوکا کھا گئے لیکن کچھ لوگوں نے چیخ چیخ کر کہا کہ یہ بڈھا اپنا دین بیچ چکا ہے لیکن کوفے کی انتظامیہ مصدقہ خبر کو مشکوک بنانے میں بہر حال کامیاب ہو چکی تھی جس کے نتیجے میں سارا مجمع اختلاف کا شکار ہو کر بکھر گیا۔

مجمع بکھرا تو کوفے میں گرفتاریاں ہونا شروع ہو گئیں۔ بہت سے لوگ روپوش ہو گئے' بہت سے افراد قید خانوں میں بند کر دیئے گئے۔ جنہوں نے مقابلے کے لیے تلوار اٹھائی ان کا سر قلم کر دیا گیا۔ بیعت کرنے والے اٹھارہ ہزار کوفیوں میں سے اب سو سے بھی کم افراد امام حسینؓ کا ساتھ دینے عہد پر قائم تھے۔ باقی لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے تھے۔ جو لوگ آخری دم تک حضرت مسلم بن عقیلؓ کے وفادار

تھے' شہر کی سخت ناکہ بندی' فوجیوں کے گشت اور کڑی نگرانی کی وجہ سے ان کی طاقت منتشر ہو گئی۔ کوفے کے مختلف محلوں کے درمیان فاصلے تھے اور اب کسی شخص کا حضرت مسلمؑ تک زندہ پہنچنا ممکن نہیں رہا تھا۔

اسی روز نماز عشاء کے بعد ابن زیاد نے مسجد میں خطبہ دیا اور یہ اعلان کیا کہ محلوں کا محاصرہ کر کے ہر گھر کی خانہ تلاشی شروع کی جائے گی اور جس گھر سے مسلم بن عقیلؑ گرفتار ہوں اس گھر کے مالک کو قتل کر دیا جائے گا۔ جو شخص بھی مسلم کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے اس پر مسلم کو پناہ دینے والے کا خون معاف ہے۔

اس اعلان کی اطلاع حضرت مسلمؑ کو پہنچی تو آپؑ نے ہانی ابن عروہؓ کا مکان بھی چھوڑ دیا اور ایک طرف کو چل پڑے۔ رات کی تاریکی میں آپ "طوعہ" نامی ایک بزرگ خاتون کے گھر پہنچے۔ طوعہ اہل بیتؑ سے محبت کرتی تھیں انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ یہ سفیر حسینؑ ہیں تو انہوں نے آپ کو اپنے گھر کے تہہ خانے میں پناہ دے دی۔

باہر ہر طرف فوج کے مسلح دستے گشت کر رہے تھے' ذرا سا شک ہونے پر لوگوں کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ ایسے میں طوعہ کے بیٹے کو جو دربار ابن زیاد میں نوکر تھا حضرت مسلم بن عقیل کے بارے میں معلوم ہو گیا کہ وہ خود اس کے گھر میں چھپے ہوئے ہیں۔

بس پھر کیا تھا! صبح ہوتے ہوتے اس پورے علاقے کا محاصرہ کر لیا گیا۔ حضرت مسلم بن عقیل نے جب دیکھا کہ ابن زیاد کے فوجی گھر میں داخل ہونے والے ہیں تو آپ تلوار کھینچ کر باہر نکل آئے۔

مسلم بن عقیل ایک لمحے کو بھی موت سے خوف زدہ نہیں ہوئے تھے۔ اب تک

مختلف جگھوں پر چھپے رہنے کی وجہ یہ تھی کہ آپ مناسب وقت کے انتظار میں تھے۔ وہ خود کو ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آپ اس انتظار میں تھے کہ شاید کوفے کے لوگوں کے درمیان ایک مرتبہ پھر عزم وہمت پیدا ہو جائے اور وہ متحد ہو کر ظالم حکومت کے خاتمے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ شاید ان کی بکھری ہوئی طاقت کبھی دوبارہ جمع ہو سکے، کچھ لوگ ان تک پہنچ سکیں اور حکومت کے خلاف جدوجہد کو نیا خون اور نئی توانائی فراہم ہو جائے۔ بس اسی خیال سے وہ اب تک خود کو بچانے کی کوشش کرتے رہے تھے لیکن جب ابن زیاد کے فوجیوں نے ان کی پناہ گاہ کو ہر طرف سے گھیر لیا تھا تو اب براہ راست مقابلہ کرنے کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں بچا تھا۔

حضرت مسلم بن عقیلؓ نے گھر سے باہر آکر ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ اردگرد کی تمام گلیوں سے ابن زیاد کے مسلح فوجیوں کا سیلاب امنڈ رہا تھا۔ فوجی دستوں کے سردار نے حضرت مسلم بن عقیلؓ کو ہتھیار پھینک کر گرفتاری پیش کرنے کو کہا۔ مسلم بن عقیلؓ نے تلوار ہوا میں لہراتے ہوئے اسے اپنے ارادے سے باز آنے یا مقابلہ کرنے کی دعوت دی اور اس کے ساتھ ہی کوفے کی تنگ گلیاں تلواروں کی جھنکار سے گونج اٹھیں۔ حضرت مسلم بن عقیلؓ پھرے ہوئے شیر کی طرح بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے۔ پہلے حملے میں ایک سو اسی سپاہی مسلم بن عقیلؓ کی تلوار کا شکار ہوئے اور باقی فوج تپلی تپلی گلیوں میں پسپا ہونے لگی۔

فوج کے سردار محمد ابن اشعث نے یہ رنگ دیکھا تو اس نے گورنر ہاؤس سے مزید کمک طلب کی۔ ابن زیاد نے مزید پانچ سو سپاہی بھیج دیے۔ حضرت مسلم بن عقیل نے دوبارہ حملہ کیا تو ساری فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ یہ دیکھ کر محمد ابن اشعث نے دوبارہ ابن زیاد

مدد طلب کی تو ابن زیاد غصے سے بھنا گیا۔ اس نے محمد ابن اشعث کو پیغام بھیجا کہ تیری ماں تیرے غم میں بیٹھے ایک اکیلے آدمی سے لڑنے کے لیے اتنے سپاہی تیرے لیے کافی نہیں ہیں؟

محمد ابن اشعث نے جواب بھجوایا کہ اے امیر! کیا تو یہ سمجھ رہا ہے کہ تو نے ہمیں کسی بنیے یا سبزی فروش سے جنگ کرنے بھیجا ہے۔ مسلم بن عقیل بنی ہاشم کے خاندان کے فرد ہیں۔ یہ اس وقت ہمارے لیے شیر درندہ اور خدا کی شمشیر برہنہ بنے ہوئے ہیں۔

یہ سن کر ابن زیاد نے مزید پانچ سو سوار محمد ابن اشعث کی مدد کے لیے روانہ کیے۔ نئی کمک کے باوجود محمد ابن اشعث کا خوف کم نہیں ہوا تھا۔ اس نے تلوار روکتے ہوئے حضرت مسلم بن عقیل کو اپنی مکاری کے جال میں پھنسانا چاہا اور چیخ کر بولا۔ ''مسلم بن عقیل! تلوار روک لو۔ امیر کوفہ نے تمہیں امان دے دی ہے۔''

حضرت مسلم بن عقیلؓ نے امان کی اس پیش کش کو حقارت سے ٹھکراتے ہوئے فوجی دستے پر حملہ کر دیا۔ آخر ابن زیاد کے فوجی ارد گرد کے مکانوں کی چھتوں پر چڑھ گئے اور انہوں نے کوٹھوں پر سے تیروں، پتھروں اور آگ کی بارش برسانا شروع کر دی۔

حضرت مسلم بن عقیل تیروں کی بارش میں گھر گئے۔ پتھروں نے آپ کے جسم کو لہولہان کرنا شروع کر دیا تھا لیکن آپ کے حملوں کی شدت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ گلیوں میں موجود فوجیوں نے راستے میں ایک گڑھا کھود کر پسپا ہونا شروع کیا اور حضرت مسلم بن عقیل حملہ کرتے کرتے اس گڑھے میں گر گئے۔ آپ کو ہر طرف سے گھیر کر قید کر لیا گیا اور آپؓ کے ہاتھ گردن سے باندھ کر آپ کو ابن زیاد کے سامنے پیش کیا گیا۔

اس وقت آپ سر سے پیر تک خون میں نہائے ہوئے تھے لیکن آپ کا سینہ تنا ہوا

اور سر بلند تھا۔ اس وقت ایک سپاہی نے انھیں پیچھے سے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ "امیر کو سلام کرو۔"

حضرت مسلم بن عقیلؑ نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے فرعونیت کے مجسمے ابن زیاد کو دیکھا اور زخمی شیر کی طرح گرج کر بولے۔ "کون امیر! میرا امیر' میرا سردار حسینؑ ہے۔ حسین ابن علیؑ! نواسۂ رسولؐ۔ ابن زیاد کو تو وہ سلام کرے جسے موت کا خوف ہو۔"

حسین ابن علی کا نام سن کر ابن زیاد کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ اس نے غصے سے جھنجلاتے ہوئے بکر ابن حمران کو حکم دیا کہ مسلم بن عقیل کو چھت پر لے جا کر انھیں گورنر ہاؤس کی چھت سے نیچے گرا دیا جائے۔

سفیر حسین مسلم بن عقیل اپنے خون میں ڈوبے ہوئے قدموں سے چلتے ہوئے اپنی قتل گاہ میں پہنچے۔ قاتلوں نے انہیں چھت کے کنارے پر کھڑا کیا۔ اس وقت بھی حق کے نمائندے کا سر بلند اور سینہ تنا ہوا تھا لیکن اپنے بھائی' اپنے سردار' اور امام وقتؑ کو یاد کر کے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔ آپؑ نے شہر کا ایک طائرانہ نظارہ کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ چشم تصور میں اپنے آقا و مولا امام حسینؑ کو کوفے کی طرف آنے والے راستوں پر سفر کرتے ہوئے دیکھا اور بہ آواز بلند کہا۔ "السلام علیک یا ابا عبداللہؑ!"

حسین ابن علیؑ کا نام سن کر ان کا قاتل نفرت اور غصے سے بے قابو ہو گیا۔ اس نے پوری طاقت سے آپؑ کو دھکا دیا۔ آپ کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ اسی حالت میں آپؑ اونچی عمارت سے نیچے گرے تو جسم کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں لیکن آپ میں ابھی زندگی

کی رمق باقی تھی۔ نیچے ابن زیاد کے ظالم اور سفاک درندے حلقہ بنائے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک آگے بڑھا اور اس نے سفیر حسینؑ کا سر کاٹ لیا۔ اس کے بعد خوشی اور مسرت سے چیختے ہوئے ہجوم نے آپؑ کی لاش کو کوفے کی گلیوں میں گھسیٹنا شروع کیا۔ وہ درندوں کی طرح چیخ رہے تھے اور حضرت مسلم بن عقیلؑ کی لاش کو اینٹوں، پتھروں اور سڑک کی غلاظتوں پر گھسیٹتے ہوئے خوشی کے نعرے لگا رہے تھے۔

☆☆☆

شہر کوفہ اہل بیتؑ کے چاہنے والوں کے لیے موت کا شہر بن چکا تھا۔ شہر کے قید خانے اسلام کے جانثاروں کے لیے ٹارچر سیل میں تبدیل ہو گئے تھے۔ جن لوگوں نے حکومت کے خلاف تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا انہیں قتل کر کے ان کے گھروں کو لوٹا جا چکا تھا۔ حضرت مسلم بن عقیلؑ اور جناب ہانی بن عروہؓ کے سر کاٹ کر ان کی لاشیں ابن زیاد کے حکم پر بازار قصاباں میں لٹکا دی گئی تھیں۔

اگلے دن عید قربان تھی۔ دین اسلام کے جانثاروں کی بازار کے بچوں بیچ لٹکی خون ٹپکتی لاشوں کے قریب ہجوم بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ نام نہاد مسلمان اپنے بچوں کے ہاتھ تھامے بازار قصاباں میں قربانی کرنے کے لیے بھیڑ بکرے اور اونٹ پسند کرتے پھر رہے تھے اور ان کے قریب ہی دین ابراہیمیؑ کو بچانے والوں کی الٹی لٹکی ہوئی، سر کٹی لاشوں سے ان کا تازہ تازہ خون قطرہ قطرہ ٹپک کر نمرود کی خدائی کے خلاف ہمیشہ جاری رہنے والی جنگ کا اعلان کر رہا تھا۔

ٹوٹے ہوئے تارے

بچے سفاک دشمنوں کے درمیان اکیلے تھے۔ حکومت کے مخبر شکاری کتوں کی طرح ان کی تلاش میں مصروف تھے پناہ دینے والا انھیں صحرائی راستے پر اکیلا چھوڑ گیا۔

باب۔ ۳

کوفے میں ایمر جنسی نافذ تھی۔ گلیوں اور محلوں میں ہر وقت گھڑ سوار سپاہی، مسلح افراد اور فوجی دستے آتے جاتے نظر آتے تھے۔ شہر کے بد معاشوں اور مجرموں کی بن آئی تھی۔ جگہ جگہ فوجی بھرتی کے دفتر کھلے ہوئے تھے' جہاں ایک فوجی مہم میں شریک ہونے والوں کے لیے بڑے بڑے انعامات کا لالچ دیا جارہا تھا۔ شہر کے غنڈے اور بد معاش جوق در جوق آکر فوجی بھرتی کے لیے اپنے نام لکھوا رہے تھے۔

دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اسی طاقت نے بہت سے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی مجبور کردیا تھا کہ وہ بھی اس فوجی مہم میں شریک ہوں جو حکومت کے کہنے کے مطابق حکومت سے بغاوت کرنے والے لوگوں کے خلاف تیار کی جارہی تھی۔ عام مسلمانوں کی زندگی اجیرن ہو چکی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو دل ہی دل میں حکومت کو برا بھلا کہتے تھے۔ وہ اللہ کے احکامات کا مذاق بنتے ہوئے دیکھتے تھے مگر ان میں بولنے کی ہمت نہیں تھی ان کے سامنے قرآن کا مضحکہ اڑایا جاتا مگر یہ لوگ بس دل ہی دل میں افسوس کر کے رہ جاتے تھے۔ ایسے لوگ ہر معاشرے میں زیادہ تعداد میں ہوتے ہیں۔

مگر انھی لوگوں میں بہت کم تعداد میں وہ دلیر اور بہادر مسلمان بھی تھے جو غیر اسلامی حکومت اور اس کے ظلم و ستم کے خلاف اپنے اپنے انداز سے عملی کام کر رہے تھے۔ حبیب ابن مظاہرؓ، سلیمان ابن صرد خزاعیؓ، مسلم بن عوسجہؓ، مختار ثقفیؓ، ہانی بن عروہؓ اور محمد ابن کثیرؓ انہی بہادروں میں شامل تھے۔

☆☆☆

حضرت مسلم بن عقیل جب کوفے میں داخل ہوئے تو آپ کے دو بچے ابراہیم اور محمد بھی آپ کے ساتھ تھے۔ حضرت عباسؓ کی بہن جناب رقیہ، حضرت مسلم بن عقیل کی شریکِ حیات تھیں۔ حضرت مسلم بن عقیلؓ کی بہن حضرت عباسؓ کی زوجہ تھیں۔ یعنی حضرت عباسؓ اور حضرت مسلمؓ ایک دوسرے کے بہنوئی بھی تھے اور برادر نسبتی بھی تھے۔

ابراہیم اور محمد کی عمریں اس وقت سات آٹھ سال کی تھیں۔ کوفے میں یزیدی لشکر کے ہاتھوں اپنے والد کی شہادت کے بعد وہ دونوں بچے کوفے میں لاوارث ہو گئے تھے۔ اجنبی شہر، ہر طرف سے دشمنوں کا خطرہ، خوف و ہراس کا ماحول، باپ کا ظالمانہ قتل، ان سب حادثوں نے بچوں کو بے حواس کر رکھا تھا۔ اتفاق سے ایک گھر میں انہیں عارضی پناہ مل گئی تھی اسی لیے یہ بچے ابھی تک دشمنوں سے محفوظ تھے۔

ابن زیاد کو جیسے ہی یہ معلوم ہوا کہ مسلم بن عقیلؓ کے دو بیٹے بھی کوفے میں موجود ہیں تو اس نے اپنے مخبروں اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان بچوں کو ہر قیمت پر تلاش کیا جائے۔ اس نے یہ اعلان بھی کیا کہ جو شخص بھی مسلم بن عقیلؓ کے بچوں کا سر کاٹ کر لائے گا اسے انعام واکرام سے نوازا جائے گا۔ ان بچوں کے سر کی قیمت مقرر کی گئی تو

انہیں اپنے گھر میں چھپانے والا بھی خوف زدہ ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ دولت کے لالچ میں اس کا کوئی قریبی آدمی بھی اس کی مخبری کر سکتا ہے۔

وہ شخص اسی وقت اپنے گھر کے تہہ خانے میں پہنچا جہاں محمد اور ابراہیم چھپے ہوئے تھے۔ اس کے قدموں کی آواز سن کر بچے ڈر گئے تھے کیوں کہ ایسے وقت میں کوئی بھی تہہ خانے میں نہیں آتا تھا۔

"بچو! گھبراؤ نہیں۔ ابھی کوئی خطرہ نہیں ہے۔" اس شخص نے کہا۔

"اے شیخ! ہمارے ماموں جان کی بھی کچھ خبر ہے؟ کیا وہ ابھی تک کوفے نہیں پہنچے۔" ابراہیم نے کہا۔ دونوں بچے یہی سمجھ رہے تھے کہ ان کے چہیتے ماموں حضرت امام حسینؓ کسی بھی دن کوفے پہنچ جائیں گے۔

"راستوں پر پہرے ہیں، باہر کی کوئی خبر ہم تک نہیں پہنچتی اس لیے معلوم نہیں کہ امام حسینؓ اس وقت کہاں ہیں۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"ہم لوگ یہاں کب تک چھپے رہیں گے؟" محمد نے معصومیت سے سوال کیا۔

"ایک قافلہ آج صبح سویرے مدینے جا رہا ہے۔ میں آپ دونوں کو وہاں بھجوا دیتا ہوں۔" اس شخص نے کہا۔

"قافلہ مدینے جا رہا ہے!" محمد کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

"ہمیں جلد از جلد اس قافلے تک پہنچا دو۔ یہاں کوفے میں تو ہمیں ہر طرف موت ہی نظر آ رہی ہے۔" ابراہیم نے بے تابی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ رات کے آخری حصے میں میرا بیٹا آپ دونوں کو وہاں پہنچا دے گا۔" اس شخص نے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

رات کے آخری پہر جب ہر طرف گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی، محمد اور ابراہیم ایک آدمی کے ساتھ اپنی پناہ گاہ سے نکلے۔ قدم قدم پر موت کا خوف تھا۔ وہ شخص چھوٹی چھوٹی گلیوں سے گزرتا ہوا ان بچوں کو کوفے کے ایک دروازے سے باہر نکال لایا تھا۔ سامنے ایک بڑا سا میدان تھا۔ یہاں قافلے آکر ٹھہرا کرتے تھے۔

وہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ مدینے جانے والا قافلہ ابھی ابھی یہاں سے روانہ ہوا ہے۔ صبح کے ملگجے اندھیرے میں قافلے کے اونٹوں کی آوازیں دور ہوتی سنائی دے رہی تھیں۔ دونوں بچوں کے دل کٹ کر رہ گئے۔ وہ تو بڑی امیدوں کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ قافلے میں شامل ہوتے ہی ان کی زندگی محفوظ ہو جائے گی۔

"قافلہ ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہے۔ اگر آپ اس کے پیچھے دوڑنا شروع کریں تو قافلے تک پہنچ سکتے ہیں۔" بچوں کے ساتھ آنے والے شخص نے کہا۔ وہ ان بچوں کو دوبارہ شہر کے اندر لے جانے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

"ہاں بھائی! ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔" ابراہیم نے محمد سے کہا۔ بچے بھی ساتھ آنے والے کی نیت اور مجبوری بھانپ گئے تھے۔

"ٹھیک ہے۔ اللہ تمہاری حفاظت کرے۔ تم جاؤ ہم قافلے کا پیچھا کرتے ہیں۔" محمد نے ساتھ آنے والے سے کہا اور دونوں بھائی آگے بڑھنے لگے۔ ساتھ آنے والا تیزی سے پلٹا اور شہر کی طرف بھاگنے لگا۔

سورج طلوع ہونے میں ابھی دیر تھی۔ صبح کا ملگجا اندھیرا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ اسی اندھیرے میں دونوں بھائیوں نے اندازے سے قافلے کی آوازوں کے پیچھے دوڑنا

شروع کر دیا۔ کئی دن سے انہوں نے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ جن حالات سے گزرے تھے ان حالات میں بھوک کسے لگتی ہے! بھاگتے بھاگتے وہ بہت جلد تھک گئے۔

قافلہ بہت دور نکل چکا تھا۔

اب سورج نکل آیا تھا۔ ہر طرف روشنی پھیل رہی تھی۔ راستوں پر اکا دکا گھڑ سوار آتے جاتے نظر آرہے تھے۔ اسی دوران ابن زیاد کے چند سپاہی ادھر سے گزرے۔ انہوں نے بچوں کو دیکھا تو ان کے قریب آئے۔ "کون ہو تم دونوں؟" ایک سپاہی نے سختی سے پوچھا۔

"ہم مسلم بن عقیلؑ کے بیٹے ہیں۔" ابراہیم نے جواب دیا۔

"تمہیں معلوم کہ تمہارے سر کی قیمت مقرر ہے۔" دوسرا سپاہی بولا۔

"ہاں ہمیں معلوم ہے۔" محمد نے جواب دیا۔

"اگر تمہیں معلوم تھا تو تم جھوٹ بول کر اپنی جان بچا سکتے تھے۔" ایک سپاہی بولا۔

"جھوٹ بولنا ہمارے خاندان کا شیوہ نہیں۔ انسان کو ہمیشہ سچ بولنا چاہئے۔" ابراہیم نے جواب دیا۔

"اگر تم جھوٹ بولتے تو شاید تمہاری جان بچ جاتی۔ سچ بول کر تم نے اپنی زندگی کو کم کر لیا ہے۔" سپاہی طنزیہ لہجے میں بڑبڑایا اور ان دونوں بچوں کو رسیوں سے باندھ کر اپنے ساتھ گھوڑے پر بیٹھا لیا۔

بچے گرفتار ہو کر ابن زیاد کے پاس پہنچے۔ اس نے انہیں ایک قید خانے میں بند کرا دیا۔ قید خانے کا نگران اہل بیتؑ کا چاہنے والا تھا لیکن یہ بات وہ کسی پر ظاہر نہیں کرتا تھا۔

اسے بچوں کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے رات کے آخری حصے میں انہیں رہا کر دیا۔ اس نے ان بچوں کو قادسیہ جانے والے راستے تک پہنچا دیا۔ اس نیک انسان نے بچوں کو نشانی کے طور پر اپنی انگوٹھی دی اور کہا۔ "قادسیہ پہنچ کر یہ انگوٹھی میرے بھائی کو دینا۔ وہ آپ دونوں کو کسی نہ کسی طرح مدینے تک پہنچا دے گا۔"

☆☆☆

ابراہیم اور محمد دوسری مرتبہ موت سے بچ نکلے تھے لیکن وہ قادسیہ کی جانب بڑھ رہے تھے کہ کوفے میں ان کے محسن کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ فوجی سپاہی اور مخبر دوبارہ ان بچوں کی تلاش میں کتوں کی طرح ادھر ادھر مارے مارے پھرنے لگے۔

حضرت مسلمؓ کے یہ دونوں کمسن بیٹے راستوں سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے راستہ بھٹک کر کوفے ہی کے گرد و نواح میں گھومتے رہے۔ بہت جلد انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ ابھی تک کوفے ہی کے علاقے میں موجود ہیں جہاں سرکاری جاسوس ان کی تلاش میں گھوم رہے تھے۔ یہ احساس ہوتے ہی انھوں نے خود کو دشمن سے محفوظ رکھنے کے لیے دریا کے کنارے لگے ہوئے ایک درخت پر چھپنے کا ارادہ کر لیا۔ درخت کافی گھنا تھا۔ دونوں بچے اس درخت کی شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔

بھوک پیاس، مسلسل بے آرامی اور خوف کی وجہ سے بچوں کے پھول جیسے چہرے مرجھا کر رہ گئے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ رخساروں پر زردی پھیلی ہوئی تھی۔ پتا بھی کھڑکتا تو ان کے ننھے ننھے دل بے طرح دھڑکنے لگتے۔ چھوٹے بھائی محمد کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ بری طرح سہما ہوا تھا۔ بڑے بھائی ابراہیم کی عمر بھی صرف آٹھ سال تھی لیکن وہ بڑی ہمت کے ساتھ چھوٹے بھائی کو سنبھالے ہوئے تھے۔

کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے محمد کے لیے درخت پر چڑھنا مشکل تھا۔ ابراہیم ہی نے اسے سہارا دے کر بڑی مشکل سے درخت پر چڑھایا تھا۔ اب سارے شہر میں یہ درخت ہی ان کی پناہ گاہ رہ گیا تھا۔ کوفے کے چپے چپے پر ان کے دشمن پھیلے ہوئے تھے۔

یہ دونوں بھائی درخت پر چھپے ہوئے تھے کہ ایک عورت دریا سے پانی بھرنے کے لیے وہاں آئی۔ وہ عورت اپنا برتن پانی سے بھرنے کے لیے جھکی تو اسے پانی میں درخت کا عکس اور ان بچوں کے ہیولے سے دکھائی دیے۔ اس نے درخت کے نیچے جا کر دیکھا تو وہاں اسے دونوں بچے نظر آ گئے۔

"ارے تم لوگ یہاں کیوں چھپے بیٹھے ہو؟" اس عورت نے پوچھا۔

"دشمن ہماری تلاش میں ہیں اس لیے ہم یہاں چھپے ہوئے ہیں۔" ابراہیم نے جواب دیا۔

"تم بچوں سے کسی کو کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟" عورت نے دکھ بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"ہمارے ماموں امام حسینؑ یہاں آنے والے ہیں تاکہ مسلمانوں کو اس ظالم حکومت سے نجات دلائیں اسی لیے حکومت ہماری دشمن بن گئی ہے۔ ہمارے والد کو بھی چند روز پہلے شہید کیا جا چکا ہے۔" ابراہیم نے عورت کو بتایا۔

"تم دونوں مسلم بن عقیلؑ کے بیٹے ہو!" اس عورت کے لہجے میں عقیدت واحترام تھا۔ "تم یہیں چھپے رہنا۔ میں تمہاری جان بچانے کی کوشش کرتی ہوں۔" اس عورت نے کہا اور پانی بھرے بغیر اپنے گھر لوٹ گئی۔

یہ عورت ایک گھر کی کنیز تھی۔ وہ اور اس کی مالکن دونوں ہی خاندان اہل بیتؑ

سے محبت کرتی تھیں۔ اس نے گھر جا کر اپنی مالکن کو ساری بات بتائی تو وہ ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی دریا کے کنارے پہنچی۔ اس کا گھر دریا کے قریب ہی بنا ہوا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح ان دونوں بچوں کو اپنے گھر لے گئی۔ اس نے بچوں کا منہ ہاتھ دھلایا اور ان کے کھانے پینے کا انتظام کیا پھر اس نے دونوں بچوں کو گھر کے تہہ خانے میں لے جا کر لٹایا اور تہہ خانے کا دروازہ باہر سے بند کر کے اس میں تالا ڈال دیا تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔

☆☆☆

اس عورت کا شوہر انتہائی بدقماش انسان تھا۔ اس کا نام حارث تھا اور دشمنان اہل بیتؑ میں شمار ہوتا تھا۔ اس نیک عورت کو یہ خوف تھا کہ شوہر کو بچوں کے بارے میں معلوم نہ ہو جائے۔

رات گئے اس کا شوہر گھر میں داخل ہوا۔ وہ سخت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

"آج تم بڑی دیر سے گھر آئے۔ خیریت تو ہے!" عورت نے پوچھا۔

"ارے کیا بتاؤں۔ مسلم بن عقیل کے دونوں بیٹے بڑی مشکل سے گرفتار ہوئے تھے لیکن مشکور نامی نگران نے انہیں چپکے سے آزاد کر دیا۔ ابن زیاد نے مشکور کو تو قتل کرا دیا ہے لیکن بچوں کا ابھی تک سراغ نہیں ملا۔" حارث ناگواری سے بڑبڑایا۔

"تم سے کیا مطلب۔ تم نے تو انہیں رہا نہیں کیا۔" نیک عورت نے کہا۔

"تم سے کیا مطلب۔۔۔!" حارث غصے سے بولا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ میں صبح سے ان بچوں کو تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ اگر وہ بچے میرے ہاتھ آ گئے تو ہماری زندگی سنور جائے گی۔"

"یہ زندگی تو شاید سنور جائے مگر آخرت میں تو تم ہمیشہ عذاب میں گرفتار رہو

"آخرت ۔۔۔!" حارث غرور سے مسکرایا۔ "آخرت، قیامت، قرآن، اللہ، رسول یہ سب بنی ہاشم کی بنائی ہوئی باتیں ہیں۔ تم مجھے ان سے نہ ڈرایا کرو۔" وہ غصے میں بڑبڑایا۔

اس کی نیک بیوی خاموش ہوگئی۔ اس کا دل انجانے خوف سے بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ نیچے تہہ خانے میں موجود بچے کہیں کوئی ایسی حرکت نہ کریں کہ اس کے شوہر کو ان کی موجودگی کا علم ہو جائے۔

☆☆☆

رات دھیرے دھیرے گزرتی جا رہی تھی۔ نیک عورت آنکھیں بند کیے لیٹی تھی مگر نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کا شوہر حارث اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ وقت گزرتا رہا حتیٰ کہ مسجدوں سے فجر کی اذان بلند ہونے لگی۔ عین اسی وقت حارث کو تہہ خانے سے کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی۔ اس کے کان کھڑے ہوگئے۔ "تہہ خانے میں کون ہے؟" اس نے بیوی سے پوچھا۔

"تہہ خانے میں کون ہو سکتا ہے۔ کسی جانور نے کوئی چیز گرائی ہوگی۔" نیک عورت نے اپنے شوہر کی توجہ ہٹانا چاہی۔

"میں خود دیکھتا ہوں۔" حارث نے کہا اور تہہ خانے کا دروازہ کھولنے لگا۔

☆☆☆

دونوں بھائی تہہ خانے میں اونگھ گئے تھے۔ اچانک ابراہیم کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے چھوٹے بھائی کو جگایا۔ "بھائی! ابھی میں نے

باباجان اور پنج تن پاکؑ کو خواب میں دیکھا ہے۔ وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ بیٹا ہم تمہارے انتظار میں ہیں۔''

''بھائی! میں نے بھی خواب میں امی جان اور عباسؑ ماموں کو روتے ہوئے دیکھا ہے۔''چھوٹے کے لہجے میں عجیب قسم کا درد تھا۔

بڑے بھائی نے اسے سینے سے لگالیا۔''بھائی! پریشان نہ ہو۔ ہماری مصیبتیں ختم ہونے والی ہیں۔ بابا ابھی خواب میں مجھ سے کہہ رہے تھے کہ تم دونوں جلد ہی میرے پاس آجاؤ گے۔''ابراہیم نے چھوٹے بھائی کے سر کو سہلاتے ہوئے اسے دلاسا دیا۔

اسی لمحے حارث تہہ خانے میں داخل ہوا۔ دونوں بچے گھبرا کر کھڑے ہوگئے۔ حارث انہیں دیکھتے ہی سمجھ چکا تھا کہ یہ دونوں مسلم بن عقیل کے بچے ہیں۔ خاندان اہل بیتؑ سے اس کی دشمنی اس کے چہرے سے چھلکنے لگی۔ ان بچوں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے بڑی بے دردی کے ساتھ ان معصوموں کو زدوکوب کرنا شروع کردیا۔

اسی دوران اس کی بیوی وہاں آگئی۔ اس نے بچوں کو بچانا چاہا تو حارث نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ دیوار سے ٹکرائی اور بے ہوش ہو کر زمین پر گر گئی۔ تہہ خانے میں شور کی آوازیں سن کر حارث کا بیٹا اور ایک غلام بھی اندر آگئے۔ وہ دونوں بھی اہل بیتؑ سے محبت کرتے تھے۔ انہوں نے بچوں کو حارث کے ہاتھوں سے چھڑانا چاہا مگر حارث پر تو خون سوار تھا۔ اس نے اپنی تلوار نکالی اور اپنے بیٹے اور غلام دونوں کو قتل کردیا۔ وہ غصے سے دیوانہ ہوا جارہا تھا۔ اس نے دونوں بچوں کو پکڑ کر گھسیٹنا شروع کیا اور انہیں اسی طرح کھینچتا ہوا دریا کے کنارے لے گیا۔

بچوں   حالت انتہائی خراب ہو چکی تھی۔ انہوں نے حارث کو اللہ اور اس کے رسول ؐ کا واسطہ دیا لیکن یزید کا نوکر اپنے مالک کی طرح اللہ اور اس کے رسول ؐ کو مانتا ہی کب تھا کہ اس پر بچوں کی التجا کا کوئی اثر ہوتا۔

بچوں نے جب دیکھا کہ موت کے علاوہ کوئی راستہ باقی نہیں ہے تو انہوں نے حارث سے کہا کہ قتل کرنے سے پہلے ہمیں اتنی مہلت دے دے کہ ہم نماز ادا کر سکیں۔

"ٹھیک ہے۔ تم نماز پڑھنا چاہو تو پڑھ لو مگر اس سے تمہاری جان نہیں بچے گی۔" حارث نے اپنی تلوار نیام سے باہر نکالتے ہوئے کہا۔

"ہم اپنی جان بچانے کے لیے نماز کی مہلت نہیں مانگ رہے۔ یہ مہلت اس لیے مانگ رہے ہیں کہ نماز فجر کا وقت گزرا جا رہا ہے اور فرض نماز کو وقت پر ادا کرنا ہمارے گھرانے کی عادت ہے۔" ابراہیم نے دوٹوک جواب دا۔

حارث خاموش ہو گیا۔ وہ چند قدم آگے بڑھا جہاں دریا کے کنارے ایک بڑا سا پتھر زمین پر پڑا تھا۔ وہ اپنی تلوار بے قراری کے ساتھ پتھر پر رگڑنے لگا۔ وہ دونوں بھائیوں کو جلد از جلد قتل کرنے کو بے تاب تھا۔

ابراہیم اور محمد نے دریا کے پانی سے وضو کیا اور نماز کے لیے قبلہ رخ کھڑے ہو گئے۔ دونوں بھائیوں نے بہ آواز بلند تکبیر کہی اور رکوع کے لیے جھک گئے۔ بس اسی وقت حارث کی تلوار ہوا میں لہرائی ابراہیم کا سر جسم سے الگ ہو گیا۔ ابراہیم کے جسم سے ابلنے والے خون نے محمد کے لباس کو بھی سرخ کر دیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ بھائی کی طرف دیکھتے' حارث کی تلوار دوبارہ لہرائی اور محمد کو بھی خون میں نہلا گئی۔ محمد کا سر بھی

جسم سے الگ ہو چکا تھا۔

حارث نے دونوں بھائیوں کے جسموں کو گھسیٹ کر دریا میں ڈال دیا اور ان کے پھول جیسے سروں کو لے کر ابن زیاد کے دربار میں پہنچا۔ اس نے دونوں بھائیوں کے سر ابن زیاد کے آگے ڈالے تو ایک لمحے کو تو ابن زیاد بھی لرز کر رہ گیا۔

روایتوں میں ہے کہ ان چھوٹے چھوٹے پھول جیسے سروں کو دیکھ کر ابن زیاد تین مرتبہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور تین مرتبہ اپنی جگہ پر بیٹھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

آخر اس نے اپنے غلاموں سے کہا کہ ان سروں کو فوراً یہاں سے اٹھاؤ اور انہیں دریا میں اسی جگہ لے جا کر ڈال دو جہاں ان کے جسم ڈالے گئے تھے۔

یہ دونوں بچے کربلا کی کہکشاں کے ٹوٹے ہوئے تارے تھے جو اپنے باپ کی طرح غربت اور تنہائی میں سفاکی کے ساتھ قتل کیے گئے۔

موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے والوں کا ایک مختصر سا قافلہ مکہ معظمہ سے نکل کر سرزمین کوفہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ لوگ زبان ہی سے نہیں اپنے لہو کے ایک ایک قطرے سے "لبیک اللھم لبیک" کہنے کی جرات رکھتے تھے۔

باب۔ ۴

سن ساٹھ ہجری میں جب اللہ کا گھر اور امن کا شہر مکہ معظمہ شام، مصر، عراق، ایران اور دنیا کے دوسرے علاقوں سے آنے والے حاجیوں کے "لبیک اللھم لبیک" کے نعروں سے گونج رہا تھا اور حاجیوں کے قافلے منیٰ کی طرف جارہے تھے، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شہر مدینہ منورہ سے اٹھائیس رجب کو سفر کا آغاز کرنے والا اس وقت کے سب سے بڑھ کر باعلم، باعمل، پرہیزگار، بہادر، نڈر، ظالم حاکم کے سامنے کلمہ حق کہنے والوں اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے والوں کا ایک مختصر سا قافلہ مکہ معظمہ کی مقدس سرزمین سے کوفے کی سمت اپنے سفر کا آغاز کر رہا تھا۔ یہ وہ عظیم انسان تھے جو اپنی زبان ہی سے نہیں اپنے خون کے ایک ایک قطرے سے "لبیک اللھم لبیک" کہنے کی جرأت رکھتے تھے۔

اس قافلے کا سردار رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نواسہ اور علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا بہادر بیٹا تھا جو نہ ذلت کی زندگی جینا چاہتا تھا نہ گم نامی کی موت مرنا اسے پسند تھا۔ یہ کوئی عام انسان نہیں تھا۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوںؑ اور رسولوںؑ کی وراثت، اپنے باپ علی ابن ابی طالبؑ اور اپنے بھائی حسن ابن علیؑ کے بعد اس شخص کو ملی

۔اسی لیے تو اللہ کے آخری رسولؐ نے فرمایا تھا کہ حسینؓ مجھ سے اور میں حسینؓ سے ہوں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دونوں نواسوں سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ مسجد میں نماز جماعت کے دوران اکثر جب آپؐ سجدے میں جاتے تو ان میں سے کوئی بچہ رسول اللہؐ کی کمر پر جا کر بیٹھ جاتا۔ اللہ کے رسولؐ سجدے سے اس وقت تک سر نہ اٹھاتے جب تک یہ بچہ خود کمر سے نہ اتر جاتا۔ حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ سے نبی کریمؐ کی محبت صرف اس وجہ سے نہیں تھی کہ یہ دونوں ان کے نواسے تھے۔ اس محبت کی اصل وجہ یہ تھی کہ اللہ کے رسولؐ جانتے تھے کہ یہ دونوں بیٹے اللہ کے پسندیدہ ترین بندوں میں سے ہیں اور اپنے اپنے وقت میں، اپنے اپنے حالات کے مطابق یہ دونوں ایسی حکمت عملی اختیار کریں گے کہ اللہ کا دین مسخ ہو جانے یا مٹ جانے سے ہمیشہ کے لیے بچ جائے گا۔

مستقبل میں جو حالات رونما ہونا تھے وہ اللہ کے نبیؐ کو معلوم تھے۔ آپؐ جانتے تھے کہ بہت جلد وہ وقت آئے گا کہ دین اسلام کے دشمن اسلام کی نقاب پہن لیں گے اور عام مسلمانوں کے لیے سچ اور جھوٹ، حق اور باطل کے درمیان تمیز کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اللہ کے دین کو بچانے کے لیے ضروری ہوگا کہ ایسے وقت میں اللہ کے نمائندے بہترین حکمت عملی، منصوبہ بندی اور بے پناہ جرات و بہادری کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں اور بھٹکے ہوئے مسلمانوں اور ساری دنیا کے انسانوں کے سامنے اپنی جانوں پر کھیل کر اللہ کے وجود کی گواہی پیش کریں۔

سن ساٹھ ہجری ہی وہ دور تھا جب ایک انتہائی بدکردار انسان خلیفہ راشد حضرت

علی ابن ابی طالبؑ کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والی شامی مت کا سر براہ بنا۔ یہ یزید ابن معاویہ تھا۔ یزید نے بادشاہ بننے کے بعد سر کاری سطح پر اسلام کا مذاق اڑانا شروع کیا۔ اس نے کہا کہ کوئی کتاب نازل ہوئی نہ فرشتے، نہ جنت ہے نہ دوزخ۔ یہ سب بنی ہاشم (رسول اکرمؐ کے خاندان) کی بنائی ہوئی کہانیاں ہیں۔

عام مسلمان اسلام کے ان بنیادی عقائد کا مضحکہ اڑتے ہوئے دیکھتے رہے مگر رسول کریمؐ کے نواسے، علی ابن ابی طالبؑ اور فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا کے بیٹے، امام وقت، حسین ابن علیؑ کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ دوسروں کی طرح اسلامی تعلیمات کو مسخ ہوتے ہوئے دیکھتے رہتے۔

اللہ کی کتاب ان کے گھر میں اتری تھی اسی لیے وہ وارث قرآن تھے۔ آسمانوں سے نازل ہونے والے فرشتے ان کے گھر میں آیا کرتے تھے کہ آپؑ جنت کے جوانوں کے سردار تھے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلام کے شجر سایہ دار کی حفاظت و نگہداشت امام وقت کی حیثیت سے اب امام حسین علیہ السلام کی ذمے داری تھی۔

شام کا حکمران ایک مدت سے اپنے بد کردار بیٹے یزید کو خلافت اسلامی کا سر براہ بنانے کا خواب دیکھتا رہا تھا۔ اسی مقصد کے لیے وہ سن چھپن ہجری میں اپنے پورے لشکر کے ساتھ مدینے پہنچا۔ یہاں آکر اس نے نواسہ رسولؐ پر دباؤ ڈالا کہ آپ یزید کی بیعت کرلیں۔ وہ جانتا تھا کہ اگر حسین ابن علیؑ نے اس کے بیٹے کو مملکت اسلامی کا خلیفہ تسلیم کرلیا تو ساری ملت اسلامی اس کے آگے جھک جائے گی۔

امام حسین علیہ السلام نے واضح الفاظ میں یزید کی بد کرداری کا تذکرہ کیا اور ایسے زانی و شرابی انسان کو خلیفہ ماننے سے صاف انکار کردیا۔ اس کے بعد شام کے حکمران نے عبدالرحمٰن ابن ابی بکرؓ، عبداللہ ابن عمرؓ اور عبداللہ ابن زبیرؓ کو اپنی سازش میں شریک

ناچاہا۔ صحابہ کرامؓ کے یہ تینوں بیٹے بھی اس وقت مدینے ہی میں تھے۔ یہ تینوں افراد یزید کی مذمت تو نہ کر سکے لیکن اس کی بیعت پر راضی بھی نہیں ہوئے اور شام کے حکمران کے دباؤ سے پریشان ہو کر مکہ معظمہ چلے گئے۔ معاویہ ابن ابو سفیان ان کے پیچھے پیچھے مکے پہنچا لیکن انھیں راضی کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس وقت کے سیاسی حالات مدینے میں سخت اقدام کی اجازت نہیں دیتے تھے اسی لیے وہ مایوس ہو کر اپنے دارالحکومت لوٹ گیا اور چار سال کے بعد سن ساٹھ ہجری میں ناکامی کی ذلت، غصے، نفرت اور انتقام کی آگ کو اپنے سینے میں چھپائے وہ اس دنیا سے چلا گیا۔

اس وقت اس کا چہیتا بیٹا اور سلطنت شام کا وارث شکار کھیلنے شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ سرکاری حکام نے اس خبر کو پھیلنے سے روکا اور شکار گاہ میں یزید کو اس بات کی اطلاع کرائی۔ یزید شراب کے نشے میں بدمست تھا۔ یہ اطلاع سنتے ہی اپنے محل میں پہنچا اور عرب کے بادشاہ گر حلقوں نے اللہ اور رسول کے واضح احکامات کو پس پشت ڈالتے ہوئے مملکت اسلامی کا تاج باپ کی وصیت کے مطابق اس کے بدکردار بیٹے کے سر پر سجادیا۔

بادشاہ بننے کے بعد پہلی فرصت میں یزید کے دل میں حسین ابن علی کا وجود کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔ حسین ابن علیؑ اس کی بادشاہت کے لیے سب سے بڑا خطرہ تھے۔ عبدالرحمٰن ابن ابی بکرؓ، عبداللہ ابن عمرؓ اور عبداللہ ابن زبیرؓ نے بھی اس کی بیعت سے انکار ضرور کیا تھا لیکن یہ وہ افراد تھے جن سے بات کی جا سکتی تھی اور مسئلے کا کوئی حل نکالا جا سکتا تھا۔

یزید نے مدینے کے حاکم ولید بن عتبہ کو دوٹوک الفاظ میں لکھا کہ حسین ابن علی،

عبد الرحمٰن، عبد اللہ ابن عمر، عبد اللہ ابن زبیر سے میری بیعت طلب کرو۔ اگر یہ لوگ انکار کریں تو ان کے سر کاٹ کر میرے پاس بھیج دو۔

ولید کو یہ خط ملا تو اس نے مرکزی حکومت کے جاسوس اور اپنے مشیر مروان بن حکم سے اس بارے میں مشورہ طلب کیا۔ مروان بن حکم وہ شخص تھا جسے رسول اللہؐ نے مدینے بدر کر دیا تھا لیکن جب حضرت عثمان نے خلافت سنبھالی تو اسے واپس بلا کر اپنا مشیر خاص مقرر کر لیا۔ مروان بن حکم نے ولید سے کہا۔ ''یہ تینوں افراد بیعت کر لیں گے لیکن حسین سے تم اس کی توقع نہ کرنا۔ ان کے ساتھ تمہیں سختی کرنا ہوگی۔''

اس مشورے کے بعد ولید نے ایک غلام کو حکم دیا کہ جا کر حسین ابن علیؑ اور عبد اللہ ابن زبیر کو بلا لاؤ۔ یہ دونوں حضرات اس وقت مسجد نبویؐ میں بیٹھے تھے۔ ولید کے غلام سے انھوں نے کہا کہ تم چلو ہم آتے ہیں۔ بعد میں امام حسین علیہ السلام نے عبد اللہ کو بتایا کہ میں نے آج رات ایک خواب دیکھا ہے میرا خیال ہے شام میں معاویہ کا انتقال ہو گیا ہے اور ولید ہمیں یزید کی بیعت کے لیے طلب کر رہا ہے۔

یہ کہہ کر امام حسین علیہ السلام اپنے گھر گئے اور بنو ہاشم کے تیس جاں فروشوں کو اپنے ساتھ لے کر ولید کے محل میں پہنچے۔ آپ کے چھوٹے بھائی ابو الفضل عباسؑ آپ کے ساتھ تھے۔ امام حسین علیہ السلام نے ان بہادروں کو باہر ٹھہرنے کا حکم دیا اور خود اندر تشریف لے گئے۔

مروان بن حکم مدینے کے گورنر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ امام حسین علیہ السلام کو دیکھ کر وہ دونوں تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ ولید نے معاویہ کے انتقال کی خبر سنائی اور امام حسین سے یزید کی بیعت کا سوال کیا۔

"اس موضوع پر یوں تنہائی میں کوئی بات کہنا مناسب نہیں۔" امام حسین علیہ السلام نے پر سکون لہجے میں کہا۔ "تم مدینے کے اور لوگوں کو بھی بلالو۔ جب سب لوگ جمع ہو جائیں تو مجھے بھی بلالینا۔ اس وقت سب کے سامنے میں اپنی رائے کا اظہار کروں گا۔" یہ کہتے کہتے امام حسین علیہ السلام اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بہتر ہے۔ آپ کل ضرور تشریف لائیے گا۔" ولید بن عتبہ نے بھی احتراماً اٹھتے ہوئے کہا۔

لیکن ابھی وہ اپنی بات مکمل بھی نہ کر سکا تھا کہ مروان بن حکم بول پڑا۔ "ولید! اگر اس وقت حسین تیرے قبضے سے نکل گئے تو پھر کبھی تیرے ہاتھ نہیں آئیں گے۔ ان سے ابھی دوٹوک بات کرلے اور یہ بیعت سے انکار کریں تو ان کا سر تن سے جدا کردے۔"

مروان بن حکم کی بات سن کر امام حسین علیہ السلام کو جلال آگیا۔ "اچھا۔۔۔! تم میں سے کس کی ہمت ہے کہ مجھے ہاتھ لگا سکے؟ ہم آل محمدؐ ہیں۔ فرشتے ہمارے گھروں میں آتے ہیں۔ کسی کی مجال ہے جو ہمیں یزید جیسے فاسق و فاجر کی بیعت کرنے پر مجبور کرسکے!" امام حسین علیہ السلام نے گرجتے ہوئے کہا۔

حضرت عباسؑ بنی ہاشم کے بہادر جوانوں کے ساتھ باہر چوکنا اور مستعد کھڑے تھے۔ امام حسین علیہ السلام کی آواز گونجی تو ولید کا محل تلواروں کی جھنکار سے لرز اٹھا۔ بنی ہاشم کے جوان تلواریں سونتے محل میں داخل ہو گئے تھے۔ ادھر ولید کے غلاموں نے بھی تلواریں نکال لیں لیکن اس سے پہلے کہ ہنگامہ بڑھتا امام حسین علیہ السلام اپنے بہادروں کو سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ مروان بن حکم میں اب بولنے

کی ہمت ہی نہیں رہی تھی۔ وہ بنی ہاشم کی تلواریں دیکھ کر لرز گیا تھا۔

☆☆☆

ولید بن عتبہ نے سارا واقعہ یزید کو لکھ بھیجا۔ اس نے فوراً ہی جوابی خط لکھا اور اسے حکم دیا کہ اس خط کا جواب حسین ابن علی کے سر کے ساتھ آنا چاہیے۔ ولید نے یہ خط امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں جا کر انھیں دکھایا اور کہا کہ میں یزید کے اس حکم پر ہر گز عمل درآمد نہیں کر سکتا لیکن آپ کو خبر دار کرنا چاہتا ہوں کہ یزید ہر قیمت پر اپنی خواہش پوری کر کے رہے گا۔

امام حسین علیہ السلام نے اس کی باتوں کو غور سے سنا، حالات کا تجزیہ کیا دوستوں، رشتے داروں سے مشورہ کیا۔ پھر آپ اپنے ناناؐ کے روضے پر تشریف لے گئے۔ نانا کو یاد کر کے آپ کی آنکھیں بھر آئیں۔ گھر آ کر رات میں کسی وقت آنکھ لگی تو رسول اللہ کو خواب میں دیکھا جو انھیں بچپن کا وعدہ یاد دلا رہے تھے اور آنے والے دنوں کی سختی اور تکالیف بتاتے بتاتے روتے جا رہے تھے۔

امام حسین علیہ السلام کی آنکھ کھل گئی آپ نے اپنے عزیزوں کو جمع کیا اور انھیں بتایا کہ اب مدینہ چھوڑنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس فیصلے کے بعد آپ اپنے نانا رسول اللہؐ کے روضے پر دوبارہ تشریف لے گئے۔ نانا کی یاد میں آنسو بہاتے بہاتے آپ اپنے بھائی حسنؑ کی قبر پر پہنچے۔ آخر میں مظلوم ماں کی قبر مبارک پر جا کر آپ نے اپنی ماں سے اجازت طلب کی۔ ماں کی قبر پر پہنچ کر آپ کی حالت غیر ہو گئی اور آپ نے چشم تصور میں اپنی ماں سے کہا۔ ''اماں! بچپن میں جو وعدہ کیا تھا اسے نبھانے کا وقت آ گیا ہے۔''

"اماں! جس وقت کو یاد کر کے آپ میری ولادت کے دن سے لے کر اپنی آخری سانس تک آنسو بہاتی رہیں وہ وقت آگیا ہے۔"

"اب نہ آپؑ ہیں نہ باباؑ کا سایہ میرے سر پر ہے۔ نانا رسول اللہؐ بھی اس دنیا سے جا چکے۔ بھائی حسنؑ زہر کے ذریعے شہید کر دیے گئے۔ اب میں آپ سب کی قبروں کو چھوڑ کر مدینے سے جا رہا ہوں۔"

"اماں! اگر میں نہ گیا تو نانا رسول اللہؐ کی قربانیاں ضائع ہو جائیں گی۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروںؑ کی محنتوں پر پانی پھر جائے گا۔ میرے بابا کا مسجد میں بہنے والا پاک لہو رائیگاں ہو جائے گا۔ آپ کے فرزند حسنؑ کی اذیتوں کا ثمر دین اسلام کو نہیں ملے گا۔"

اماں! "اگر میں نہ گیا تو اسلام کی حقیقی تعلیمات مٹ جائیں گی اور اسلام کے نام پر ایک مسخ شدہ مذہب مسلمانوں میں رائج کر دیا جائے گا۔"

☆☆☆

بہت سے مورخین نے لکھا ہے کہ امام حسین علیہ السلام خوف کے عالم میں مدینے سے نکلے لیکن امام حسینؑ کی شخصیت سے خوف کے تصور کو بھی وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ امام وقت اور کائینات پر حکمرانی کرنے والے کو کس بات کا خوف ہو سکتا ہے!

مدینے سے نکلنے کا واقعہ اچانک پیش نہیں آیا تھا۔ یہ واقعہ انھوں نے ماں کی لوریوں میں سنا تھا۔ ناناؐ کے بوسوں میں محسوس کیا تھا اور باپ کے آنسوؤں میں دیکھا تھا۔ اب مدینے سے نکلتے وقت وہ کس طرح خوف زدہ ہو سکتے تھے!

مدینے سے آپ کا نکلنا خوف کی وجہ سے نہیں تھا، آپ ایک طے شدہ حکمت عملی کے مطابق مدینے سے نکل رہے تھے۔ حسین علیہ السلام کی سیاست، فروخت شدہ

موَرخوں اور بچے ہوئے تجزیہ نگاروں کی فکر سے ماورا تھی۔

امام حسین علیہ السلام اس وقت خود اپنی اور اپنے بہادر ساتھیوں کی زندگی کی حفاظت کر رہے تھے۔ آپ جانتے تھے کہ موت ہی نہیں اگر زندگی کو احتیاط اور سمجھ داری کے ساتھ خرچ کیا جائے تو اکثر زندگی بھی شہادت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

اس وقت امام حسین علیہ السلام مدینے سے نہ نکلتے تو یزید اپنے گورنر ولید بن عتبہ کو معطل کر کے کسی سخت گیر حاکم کو مدینے بھیج دیتا اور اس کے فوجی دستے امام حسین علیہ السلام اور ان کے مٹھی بھر ساتھیوں کو اس چھوٹے سے دور افتادہ شہر میں موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ بعد میں عالم اسلام میں یہ خبر اڑا دی جاتی کہ حسین ابن علیؑ نے حاکم شام کی موت کی خبر سن کر حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے دار الامارہ پر حملہ کر دیا تھا اور جوابی کارروائی میں وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

بنوامیہ کی خفیہ سازشوں سے امام حسین سے زیادہ کون واقف ہو سکتا تھا۔ آپ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی قربانیوں کو تاریخ کے دھندلکوں کے حوالے نہیں کر سکتے تھے۔ یزید کے گورنر نے تنہائی میں ان سے بیعت کا سوال کیا تھا لیکن امام حسین علیہ السلام اس کا جواب ساری دنیا کے سامنے دینا چاہتے تھے۔ ایک ایسا جواب جسے سن کر ہر عہد کے یزیدوں کے چہرے بے نقاب ہوتے رہیں اور آیندہ کسی زمانے کے کسی بھی یزید کو آلِ محمدؐ سے بیعت کا سوال کرنے کی ہمت ہی باقی نہ رہے۔

امام حسین علیہ السلام شہیدوں کی پاکیزہ زندگیوں کو بچانے کے لیے مدینے سے نکل رہے تھے۔ یہ زندگیاں ایک خاص وقت اور مقام پر اللہ رب العالمین کی بارگاہ میں پیش کی جانا تھیں۔ اس وقت ان بیش بہا زندگیوں کی حفاظت ضروری تھی کہ اللہ کے

وجود کی شہادت دینے والوں کا قافلہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ ابھی تو بہت سے شہیدوں کو اس قافلے میں شامل ہونا تھا۔

☆☆☆

امام حسین علیہ السلام نے مستقبل کی حکمت عملی ترتیب دی اور ایک رات تمام ساتھیوں کے ساتھ مدینے سے نکل کھڑے ہوئے۔ آپؑ کا ارادہ تھا کہ عام مسلمانوں کو خواب غفلت سے ہوشیار کیا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ دین اسلام کے خلاف کس طرح کی سازشیں کی جارہی ہیں اور مستقبل میں اس کے کیا نتائج رونما ہوں گے۔ اسی لیے آپؑ سیدھے مکہ معظمہ پہنچے جہاں چندماہ بعد حج کا اجتماع ہونا تھا۔

اس سفر شہادت میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا ایک ایک قدم نپا تلا اور ایک ایک فیصلہ سوچا سمجھا تھا۔ وہ جس سفر پر جارہے تھے اس کے ممکنہ انجام سے اچھی طرح واقف تھے۔ جو واقعات آنے والے دنوں میں پیش آنا تھے ان کے بارے میں وہ بچپن سے سنتے آرہے تھے۔ اپنی گردن پر نانا جان کے بوسوں کی گرمی انہیں آج بھی اسی طرح محسوس ہوتی تھی اور آپؑ اس گرمی میں چھپے ہوئے پیغام کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ماں کی آنکھوں سے مستقل بہنے والے آنسوؤں کو وہ کس طرح بھول سکتے تھے۔ اماں جان انہیں کھانا کھلانے کے بعد جب، پانی کا کٹورا ان کے منہ سے لگاتیں تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلکنے لگتیں اور وہ انہیں سینے سے چمٹا کر زار و قطار رونے لگتیں۔ اپنے باپ کو انھوں نے کبھی سب کے سامنے اس طرح روتے تو نہیں دیکھا تھا لیکن اکثر جب وہ دن بھر کے تھکے ہارے گھر لوٹتے تو آتے ہی انہیں سینے سے لگا کر پیار کرتے۔ پھر جانے کیا ہوتا کہ بابا کے چہرے کی مسکراہٹ کہیں گم ہو جاتی، ان کی آنکھوں

میں سرخ سرخ ڈورے سے تیرنے لگتے اور وہ منہ پھیر کر سیدھے اپنے حجرۂ عبادت میں چلے جایا کرتے۔

یہ ساری باتیں، یہ ساری یادیں آج بھی امام حسین علیہ السلام کے ذہن میں تازہ تھیں اور آنے والے دنوں کے لیے انھیں نیا حوصلہ اور نیا اعتماد دیتی رہتی تھیں۔ امام حسین علیہ السلام تقدیر کے لکھے سے واقف تھے لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ تقدیر کا لکھا انسانی کوششوں اور عمل سے تبدیل بھی ہوتا رہتا ہے۔ آپؑ موت سے خوفزدہ نہیں تھے اور نہ اس سے بچنا چاہتے تھے کہ ان کی ساری زندگی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے لڑتے ہوئے گزری تھی۔ نیزوں کے جنگل، تیروں کی بارش، ڈھالوں کی گھٹاؤں اور تلواروں کی مجلیوں میں زندہ رہنا انھوں نے اپنے باباہی کی زندگی میں سیکھ لیا تھا۔! آپ مدینے سے اپنی جان کو اللہ کی راہ میں اس طرح قربان کرنے کے لیے نکلے تھے کہ ان کی موت بھی ان کی زندگی کی طرح اللہ کے ہونے کی گواہی، اور دین اسلام کی سچائی کی دلیل بن جائے۔

☆☆☆

حضرت امام حسینؑ نے حج سے دو روز پہلے یزیدی منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے مکے سے حج کیے بغیر نکل جانے کا انقلابی فیصلہ کیا تھا۔ یہ بڑا اچانک اور حیران کن فیصلہ تھا۔ اس فیصلے کے بہت سے اثرات مرتب ہو سکتے تھے۔ ساری دنیا کے مسلمان جانتے تھے کہ نواسۂ رسولؐ ہر سال مدینے سے حج کرنے کے لیے مکے آیا کرتے تھے اور اب چار مہینے مکے میں رہنے کے باوجود رسولؐ کا نواسہؑ آٹھ ذی الحجہ کو حج کیے بغیر مکہ معظّمہ کی سرزمین سے دور کیوں جارہا ہے!

مسلمانوں کے لیے یہ ایک حیران کن خبر ہونا چاہیے تھی لیکن جب لوگ چھوٹی چھوٹی برائیوں کے عادی ہو جاتے ہیں تو شیطان آہستہ آہستہ انہیں بے حسی اور بے عملی کا بھی عادی بنا دیتا ہے۔ پھر بڑی سے بڑی خبر، بڑے سے بڑا حادثہ بھی انہیں حیران نہیں کرتا اسی لیے جب آٹھ ذی الحجہ کو امام حسینؑ مکہ معظّمہ سے نکلے تو آپؑ کے ساتھ صرف بیاسی آدمی تھے اور ان میں اکثریت انھی ساتھیوں کی تھی جو مدینے سے آپؑ کے ساتھ چلے تھے۔

ان میں بھی سب سے زیادہ تعداد خاندان رسالتؐ کے افراد کی تھی۔ نبیؐ کے نواسے حسنؑ ابن علیؑ کے بیٹے، قاسم، عبداللہ، ابوبکر اور احمد۔ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے صاحبزادے حضرت عباسؑ، جعفر، عبداللہ، عبداللہ اصغر، عمر، عثمان۔ حضرت عباسؑ کے دو بیٹے فضل اور قاسم۔ رسول کریمؐ کے چچازاد بھائی عقیل ابنِ ابی طالبؑ کے بیٹے جعفر بن عقیل، عبدالرحمٰن بن عقیل، علی بن عقیل جناب عقیل کی اولاد سے محمد، جعفر اور احمد۔ حضرت مسلم بن عقیلؑ اور ان کے دو بیٹے محمد اور ابراہیم پہلے ہی کوفے جا چکے تھے۔ رسول اکرمؐ کے دوسرے چچازاد بھائی جناب جعفر طیارؓ کے بیٹے جناب عبداللہ اور رسولؐ کی نواسی زینبؑ بنت علیؑ کے بیٹے عونؑ اور محمدؑ۔ رسولؐ کے نواسے حسین ابن علیؑ کے اپنے صاحبزادے علی ابن الحسینؑ، جناب علی اکبرؑ اور علی اصغر۔

خاندان رسالتؐ کے یہ تمام افراد امامت کے چاند کے ارد گرد درخشاں ستاروں کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ امام حسین علیہ السلام کے دوست اور ساتھیوں کے چہرے بھی علم، عمل اور ایمان کی روشنی سے ستاروں کی ہی طرح روشن و تابندہ دکھائی دیتے تھے۔

گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار یہ قافلہ مکہ معظّمہ سے نکل کر کوفے کی طرف بڑھ رہا

تھا۔ اونٹوں پر عماریاں تھیں جن میں خاندان رسالت کی محترم خواتین سوار تھیں۔ بنی ہاشم کے جوان ننگی تلواریں ہاتھوں میں لیے اپنے گھوڑوں پر سوار تھے۔ انہوں نے ان عماریوں کے گرد حفاظتی حصار بنا رکھا تھا۔ اس حصار سے آگے حضرت امام حسین علیہ السلام کے بہادر، نڈر اور اسلام کے سچے شیدائیوں کا حلقہ تھا جو خوشی خوشی اپنی قتل گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایسی قتل گاہ جہاں سے دین اسلام کو قیامت تک کے لیے حیات نو اور انسانیت کو تازہ زندگی ملنا تھی۔

☆☆☆

قافلہ حسینیؑ تیزی سے کوفے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ صحرائی راستے میں مختلف فاصلوں پر مسافروں کے ٹھہرنے اور تازہ دم ہونے کے لیے چھوٹے چھوٹے نخلستان تھے۔ انہیں "منزلیں" کہا جاتا تھا۔ ان منزلوں کے مختلف نام تھے۔ امام حسینؑ منزل صفاح پر پہنچے تو فرزدق نامی شاعر سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا کہ میں کوفے ہی سے آرہا ہوں۔ شاید لوگوں کے دل آپؑ کے ساتھ ہوں مگر تلواریں بہر حال یزید کے ساتھ ہیں۔ منزل حاجز پر عبداللہ ابن مطیع ملے۔ انہوں نے بھی یہی کہا۔ اسی جگہ زہیر ابن القین کا خیمہ لگا ہوا تھا۔ زہیر ابن القین اسی جگہ سے قافلہ حسینیؑ میں شامل ہوئے۔

یہ قافلہ ایک دن منزل زبالہ پر پہنچا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ نارنجی رنگ کا سورج گرد و غبار کے مٹیالے کفن میں لپٹا مغرب میں اتر رہا تھا۔ کوفے کی جانب سے چند گھڑ سوار ادھر آتے دکھائی دیے۔ ان سواروں نے امام حسین علیہ السلام کو حضرت مسلم بن عقیلؑ ان کے دونوں بیٹوں محمد و ابراہیم، ہانی ابن عروہ، محمد ابن کثیر اور عبداللہ یقطر جیسے جانثاروں کی شہادت کی خبر سنائی۔

امام حسین علیہ السلام کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ مسلم بن عقیلؑ ان کے چچازاد بھائی بھی تھے، بہنوئی بھی اور اپنی جان فدا کرنے والے ساتھی بھی۔ مسلم بن عقیلؑ کی شادی امیر المومنین علیہ السلام کی ایک صاحبزادی بی بی رقیہ سے ہوئی تھی اور مسلم بن عقیلؑ کی ایک بہن حضرت ابوالفضل العباسؑ کی شریک حیات تھیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے آگے بڑھ کر اپنے چھوٹے بھائی کو گلے لگالیا۔

دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر رونے لگے۔ آخر دونوں بھائیوں نے اپنے آنسو پونچھے۔ خیمے میں جاکر آپؑ نے مسلم بن عقیل کی دونوں بیٹیوں کو اپنے پاس بلایا۔ اس اچانک بلاوے پر بچیاں ڈر سی گئیں۔ امامؑ نے دونوں کم سن بچیوں کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور رونے لگے۔ بچیاں حیرانی سے انھیں دیکھ رہی تھیں۔ آپؑ نے دونوں بھانجیوں کے کانوں میں سونے کی بالیاں پہنائیں۔ بچیوں کے دل انجانے خوف سے دہل گئے۔ وہ معاملے کو کچھ کچھ سمجھ گئی تھیں۔ "ماموں جان! آپ تو ہمیں اس طرح سے بالیاں پہنا رہے ہیں، جیسے یتیم ہونے والی لڑکیوں کے کانوں میں بندے پہنائے جاتے ہیں!" ایک بچی نے روتے روتے کہا۔

"ہاں بیٹا! تمہارا باپ اللہ کی راہ میں شہید ہو گیا ہے۔" امام حسین علیہ السلام کی آواز لرز رہی تھی۔ دونوں بچیوں کو ان کے چھوٹے ماموں عباسؑ نے سینے سے چمٹالیا اور امام آنسو پونچھتے ہوئے خیمے سے باہر نکل گئے۔

اسی رات آپؑ نے تمام ساتھیوں اور رشتے داروں کے سامنے تقریر کی۔ مستقبل میں کیا ہونا تھا، وہ اب سب پر واضح ہوتا جارہا تھا۔ اس رات امام حسینؑ نے فرمایا۔

"تم سب لوگ اچھی طرح سمجھ لو کہ اب میرا قتل ہونا یقینی ہے۔ میں تم سب

رے وعدو ور پ بیعت سے ر د ، ۔ ر جدھر. پ ہے دھر
نکل جاؤاور اپنی جان بچاؤ۔"

یہ سن کر مکہ معظّمہ سے قافلہ حسینیؑ میں شامل ہونے والے کئی دنیادار افراد، رات کے اندھیرے میں ادھر ادھر نکل گئے۔ اب آپؑ کے ساتھ صرف آپؑ کے رشتے دار اور باوفا صحابی تھے اور ان کی تعداد ستر کے قریب تھی۔ امام حسینؑ چاہتے بھی یہی تھے کہ دشمن سے مقابلے کے وقت کوئی نمائشی مسلمان اور کمزور دل انسان ان کے ساتھ نہ ہو۔ آپؑ جانتے تھے کہ موت کو سامنے دیکھ کر بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ آپ عام مسلمانوں کی دین سے محبت سے بھی واقف تھے کہ دین ایسے لوگوں کی زبانوں تک ہی رہتا ہے وہ بھی اس وقت تک کہ انہیں دین سے فائدہ مل رہا ہو اور انہیں اپنی دنیا کے لیے کوئی خطرہ محسوس نہ ہو۔ جب آزمائش کا وقت آتا ہے تو دین کا ساتھ دینے والے سچے مسلمان کم ہی رہ جاتے ہیں۔

اس وقت دنیا میں لاکھوں مسلمان موجود تھے لیکن دین کو بچانے کے لیے اپنی جان قربان کرنے والے افراد کی تعداد سو سے بھی کم تھی۔ آہنی ارادوں والے یہ بے مثال افراد اس وقت منزل زبالہ میں امام حسینؑ کے خیمے میں ایک جگہ جمع تھے!

☆☆☆

اگلے دن دوبارہ سفر کا آغاز ہوا اور یہ قافلہ قصر بنی مقاتل نامی منزل پر ٹھہرا۔ یہاں عبداللہ ابن حر جعفی کا خیمہ پہلے سے لگا ہوا تھا۔ یہ شخص کوفے کے خوشحال لوگوں میں سے تھا اور خود کو اہل بیتؑ کا چاہنے والا کہتا تھا۔ امام حسینؑ نے اسے دعوت دی کہ تم اس وقت میرا ساتھ دو۔ اسلام کو بچانے کے لیے تمہاری قربانی کے بدلے میں اللہ

تمہیں جنت میں جگہ دے گا۔

عبداللہ، امام حسینؑ کو اپنے سامنے دیکھ کر سٹپٹا گیا۔ وہ تو کوفے سے بھاگا ہی اس لیے تھا کہ اس نے امام حسینؑ کے وہاں آنے کی خبر سن لی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ امام وقتؑ سے اس کا سامنا نہ ہو جائے کیونکہ جب امامؑ مدد کے لیے طلب کریں گے تو اسے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا پڑے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگ اسے شیعیان علیؑ میں سے بھی سمجھتے رہیں اور وہ حکومت وقت سے فائدے بھی اٹھاتا رہے۔ اسی لیے وہ کوفے سے نکل کر یہاں صحرا میں آ گیا تھا تاکہ امام حسینؑ سے اس کا سامنا ہی نہ ہو۔ بعد میں جنگ کے نتیجے میں اگر امام حسینؑ جیت جائیں تو وہ اس نئی حکومت سے بھی فائدے حاصل کرتا رہے اور اگر ابن زیاد جیت جائے تو اس کے سامنے بھی وہ اسی طرح سرخ رو رہے۔

امام حسینؑ کی بات سن کر اس نے کہا۔ "مولا! میں نے کوفے میں کسی شخص کو آپ کا ہمدرد نہیں دیکھا اس لیے آپ کوفے نہ جائیں۔ میں آپ کو اپنا تیز رفتار گھوڑا پیش کرتا ہوں۔ آپ یہاں سے بہت دور کہیں چلے جائیں اور اپنی جان بچائیں۔ بعد میں آپ کے بال بچوں کو محفوظ مقام تک پہنچانا میری ذمے داری ہے۔"

امام حسینؑ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور آپ نے کہا۔ "جو شخص اللہ کی راہ میں اپنی جان دینے پر تیار نہیں اس کا گھوڑا لے کر میں کیا کروں گا لیکن تمہیں ایک نصیحت کر رہا ہوں۔ وہ یہ کہ تم جتنی جلد ممکن ہو یہاں سے اس قدر دور چلے جاؤ جہاں سے تمہیں میری صدائے استغاثہ سنائی نہ دے۔ کیونکہ جب میں اس صحرا میں آخری مرتبہ مدد کے لیے آواز بلند کروں گا تو جو شخص اس آواز کو سننے کے باوجود میری مدد کو نہ آیا تو اس کا ٹھکانہ یقینی طور پر جہنم ہو گا۔"

اپنی ماں جیسی بہن حضرت زینبؓ کے قریب آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے۔ خواب میں نبی اکرمؐ تشریف لائے۔ آپؐ اپنے نواسے کو اپنے پاس بلا رہے تھے۔ امام حسینؑ جاگے تو آپؓ کے رخسار آنسوؤں سے تر بہ تر تھے۔

اگلے روز قافلہ حسینیؓ منزل قطقطانیہ اور پھر قبیلہ بنی سکون کے علاقے میں پہنچا۔ یہاں سے حکومت کے جاسوسوں نے کوفے کے گورنر کو اس کی اطلاع پہنچائی۔ ابن زیاد نے حر ابن یزید ریاحی کو دو ہزار فوجیوں کے دستے کے ساتھ امام حسینؓ کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ کیا۔

اسی دوران راستے میں قافلہ حسینیؓ کو بنی عکرمہ کے قبیلے کا ایک شخص ملا۔ اس نے بتایا کہ وہ جن راستوں سے یہاں پہنچا ہے وہ سارے راستے یزیدی لشکروں سے پٹے پڑے ہیں۔ اس دن امام علیہ السلام منزل شراف پر ٹھہرے۔ محرم الحرام کا چاند اسی جگہ آپؓ نے دیکھا اور اگلے دن دوبارہ سفر شروع کر دیا۔

راستے میں حر ابن یزید ریاحی کا فوجی دستہ آپؓ کے سامنے آگیا۔ ان فوجیوں کا پانی ختم ہو چکا تھا۔ امام حسینؑ نے اپنے پانی کے ذخیرے سے یزیدی فوجیوں اور ان کی سواری کے جانوروں کو سیراب کیا۔ امام حسینؑ کا قافلہ آگے بڑھتا رہا۔ حر کا لشکر ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ ایک دن راہ چلتے چلتے امام حسینؑ کے گھوڑے نے اچانک اپنے قدم روک دیے اور کسی طرح آگے بڑھنے کو تیار نہ ہوا۔ آخر امام حسین علیہ السلام نے لوگوں سے پوچھا۔ ”یہ کون سی جگہ ہے؟“

کسی نے جواب دیا۔ ”اس جگہ کو کربلا کہتے ہیں۔“

یہ سن کر آپؑ نے رکابوں سے پاؤں نکالے اور گھوڑے سے اتر گئے۔ پھر آپؑ نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”تمام سامان اتارو اور یہاں خیمے لگاؤ۔“ اس دن محرم الحرام کی دوسری تاریخ اور جمعرات کا دن تھا۔

☆☆☆

ساتویں محرم سے یزیدی فوج نے قافلہ حسینیؑ پر پانی بند کر دیا۔ بوڑھے، جوان، بچے، عورتیں پیاس سے بے تاب ہونے لگے کیونکہ سارا دن آگ برساتا سورج صحرا کی ریت کو گرم کرتا رہتا تھا۔ حبس، گھٹن اور شدید گرمی نے پیاس کو ناقابل برداشت کر دیا تھا۔ یزیدی لشکر کے گھوڑے، خچر اور گدھے بلا روک ٹوک پانی پی رہے تھے مگر رسول اسلام کا خاندان پیاس کی وجہ سے مرنے کے قریب ہو رہا تھا۔ پانی روکنے والے خود کو مسلمان کہتے تھے۔ وہ محمدؐ کا کلمہ پڑھتے تھے لیکن وہ دراصل دنیا کے کتے اور یزید کے پالتو جانور تھے۔

وہ نہر فرات کے کنارے کھڑے ہو کر پانی کے کٹورے بجاتے، پانی سے بھری مشکیں زمین پر بہاتے اور چیخ چیخ کر رسولؐ کے نواسے اور ان کے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہتے کہ زندگی چاہتے ہو تو یزید کی بیعت کر لو۔ پانی تمہارے لیے حاضر ہے۔ شرط صرف اتنی ہے کہ یزید کو اپنا خلیفہ تسلیم کر لو۔ دنیا کی ساری نعمتیں تمہیں مل جائیں گی۔

پیاس کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے بچوں کی چیخ و پکار ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ اسی لیے سات محرم سے صبح عاشور تک حضرت ابوالفضل عباسؑ نے کئی مرتبہ مختلف جگہوں پر کنویں کھودے مگر ان سے پانی نہیں نکلا۔ کسی کنویں سے پانی نکلا تو لشکر یزید نے حملہ کر کے اس کنویں کو بند کر دیا۔

سعد سے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپ کوشش کرتے رہے کہ جنگ کی نوبت نہ آئے۔
مسلمانوں کا خون نہ بہے۔ عمر ابن سعد بھی نواسہ رسولؐ کو قتل کرنے کے عظیم گناہ سے
خوف زدہ تھا۔ وہ امام حسین علیہ السلام سے ہونے والے مذاکرات کی رپورٹ روزانہ
کوفے روانہ کرتا رہا تھا لیکن نو محرم کو مغرب سے ذرا پہلے شمر ذی الجوشن تازہ دم
فوجیوں کے دستے لے کر کربلا پہنچا۔ اس کے پاس کوفے کے گورنر ابن زیاد کا حکم نامہ
موجود تھا کہ اگر عمر ابن سعد حسینؑ کو قتل کرنے میں مزید تاخیر کرے تو شمر ذی الجوشن
اسے معزول کر کے خود یزیدی افواج کی کمان سنبھال لے اور حسینؑ اور ان کے
ساتھیوں کو قتل کر کے ان کے گھر والوں کو قیدی بنا کر کوفے لے آئے۔

شمر کے ساتھ آنے والے گھڑ سوار غرور و تکبر کے ساتھ اپنے گھوڑوں کو
میدان میں ادھر سے ادھر دوڑاتے پھر رہے تھے۔ ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے کربلا کی
زمین لرز رہی تھی۔ خیمہ حسینی میں چھوٹے چھوٹے بچے سہم سہم کر اپنی ماؤں سے لپٹے
جا رہے تھے۔

امام حسین علیہ السلام نے آنے والے فوجیوں کا یہ جوش و خروش دیکھا تو آپ
نے اپنے لشکر کے علم دار ابو الفضل العباسؑ اور چند دوسرے ساتھیوں کو شمر ذی الجوشن
اور عمر ابن سعد کے پاس بھیجا تا کہ فوری جنگ کے امکانات کو روکا جا سکے۔

اس وقت رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ امام حسین علیہ السلام رات کی تاریکی میں
نہیں دن کے اجالے میں جنگ لڑنا چاہتے تھے۔ آپ جانتے تھے کہ لشکر یزید نے رات
کی تاریکی میں حملہ کیا تو رسول اللہؐ کے گھر کو آگ لگانے والوں، شہیدوں کے قاتلوں

اور رسولؐ کی نواسیوںؑ کے سروں سے چادریں چھننے والے یزیدی درندوں کے چہرے رات کی تاریکی کی وجہ سے دنیا کی نظروں سے ہمیشہ کے لیے چھپے رہیں گے۔ آنے والے وقتوں میں ہر ظالم خود کو معصوم ثابت کرنے کی کوشش کرے اور یہ کہے گا کہ رسولؐ کی نواسی کے سر سے چادر چھیننے کا گناہ میں نے نہیں کیا۔ یہ کام کسی اور نے کیا ہوگا۔ رسولؐ کا نواسہؑ میری تلوار سے زخمی نہیں ہوا، وہ کوئی اور شخص ہوگا جن نے یہ ظلم کیا۔ میں اس گناہ کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

بنوامیہ کی پروپیگنڈا مشینری اور ان کے "میڈیا منیجر" میڈیا کی جنگ کے ماہر تھے۔ وہ اپنے جھوٹ کے ذریعے رات کو دن اور دن کو رات بنانا جانتے تھے۔ رسول اکرمؐ کے زمانے سے لے کر اب تک وہ حق کے نمائندوں کو میدان جنگ میں تو کبھی شکست نہیں دے سکے تھے لیکن اپنے بے پناہ جھوٹ، پروپیگنڈے، خفیہ سازشوں اور مسلمانوں کی بے خبری کے ذریعے وہ میڈیا کی جنگ جیتنے میں کامیاب ہوتے رہے تھے۔

کربلا کے میدان میں امام حسینؑ ان کی تمام سازشوں، جھوٹ اور مکر و فریب کے ایک ایک جال کو توڑ دینا چاہتے تھے۔ آپؑ یزیدی کمانڈروں کو کوئی ایسا بہانہ اور موقع نہیں دینا چاہتے تھے جس کے ذریعے مستقبل میں یہ سازشی خاندان ان کی عظیم قربانیوں کو چھپانے اور دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں کامیاب ہو سکے۔

اسی لیے انھوں نے ایک رات کی مہلت طلب کی۔ شمر ذی الجوشن ایک لمحے کی بھی تاخیر کرنے کو تیار نہیں تھا لیکن کئی فوجی سرداروں نے اسے سمجھایا کہ حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کو ایک رات کی مہلت دینے میں کوئی حرج نہیں۔ چند گھنٹوں کی تو بات ہے۔ ہماری فوجوں نے انھیں ہر طرف سے گھیر رکھا ہے یہ ہم سے بچ کر کہاں جا سکتے

ہیں۔اس طرح رات میں ہونے والی جنگ ٹل گئی۔

شب عاشور کے ان لمحوں میں جب ابتدائی تاریخوں کا زرد چاند مغرب میں اتر تا جارہا تھا اس وقت صحرائے کربلا دو مختلف مناظر پیش کررہا تھا۔ ایک طرف اللہ کے عبادت گزار بندوں کا ایک چھوٹا سا گروہ تھا، جو نماز، تلاوت قرآن اور مناجات میں مصروف تھا اور دوسری طرف یزیدی درندے تھے جو رسولؐ کے نواسےؓ کو قتل کرنے کے لیے صبح ہونے کا بے چینی سے انتظار کررہے تھے۔

لہو کی موجیں

شہیدوں کے خون کی موجیں فرعون کو اس کے لاؤ لشکر سمیت ہمیشہ کے لئے غرق کرنے کو بے چین تھیں۔ لیکن اس نئے فرعون کو دریائے نیل میں نہیں نہر فرات میں ڈوب کر فنا ہونا تھا۔

باب۔ ۵

ابتدائی تاریخوں کا چاند کافی دیر تک آسمان پر روشن رہنے کے بعد اب مغربی افق میں نیچے اتر چکا تھا۔ اس وقت ہر طرف گہرا اندھیرا تھا۔ دریا کے کناروں کے ساتھ ساتھ دور تک مشعلیں روشن تھیں۔ سارا میدان خیموں' اونٹوں' گھوڑوں اور جنگ جو سپاہیوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ سپاہی اگلے دن رونما ہونے والی جنگ میں حصہ لینے کو بے چین تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کی جیت یقینی ہے۔ سو پچاس آدمی تیس ہزار کے لشکر سے کس طرح جیت سکتے تھے! فتح و کامرانی کے اس نشے میں سرشار زیادہ تر فوجی اس وقت خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ ہر طرف گہرا سناٹا طاری تھا۔ کبھی کبھار کوئی گھوڑا ہنہناتا یا کوئی اونٹ بلبلانے لگتا تو سناٹا ٹوٹ جاتا اور اگلے لمحے خاموشی کی دبیز چادر دوبارہ سارے ماحول پر چھا جاتی۔

رات کے اس اندھیرے اور گہرے سناٹے میں دریا سے دور لگے ہوئے خیموں میں دن نکلا ہوا تھا۔ وہاں کسی کی آنکھوں میں نیند کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ بچے بھوک اور پیاس کی شدت کی وجہ سے جاگ رہے تھے، خواتین اللہ کی راہ میں پیش کرنے کے

لئے اپنی اپنی قربانیوں کو سجا سنوار رہی تھیں۔ نو عمر بچے، نوجوان اور بوڑھے نماز شب سے فارغ ہو کر اپنے اپنے اسلحے کا معائنہ کر رہے تھے۔ کوئی اپنی تلوار کو پتھر پر گھس کر تیز کرتا، پھر اسے ہاتھ میں تھام کر ہوا میں لہراتا۔ کوئی اپنے نیزے کی نوک کو اپنی انگلیوں سے چھو کر اس کی تیزی کا اندازہ لگاتا اور کوئی اپنے تیروں کو چن چن کر اپنے ترکش میں سلیقے سے جماتا جا رہا تھا۔

یہ افراد نہ تیس ہزار کے لشکر سے خوفزدہ تھے نہ موت کے تصور سے خائف۔ نیند ان کی آنکھوں سے اس لئے دور تھی کہ ان سے وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ وہ بے چین تھے کہ کب صبح ہو اور کب وہ اپنی جانیں اپنے امامؑ کے حکم کے مطابق اللہ کی راہ میں قربان کریں۔ دین اسلام کو بچانے کے لئے اس کے علاوہ اب کوئی دوسرا راستہ باقی بھی نہیں بچا تھا۔

باہر کے ماحول میں تاریکی اور سناٹا تھا لیکن اصحاب حسینؑ کے خیموں میں ایمان کی روشنی اور زندگی کی رونق نظر آ رہی تھی۔ ایسے میں خیمے کا پردہ ہٹا۔ امام حسین علیہ السلام اپنے چھوٹے بھائی عباسؑ اور اپنے بیٹے علی اکبرؑ کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ خاندان کے دوسرے افراد بھی آپ کے ساتھ موجود تھے۔ اصحاب حسینؑ ادب و احترام کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ امام حسین علیہ السلام اسلحے کے ایک چوبی صندوق سے ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ گئے۔ پھر آپؑ نے اپنے ایک صحابی کو حکم دیا کہ دوسرے خیموں میں موجود باقی دوستوں کو بھی یہیں بلا لیا جائے۔

دراصل یہ خیمہ سب سے بڑا خیمہ تھا اس لیے امام حسین علیہ السلام نے اسے

حکمت عملی کو آخری شکل دینے کے لیے منتخب کیا تھا۔ ذرا ہی دیر میں سارا خیمہ بھر گیا۔ ہر مجاہد مسلح ہو کر امامؑ کی خدمت میں آیا تھا کہ ممکن ہے امام علیہ السلام اسے کسی خدمت کے لیے جانے کا حکم دیں تو اسے جانے میں دیر نہ لگے۔ ہر شخص اپنی جگہ مسلح، مستعد، ہوشیار اور اپنے سردار کے اشارے کا منتظر تھا۔

اس وقت اس خیمے میں کوفے سے آنے والے اصحاب بڑی تعداد میں موجود تھے۔ ان میں سے چوبیس افراد دین اسلام اور نواسۂ رسولؐ کی محبت سے سرشار ہو کر راستے کی تمام رکاوٹوں کو کسی نہ کسی طرح عبور کر کے کربلا پہنچنے سے پہلے ہی امام علیہ السلام کے قافلے میں شامل ہو گئے تھے۔ کوفے کے نو آدمی ایسے تھے جنھوں نے خود کو امام حسین علیہ السلام تک پہنچنے کی یہ ترکیب نکالی کہ وہ کوفے سے آنے والے فوجی دستوں میں شامل ہو گئے اور کربلا پہنچ کر عمر سعد کی فوج سے نکل کر خیام حسینیؑ میں پہنچ گئے تھے۔ اس خیمے میں یمن، بصرہ اور مدینے کے جاںنثاروں کے علاوہ بتیس آدمی ایسے بھی تھے جو پہلے یزیدی فوج کے ساتھ تھے لیکن جب انھیں حقیقت حال معلوم ہوئی تو شب عاشور میں وہ یزیدی لشکر سے نکل کر حسینیؑ فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ جناب حرؑ، ان کے بھائی، بیٹا اور غلام جو صبح عاشور امام حسینؑ کی خدمت میں آئے تھے۔ ان اصحاب کے علاوہ تھے۔

☆☆☆

رات کا آخری پہر گزر رہا تھا۔ دریائے فرات کے کنارے کنارے دور تک پھیلی ہوئی فوج کے پڑاؤ میں تیس ہزار لڑاکا فوجیوں میں سے زیادہ تر افراد موت کی سی نیند میں مدہوش تھے۔ اس وقت قافلہ حسینیؑ میں موجود انسانوں کے سوا سارے ہی انسان

غفلت اور موت کی سی نیند میں تھے۔ بیداری اگر کہیں تھی تو دریائے فرات سے دور قافلہ حسینیؑ کے ان خیموں میں موجود تھی۔ باقی ہر طرف اندھیرا تھا' موت تھی یا غفلت کی گہری نیند۔

امام حسین علیہ السلام مسلمانوں کو اندھیرے اور غفلت کی اسی نیند سے بیدار کرنے کے لیے مدینے سے نکلے تھے۔ مدینے سے نکلتے وقت آپؑ نے اپنی پالیسی بالکل دو ٹوک انداز میں بیان کر دی تھی۔ آپؑ نے فرمایا تھا کہ مملکت اسلامی میں غیر اسلامی حکومت کے خلاف میری یہ احتجاجی تحریک ملک میں ہنگامہ یا فساد پھیلانے کے لیے ہرگز نہیں ہے۔ میں نے یہ انقلابی فیصلہ اس لیے بھی نہیں کیا کہ میں کسی طرح کی جہالت یا کم علمی کا شکار ہوں۔ میں مدینے سے اس لیے نہیں نکلا کہ کسی قسم کی سرکشی' ظلم یا زیادتی کروں۔ یہ انقلابی تحریک میں نے اس لیے شروع کی ہے کہ میں اپنے ناناؐ کی امت کو صراط مستقیم دکھا سکوں اور اپنے باپؑ کے شیعوں کو فلاح و کامرانی کی راہ دکھا سکوں۔

دنیا کے لیڈر جب کوئی انقلابی تحریک شروع کرتے ہیں تو اپنے ساتھیوں اور عوام کو آنے والے دنوں میں کامیابی کی امید دلاتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کو ... کے سنہرے خواب اور سبز باغ دکھاتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کے سا... شامل ہو سکیں۔ امام حسین علیہ السلام کا انداز سب سے نرالا تھا۔ مکے سے عراق کی طرف روانہ ہونے سے ایک دن پہلے آپؑ نے فرمایا تھا:

''میرے لیے موت کی جگہ طے ہو چکی ہے اور میں وہاں جا کر ہی

رہوں گا۔ میں (چشم تصور سے) دیکھ رہا ہوں کہ کربلا میں جنگل کے بھیڑیے میرے اعضاء کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں۔ (بہر حال) ہم اہل بیتؑ کی وہی مرضی ہے جس سے اللہ راضی ہو۔ دیکھو! جو شخص ہمارے لیے جان دینے پر تیار ہو اور اللہ سے محبت رکھتا ہو وہ ہمارے ساتھ چلے۔ میں کل صبح انشاء اللہ (عراق کے لیے) روانہ ہو جاؤں گا۔"

منزل "ثعلبیہ" پر جب آپ کو حضرت مسلم بن عقیلؑ، جناب ہانی ابن عروہؓ اور کوفے میں موجود اپنے شیعوں کے قتل کی خبر ملی تو آپؑ نے اپنے قافلے والوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"مجھے اپنے بھائی مسلم بن عقیل کے متعلق بہت ہولناک خبر ملی ہے جس سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ ہمیں کوفے بلانے والوں نے ہم سے بے وفائی کی ہے۔ لہذا! اب تم میں سے جو شخص تلوار کی آنچ اور نیزے کا زخم برداشت کرنے کی ہمت رکھتا ہے وہ ضرور ہمارے ساتھ چلے ورنہ وہ یہیں سے ہم سے الگ ہو کر چلا جائے۔"

جو لوگ مکے سے نکلتے وقت آپؑ کے ساتھ ہو لیے تھے انہوں نے جب حالات کی سنگینی کا اندازہ لگایا تو ان کی اکثریت نے اس قافلہ شہادت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی لیکن مدینے، یمن اور بصرے سے آنے والوں، کوفے سے وہاں کے شیعوں کے خط

لانے والوں اور حضرت مسلم بن عقیلؑ کی شہادت کے بعد کوفے سے نکل کر امام حسین علیہ السلام کے قافلے میں شامل ہونے والوں نے خون کے آخری قطرے تک آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

☆☆☆

اصحاب حسینؑ مودب انداز سے بیٹھے ہوئے تھے۔ خاندان اہل بیتؑ کے افراد حلقہ بنائے امام علیہ السلام کے گرد موجود تھے۔ خیمے کو روشن رکھنے والا چراغ امام حسین علیہ السلام کے قریب رکھا تھا۔ ہر شخص خاموش تھا۔ خیمے کے باہر چاروں طرف گہرا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ اردگرد کے مختلف خیموں میں سے آنے والی چھوٹے بچوں کے رونے کی آوازیں کچھ دیر کے لیے اس سناٹے کو توڑ دیتیں۔ کوئی بچہ کسی خیمے میں سوتے سوتے بیدار ہوتا تو بھوک اور پیاس کی شدت سے رونے لگتا۔ یہ آوازیں سناٹے کو توڑتی ہوئی سننے والوں کے دلوں کو تڑپا کر رکھ دیتیں۔ مائیں اپنے بچوں کو تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کرتیں۔ بچے تو ذرا دیر کو بہل جاتے لیکن ماؤں کے آنسو نہیں رکتے تھے۔

دو دن کی بھوک پیاس کے باوجود امام حسین علیہ السلام کا چہرۂ مبارک ایمان‘ یقین اور اعتماد کے نور سے روشن تھا۔ چراغ کی روشنی ان کے چہرے کے نور کے آگے ماند پڑ گئی تھی۔ تمام اصحاب اور رشتے دار آپ کی جانب دیکھ رہے تھے۔ آپ نے پیار بھری نظروں سے اپنے مختصر سے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور نبی کریمؐ اور ان کے اہل بیتؑ پر درود پڑھ کر آپ نے اپنی تقریر کا آغاز کیا:

”میرے دوستو! میرے عزیزو! میری جان سے پیارے

ساتھیو! میرے بیٹو، بھتیجو، بھائیو! بھائی حبیب ابن مظاہر! چچا مسلم ابن عوسجہ! میرے ناناؐ اور باپؑ کے صحابیو! میں نے اپنے اصحاب سے زیادہ وفادار ساتھی کسی کے نہیں دیکھے اور کسی کے عزیز اپنے عزیزوں سے زیادہ نیکوکار اور صلہ رحم کرنے والے میری نظروں سے نہیں گزرے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو میری طرف سے بہترین جزا عنایت کرے۔"

آپ کے ان تعریفی جملوں کو سن کر سننے والوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ آپ نے حالات کا ایک جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا:

"دیکھو! مجھے یقین ہے کہ ہمیں ان دشمنوں سے سخت مقابلہ درپیش ہوگا۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور یہ صرف مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے میں تم سب کو اپنی بیعت سے آزاد کرتا ہوں۔ ان کی تم سے کوئی دشمنی نہیں۔ یہ صرف میری جان کے دشمن ہیں اس لیے میں تمہیں خوشی سے اجازت دیتا ہوں کہ تم میں جو شخص بھی مجھے چھوڑ کر جانا چاہے وہ بخوشی چلا جائے۔"

امام علیہ السلام کے اس آخری جملے نے سننے والوں کے دلوں کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ ان کے چہرے سرخ ہو گئے تھے۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن جذبات کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ الفاظ ان کے حلق میں پھنس گئے ۔ امام علیہ السلام کے ادب و احترام نے ان کے ہونٹوں پر تالے ڈال رکھے تھے۔ خیمے میں دم گھونٹ دینے والا سناٹا

چھا گیا۔ آخر امام حسین علیہ السلام کی آواز نے اس خاموشی کو توڑا:

"دیکھو! شاید تمہیں یہاں سے جانے میں یہ خیال ہو کہ وہ ثواب جو تمہیں یہاں شہید ہونے میں ملے گا تم اس سے محروم رہ جاؤ گے۔۔۔ تو میرے وفادار ساتھیو! میں حجت خدا، ولی مطلق، امام وقت۔۔۔ میں یعنی حسین ابن علی تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر اس وقت تم چلے جاؤ گے (تب بھی) شہادت کا ثواب میں تمہیں ضرور دلواؤں گا!"

امام حسین علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کے سرخ ہوتے اور آنسوؤں سے دھلتے ہوئے چہروں کو دیکھا اور فرمایا:

"مجھے معلوم ہے کہ لوگ تمہیں طعنے دیں گے کہ اپنے سردار کو موت کے منہ میں چھوڑ کر آگئے۔۔۔! تو یوں کرو کہ میرے ساتھ نبیؐ کی بیٹیاں آئی ہوئی ہیں۔ تم انہیں اپنے ساتھ لے کر مدینے چلے جاؤ۔ انہیں ناناؐ کے روضے پر چھوڑ دینا۔ پھر تمہارا جہاں دل چاہے چلے جانا۔ اگر کوئی طعنہ دے تو اس سے کہہ دینا کہ ہم زینب وام کلثوم کا پردہ بچانے کے لیے چلے آئے تھے۔"

یہ سننا تھا کہ اصحاب حسینؑ اور خاندان اہل بیتؑ کے جوان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ان کے آنسو دیکھ کر امام علیہ السلام کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ آپ نے سر جھکاتے ہوئے اپنے بیٹے علی اکبرؑ سے کہا۔ "بیٹا علی اکبر! یہ چراغ بجھا

"

حضرت علی اکبرؑ نے چراغ گل کر دیا۔ سارا خیمہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اب ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس گھپ اندھیرے میں امام حسین علیہ السلام کی آواز گونجی :

"دیکھو! اب اندھیرا ہو گیا ہے۔ میں تمہاری شکل نہیں دیکھ رہا اور نہ تم میری شکل دیکھ سکتے ہو۔ اس اندھیرے سے فائدہ اٹھاؤ اور جو شخص یہاں سے جانا چاہے چلا جائے۔ میں بہ خوشی تمہیں اجازت دے رہا ہوں۔۔۔ جاؤ۔۔۔ جاؤ چلے جاؤ۔"

دس منٹ تک خیمہ اندھیرے میں ڈوبا رہا۔ اس عرصے میں امام حسین علیہ السلام بھی خاموش رہے اور اصحاب واعزہ میں سے بھی کوئی کچھ نہ بولا۔ اس گھپ اندھیرے میں ہر طرف سے کچھ آوازیں ضرور آتی رہیں لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ یہ کس چیز کی آوازیں ہیں۔ دس منٹ بعد امام علیہ السلام نے دوبارہ چراغ روشن کرنے کا حکم دیا۔

چراغ روشن ہوا تو ماحول ہی بدلا ہوا تھا۔ ہر شخص اسی طرح اپنی جگہ موجود تھا لیکن اب مجاہدوں کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔ جوانوں نے اپنی تلواروں کے نیاموں کو توڑ ڈالا تھا، بوڑھوں نے اپنی کمر کو اپنے عماموں سے کس کس کے باندھ رکھا تھا تاکہ ان کی جھکی ہوئی گردنیں اور ان کے سینے جوانوں کی طرح تنے ہوئے نظر آئیں۔ چھوٹے بچے اپنے پنجوں پر تن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ امام حسین

طرح خوش، مستعد اور چوکنا نظر آرہا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اے حجت خدا! ولی مطلق اے امام وقتؑ! آپ فکر نہ کریں۔ میں بھی شیر خداؑ کا پوتا ہوں۔ کل ایسا جہاد کروں گا کہ دنیا دیکھے گی!

چراغ کی روشنی میں امام علیہ السلام نے جرات، بہادری، وفاداری اور جانثاری کے ان لافانی مجسموں پر نظر ڈالی تو آپ کا سینہ فخر سے تن گیا۔ شکرانے کے آنسوؤں کے ساتھ آپ کے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے اور آپ نے کہا:

> "خداوند! تو گواہ رہنا کہ اتنے اچھے جانثار تو میرے نانا محمدؐ کو نہیں ملے اتنے اچھے ساتھی تو میرے باپ علیؑ کو میسر نہیں آئے۔ اتنے اچھے رفیق تو آدمؑ سے لے کر آج تک کسی کو نصیب ہی نہیں ہوئے پروردگار!"

امام علیہ السلام کے یہ الفاظ خیمے میں گونجے تو جانثاروں کے صبر و ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ سارا خیمہ ہچکیوں اور سسکیوں کی آوازوں سے بھر گیا۔ سب سے پہلے حضرت مسلم ابن عوسجہؓ اپنی تلوار کا سہارا لے کر لرزتے ہوئے اپنی جگہ کھڑے ہوئے۔ آپ رسول اللہؐ کے صحابیوں میں سے تھے۔ کوفے میں آپ نے سفیر حسینؑ کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور ان کی شہادت کے بعد اپنی شریک حیات اور بیٹے کے ساتھ کربلا کے راستے میں نواسۂ رسولؐ کے ساتھ آملے تھے۔ امام حسین علیہ السلام اپنے ناناؐ کے ان صحابی کو "چچا" کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔

حضرت مسلم ابن عوسجہ کا پورا بدن جذبات کی شدت سے لرز رہا تھا۔ انہوں نے بہ مشکل اپنی لرزتی ہوئی آواز پر قابو پایا اور بولے :

"حسین ابن علیؑ ! میں نے تمہارے ناناؐ کو بھی دیکھا ہے اور تمہارے باپؑ کے ساتھ بھی رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں حسینؑ کہ واقعی تمہیں ہماری کوئی ضرورت نہیں لیکن آقا! ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔ تم ہمارے محتاج نہیں ہو حسینؑ ! ہم تمہارے محتاج ہیں اس لیے حسینؑ ! اگر تم ہمیں ٹھوکریں مار مار کر بھی یہاں سے نکال دو گے تب بھی ہم پلٹ کر یہیں واپس آئیں گے کیونکہ ہم تمہارے بغیر رہ ہی نہیں سکتے !"

حضرت مسلم ابن عوسجہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکے۔ آپ کی آواز بھرا گئی۔ آپ لڑکھڑاتے ہوئے اپنی جگہ بیٹھ گئے اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگے۔

ان کے بعد حضرت بریر ہمدانی اپنی جگہ کھڑے ہوئے۔ ان کے پورے قبیلے کو حسین علیہ السلام کے والد حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے ایمان کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ بریر ہمدانی کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور داڑھی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ آپ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا :

"حسین ابن علیؑ ! آپ ہمیں جانے کو کہہ رہے ہیں !۔۔۔ ٹھیک ہے ہم چلے جاتے ہیں تمہارے دربار سے۔۔۔ مگر ہمیں اپنے گھر سے اچھا گھر اور اپنے دربار سے اچھا دربار بتا دو جہاں ہم جا سکیں۔۔۔"

ا۔ ان بات نا کہ ۔۔ علیہ السلام کے پ ۔ کے دوست حبیب ابن مظاہرؓ کی باری آئی۔ جناب حبیبؓ کوفے میں رہتے تھے۔ آپ کو امام علیہ السلام نے خط لکھ کر حق و باطل کی جنگ میں ساتھ دینے کی دعوت دی تھی۔ جناب حبیب ابن مظاہرؓ تن کر کھڑے ہو گئے اور بولے :

"حسینؑ! میں تمہارے ساتھ بچپن سے رہا ہوں۔ میں تمہیں چھوڑ کر چلا تو جاؤں مگر ایک بات مجھے بتا دو کہ قیامت کے دن اگر تمہاری ماںؑ نے مجھ سے پوچھ لیا کہ حبیب! میرے حسینؑ کو کہاں چھوڑ آیا؟ تو میں انھیں کیا جواب دوں گا؟"

اس عرصے میں حضرت مسلم ابن عوسجہؓ اپنی آواز پر قابو پا چکے تھے وہ دوبارہ اٹھے :

"حسینؑ! تم کہتے ہو کہ ہم تمہیں چھوڑ کر چلے جائیں یہ سوچے بغیر کہ ہم خدا و رسولؐ کو کیا جواب دیں گے۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ میں دشمنوں کے سینوں میں اپنے نیزے کو توڑ دوں۔ خدا کی قسم! ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے یہاں تک ہمارا پروردگار دیکھ لے کہ ہم نے رسول اللہؐ کی عدم موجودگی میں ان کی اولاد کی کس طرح حمایت و حفاظت کی۔ خدا کی قسم اگر ہمیں یہ یقین ہو کہ ہم ستر مرتبہ قتل ہوں گے اور ہر مرتبہ جلائے جائیں گے اور ہر مرتبہ ہماری خاک ہوا میں اڑا دی جائے گی اس کے بعد بھی ہمیں زندہ

کیا جائے اور پھر قتل کیا جائے تب بھی حسینؑ تب بھی ہم تم سے ہرگز جدا نہیں ہوں گے۔"

یہ کہتے کہتے رسول اللہؐ کے بوڑھے صحابی، امیر المومنینؑ کے ساتھی اور حسین بن علیؑ کے جانثار مسلم ابن عوسجہ کی آواز شدت جذبات سے بیٹھ گئی اور وہ ہچکیوں سے روتے ہوئے نواسۂ رسولؐ کے قدموں میں جھکتے چلے گئے۔ امام علیہ السلام نے ان کے دونوں بازو تھام کر انہیں اٹھایا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔

اصحاب کے بعد عزیزوں کی نمائندگی کے لیے علی ابن ابی طالبؑ کے چھوٹے بیٹے، علم دار لشکر حسینیؑ حضرت ابوالفضل عباسؑ نے کچھ کہنا چاہا۔ ان کے چہرے کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ یہ چند لمحے مزید خاموش رہے تو ان کے چہرے سے خون کی دھاریں بہہ نکلیں گی۔ آپ کا پورا بدن لرز رہا تھا اور سیدھا ہاتھ تلوار کے قبضے پر سختی سے جما ہوا تھا۔

آپ نے بہ مشکل کہا۔ "مولا۔۔۔!" پھر آپ نے اپنے لب بھینچ لیے۔ پھر اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے بولے۔ "یا ابن رسول اللہؐ۔۔۔" یہ کہہ کر آپ دوبارہ خاموش ہو گئے۔ پھر تیسری بار آپ نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔ "میرے آقا میرے مالکؑ۔۔! پھر اچانک ہی آپ نے نجف اشرف کی طرف رخ کر کے شکایت بھرے لہجے میں فریاد کی۔ "بابا جانؑ! مدد کو آیئے۔۔ آقا چھوڑ کر چلے جانے کو کہہ رہے ہیں۔۔۔ کیا جواب دوں؟"

اپنے باوفا ساتھیوں کی باتیں سن کر آنسو تھے کہ امام حسین علیہ السلام کی آنکھوں

سے امنڈے چلے آرہے تھے، اب جو چھوٹے بھائی نے بابا سے فریاد کی تو امامؑ نے بے اختیار آگے بڑھ کر اپنے علم بردار کو سینے سے لگالیا اور ان کی پیشانی کو چومنے لگے۔

دونوں بھائی ایک دوسرے کے سینے سے چمٹے ہوئے تھے اور ان کے چہرے آنسوؤں سے تربہ تر ہورہے تھے۔ کچھ دیر بعد امام علیہ السلام نے اپنے بھائی کو خود سے علیحدہ کیا اور اپنے اصحاب کی طرف بڑھے۔ "میں تم سب کا احسان مند ہوں۔۔۔ میں تم سب کا شکر گزار ہوں۔۔۔ جاؤ کل کے دن مرنے کی تیاری کرو۔" حسینؑ ایک ایک جانثار کو گلے سے لگاتے جارہے تھے اور اس کا شکریہ ادا کرتے جارہے تھے۔

رات کا اندھیرا دم توڑنے لگا تھا۔ صحرائے کربلا میں صبح عاشور کا سویرا ہونے میں ابھی دیر تھی۔ دریائے فرات کے کنارے کنارے دور تک پھیلی ہوئی یزیدی فوج کے خوں آشام درندے آنکھ کھلتے ہی غرانے لگے تھے۔ فرعون اپنے سواروں اور پیادوں کو وارثِ موسیٰؑ سے جنگ کے لیے تیار کررہا تھا اور خیمہ حسینیؑ میں شہیدوں کے لہو کی آسمان کو چھونے والی طاقت ور موجیں فرعون کو اس کے لاؤ لشکر سمیت ہمیشہ کے لیے غرق کرنے کے لیے بے چین تھیں۔ تاریخ اپنے آپ کو دھرا رہی تھی لیکن اس نئے فرعون کو دریائے نیل میں نہیں نہر فرات میں ڈوب کر فنا ہونا تھا۔

امیر المومنین یزید ابن معاویہ کی بیعت نہیں کریں گے تو پھر ہم بھی رسولؐ سے آپؓ کی رشتے داری کی پروا نہیں کریں گے۔ یزید کی بیعت کریں یا قتل ہونے کے لیے تیار ہو جائیں۔"

منزل شراف کے قریب یزیدی دستے سے ملاقات سے لے کر اپنی شہادت کے آخری لمحوں تک امام حسینؓ نے بار بار یزیدی فوجیوں، افسروں اور سرداروں سے اپنا تعارف کرایا تھا اور انہیں بتایا تھا کہ میں تمہارے نبیؐ کا نواسہ اور علیؑ و فاطمہؓ کا بیٹا ہوں۔ تم مجھے کس جرم میں قتل کرنا چاہتے ہو۔ میں نے جنگ کے لیے کوئی لشکر جمع نہیں کیا۔ میرا مدینے سے نکلنا، صرف اس لیے ہے کہ قرآنی تعلیمات کا مذاق اڑایا جارہا ہے۔ تمہارے دین کو مسخ کرنے کی سازشیں ہو رہی ہیں۔ میں اسی لیے گھر سے نکلا ہوں کہ لوگوں کو برے کاموں سے روکوں اور اچھے کاموں کے کرنے کا حکم دوں۔ کیا مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنا کوئی جرم ہے کہ تم لوگ مجھے قتل کرنے پر تیار ہو گئے! مجھے قتل کر کے تم دنیا میں ایک لمحہ بھی چین سے نہیں گزار سکو گے اور آخرت میں تمہارا آخری ٹھکانہ صرف جہنم ہو گا۔

جب حضرت امام حسینؓ ان مسلمانوں کو یہ باتیں بتاتے تو وہ صرف ایک ہی جواب دیتے کہ ہم حاکم وقت یزید ابن معاویہ کے غلام ہیں۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ حسین سے بیعت لو ورنہ ان کا سر کاٹ کر دربار میں پیش کرو۔ ٹھیک ہے آپ رسولؐ کے نواسے ہیں لیکن ہم تو حکم کے غلام ہیں۔ ہمارے حاکم نے جو حکم دیا ہے ہمیں اس پر عمل کرنا ہے۔ یزیدی فوجیوں کے یہ دو ٹوک اور واضح جواب آج بھی تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔

قیامت تک اسی طرح قائم رہے گی۔

☆☆☆

دس محرم سن ۶۱ ہجری کو عصر سے پہلے کربلا کا میدان ایک ایسا منظر پیش کر رہا تھا کہ اسے دیکھنے کی تاب صرف رسولؐ کے نواسے اور علیؑ کے بہادر بیٹے ہی کو ہو سکتی تھی۔ امام حسینؑ پیاس کی شدت اور صدموں سے نڈھال ہو چکے تھے۔ چاروں طرف ان کے چاہنے والوں، ان کے پیاروں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ ان کا خاندان خاک و خون میں نہا چکا تھا۔ حسینؑ اب بالکل تنہا تھے۔ آنسو تھے کہ رکتے ہی نہیں تھے، چہرہ اور لباس مٹی اور خون سے آلودہ تھا۔ کمر ٹوٹ چکی تھی، بازو کٹ چکے تھے۔ آنکھوں کی روشنی مدھم ہونے لگی تھی۔ ایسے میں حسین علیہ السلام نے آخری دفعہ ایک صدائے استغاثہ بلند کی کہ ہے کوئی میری مدد کرنے والا!

یہ آواز آپؑ نے اس لیے بلند کی کہ ہزاروں دشمنوں میں سے شاید کوئی ایسا ہو جو ان کا ساتھ دے کر جہنم کے عذاب سے بچ جائے۔ ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن ان دشمنوں میں سے کوئی شخص کہے کہ اگر مجھے حسینؑ مدد کے لیے پکارتے تو میں ضرور ان کی مدد کرتا۔

امام حسینؑ یہ صدائے استغاثہ اپنی مدد کے لیے بلند نہیں کر رہے تھے۔ اب انھیں کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں تھی۔ تمام عزیزوں اور دوستوں کے قتل ہونے کے بعد امام حسینؑ یہ صدائے استغاثہ اس لیے بھی بلند نہیں کر رہے تھے کہ کوئی آکر ان کے زخموں پر مرہم رکھے اور ان کے بھوک پیاس مٹائے۔ ان حالات میں انھیں زندہ رہنے کی کیا خواہش ہو سکتی تھی!

یہ صدائے استغاثہ آپ اس لیے بلند کر رہے تھے کہ آپ کی آواز تاریخ میں محفوظ ہو جائے اور قیامت کے دن تک انسانی ذہنوں، قوموں، معاشروں، ملکوں اور زمانوں میں سفر کرتی رہے اور مستقبل کے انسان اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنے دور کے یزیدوں کے خلاف جنگ کے لیے آگے بڑھتے رہیں۔ حق و باطل کے درمیان کربلا میں لڑی جانے والی جنگ سے نہیں، دنیا و شیطان کے وجود سے اب تک اسی طرح جاری رہے۔

ہمیشہ زندہ رہنے والی یہ آواز استغاثہ بلند ہوئی تو یزیدی فوج اپنی تلواریں ہوا میں لہرانے لگے۔ مگر یہ آواز جب خیمہ تک پہنچی تو چھ ماہ کے ایک بچے نے خود کو جھولے سے نیچے گرا دیا۔

کسی بی بی نے پکار کر امام حسینؑ کو متوجہ کیا۔ امام حسینؑ نے خیمے میں جا کر اپنے چھوٹے سے بچے علی اصغر کو گود میں اٹھایا اور میدان جنگ میں آ کر یزیدیوں کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ پھر آپ نے یزیدی فوج کو مخاطب کر کے کہا

"اگر تم لوگ سمجھتے ہو کہ میں تمہارا گناہ گار ہوں تو یہ بچہ تو قصوروار نہیں۔ یہ تین دن سے پیاسا ہے۔ اس کی زبان خشک ہو گئی ہے۔ خدا کے واسطے اسے چند گھونٹ پانی پلا دو اور اس کی جان بچا لو۔"

امام حسینؑ کی باتیں سن کر تمام فوجیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ کئی فوجیوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کئی لوگ منہ چھپا چھپا کر حسین علیہ السلام کی مظلومیت پر رونے لگے۔ عمر سعد نے یہ حالت دیکھی تو اس نے حرملہ کو حکم دیا کہ حسین کی گفتگو کو اپنے تیر کی نوک سے کاٹ دے۔

حرملہ نے تین دھار والا زہریلا تیر چلایا۔ یہ تیر ہوا میں سنسناتا ہوا اپنے نشانے تک پہنچا اور ننھے سے معصوم بچے کے حلق کو کاٹتا ہوا حسین علیہ السلام کے بازو میں اتر گیا۔ تیر کھا کر ایک لمحے کو بچے کے سوکھے ہوئے لبوں پر ایک بے اختیار مسکراہٹ پھیلی اور اگلے ہی لمحے وہ تکلیف کی شدت سے تڑپنے لگا۔ اس کے نرم و نازک ہونٹوں کے کناروں سے لہو کی دھاریں پھوٹ پڑی تھیں اور اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی تھی۔

امام حسینؑ نے تیر نکال کر اسے سینے سے لگایا تو آپؑ کے ہاتھ کی چلو بچے کے خون سے بھر گئی۔ آپؑ نے اس خون کو اپنے چہرے پر مل لیا اور کہا کہ میں اسی طرح اپنے جد محمد مصطفیٰؐ کی خدمت میں جاؤں گا۔ پھر آپ نے اپنی تلوار سے چھوٹی سی قبر کھودی اور اپنے دل کے ٹکڑے کو قبر میں دفن کر دیا۔

اس کے بعد آپؑ نے لشکر یزید پر ایسا حملہ کیا کہ یزیدی لشکر کو علی ابن ابی طالبؑ کی جنگ یاد آگئی لیکن ایک تنہا آدمی ہزاروں سے کب تک لڑ سکتا تھا۔ نماز عصر کے وقت تک امام حسینؑ زخموں سے چور چور ہو چکے تھے۔ تلواروں نے آپؑ کے جسم اطہر کو جگہ جگہ سے گھائل کر رکھا تھا۔ تیروں سے جسم چھلنی تھا۔ مقتل کی سرزمین علیؑ و فاطمہؑ کے خون سے لالہ رنگ ہو رہی تھی۔

لشکر یزید میں بہت سے لوگ پتھروں کے تھیلے لٹکائے ہوئے تھے۔ یہ لوگ تلوار نہیں چلا سکتے تھے اس لیے وہ حلقہ بنائے کھڑے تھے اور نواسہ رسولؐ پر پتھر برسا رہے تھے۔ تیز دھوپ، شدید گرمی اور تین دن کی بھوک پیاس نے امامؑ کو نڈھال کر دیا تھا۔ عمامے سے لے کر جوتوں تک خون ہی خون بہہ رہا تھا۔ اچانک کسی درندے

آپؑ کے سینے پر اس زور سے نیزہ مارا کہ آپ گھوڑے سے زمین پر گر گئے۔ ابھی اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ دوسرے درندے نے آپؑ کے شانے پر تلوار چلائی۔ پھر تو چاروں طرف سے حملے ہونے لگے اور کربلا کی ریت نواسہ رسولؐ کے مقدس لہو سے سیراب ہونے لگی۔

امام حسینؑ زخموں سے تڑپ رہے تھے۔ شمر ملعون آگے بڑھا کہ آپؑ کا سر کاٹ لے۔ اس وقت اسے امام حسینؑ کی نحیف آواز سنائی دی۔ آپ کہہ رہے تھے۔ "اے شمر نماز عصر کا وقت ہو گیا ہے مجھے اجازت دے کہ میں آخری بار اپنے مالک اللہ کی شان میں عبادت کر لوں۔"

شمر ایک لمحے کو تو ششدر رہ گیا۔ دنیا میں اللہ کا کوئی ایسا بندہ بھی ہو سکتا ہے جو اس طرح ہزاروں زخموں سے چور ہو۔ موت اس کے سامنے کھڑی ہو۔ اس کے باوجود اسے نماز کے وقت کا احساس ہو اور وہ اپنے معبود کے سامنے سجدہ ریزی کے لئے بے تاب ہو۔ شمر کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

امام حسین علیہ السلام سجدے میں جا چکے تھے۔ اس وقت شیطان نے اپنے وفادار کتے کو جھنجھوڑا۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے سجدے کی حالت میں امام حسینؑ کی گردن پر خنجر رکھ دیا۔

کربلا کی زمین لرزنے لگی۔ صحرا میں آندھیاں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ ہواؤں میں سسکیوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ آسمان سے خون کی بارش ہونے لگی۔ سر حسینؑ نیزے پر بلند ہوا تو خیمہ حسینی میں کہرام مچ گیا۔ یزیدی فوج میں خوشی کے نقارے بجنے لگے تھے۔

یزیدی درندے امام علیہ السلام کے گھوڑے کو پکڑنا چاہتے تھے لیکن ذوالجناح
کسی کے قابو میں نہ آتا تھا۔ وہ کبھی پچھلی ٹانگوں سے لاتیں مارتا اور کبھی اگلے سموں سے
اپنے مالک کے دشمنوں کو روندتا ہوا امام علیہ السلام کے قریب پہنچا۔ امام علیہ السلام کا سر
آپ کے جسم سے الگ ہو چکا تھا آپ کی گردن سے تازہ تازہ خون زمین پر پھیل رہا تھا
ذوالجناح کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے۔ اس نے سر جھکا کر اپنی پیشانی حسین علیہ
السلام کے خون پر رکھ دی اور پھر غصے میں ہنہناتا ہوا خیمہ حسینی کی طرف دوڑنے لگا۔

یزیدی فوجی خوشی کے مارے امام حسینؑ کے جسم مبارک کے گرد دیوانوں کی
طرح رقص کرنے لگے تھے۔ اخنس بن مرثد نواسہ رسولؐ کا عمامہ اتار کر بھاگا، اسحاق
ابن حشوہ نے قمیض اتار لی، اسود بن خالد نے حسینؑ کے جوتے ہتھیا لیے، کسی نے
انگوٹھی کے لالچ میں خنجر سے آپؑ کی انگلی کاٹ لی، ایک درندے نے کمر بند لینے کے
لیے آپؑ کا ہاتھ تلوار سے کاٹ کر الگ کر دیا۔

اس کے بعد تمام شہیدوں کے سر کاٹے گئے اور سب کی لاشوں کو میدان میں
ایک جگہ جمع کر لیا گیا۔ یزیدی فوجی وحشیانہ نعرے لگانے لگے۔ پھر عمر ابن سعد نے گھڑ
سواروں کو حکم دیا کہ بنی ہاشم کی لاشوں پر گھوڑے دوڑائے جائیں۔ دس آدمی اس کام
کے لیے تیار ہو گئے۔ انہوں نے اپنے گھوڑوں کو ایک دائرے کی شکل میں خاندان
رسالتؐ کے شہیدوں کی لاشوں پر دوڑانا شروع کر دیا۔

☆☆☆

کربلا کی سرزمین اسلام کے سچے شیدائیوں کے لہو سے سرخ ہو چکی تھی لیکن
امامت کا ایک چاند ڈوبا تو خیمہ حسینیؑ سے امامت کا چوتھا مہتاب طلوع ہو گیا کہ

انسانوں کی ہدایت ورہنمائی کے لیے ہدایت کے یہ سارے چاند اسی گھر سے طلوع ہوتے رہے تھے۔

امام حسین علیہ السلام کے سفر شہادت کا دوسرا مرحلہ ختم ہو چکا تھا۔ اب تیسرے مرحلے کا آغاز ہو رہا تھا۔ کربلا میں اندھیرا چھا رہا تھا لیکن امامت کے چاند کی روشنی بڑھتی جا رہی تھی۔ کربلا کی خاک میں شہیدوں کا لہو جذب ہو رہا تھا۔ صحرا میں گلابوں کی ایک فصل تیار ہو رہی تھی۔ ان گلابوں کی خوشبو تیزی سے پھیلنے لگی تھی۔ اس خوشبو کو ابھی کوفہ و شام کے منافقت بھرے شہروں کو اسلام کی خوشبوؤں سے مہکانا تھا اور حکومتوں اور سرحدوں کو فتح کرنا تھا۔

زنجیروں کی گونج

گورنر ہاؤس میں جشن فتح منانے کی تیاریاں
ہو رہی تھیں اور شہر کے گلی کوچوں میں
حکومت کی شکست کا آغاز ہو چکا تھا!

باب۔ ۷

اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ رات کے اس گھپ اندھیرے میں آسمان سے چھوٹے چھوٹے ستارے گر رہے تھے۔ ایک روشنی بار بار پیدا ہوتی کبھی کسی نشیب کی طرف، کبھی دریائے فرات کے کنارے۔ ہوا کے جھونکوں میں عجیب پراسرار آوازیں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ آوازیں ہچکیوں اور سسکیوں سے ملتی جلتی تھیں۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے لاتعداد نادیدہ' غیر مرئی مخلوق کربلا کے ریگزار میں ادھر سے ادھر آجا رہی ہے۔ نظر کچھ نہیں آتا تھا لیکن اس مخلوق کو ہوا کے جھونکوں' ریت کے ٹیلوں اور شہیدوں کی لاشوں کے اردگرد محسوس کیا جاسکتا تھا۔

دراصل یہ ستر ہزار فرشتے تھے جو حضرت امام حسینؑ کی صدائے استغاثہ سن کر عصر کے وقت آسمان سے ان کی مدد کے لئے زمین پر اترے تھے۔ انہوں نے زخموں سے چور امام مظلومؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی تھی۔ "اللہ جل شانہ کے خلیفہ! آپ حکم دیں تو ہم آپؑ کے ان دشمنوں کو ایک اشارے سے جلا کر خاکستر کر دیں!"

"نہیں! یہ جیسے بھی ہیں مگر شاید ان کی نسل سے کوئی سچا مسلمان پیدا ہو۔ پھر

تمہارا اور ان کا کیا مقابلہ! میں یہ ناانصافی نہیں کر سکتا۔ میں صرف اس دنیا میں بسنے والے انسانوں سے مدد چاہتا ہوں کیوں کہ اس میں ان انسانوں ہی کی بہتری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری یہ صدائے استغاثہ زمانوں اور فاصلوں پر چھا جائے گی اور قیامت تک پیدا ہونے والا آخری انسان بھی اسے ضرور سنے گا۔ ان میں سے جو لوگ اللہ کے دین سے محبت کرنے والے ہوں گے میری آواز سن کر ضرور میری مدد کو آئیں گے۔"

"لیکن اے امام وقت! آپ اس وقت کہاں ہوں گے کہ لوگ آپ کی مدد کو آئیں گے؟" ایک فرشتے نے رندھی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"اپنے اللہ کے فضل و کرم سے میں ہمیشہ زندہ رہوں گا۔ پھر میرے تو بیٹے ہیں جن میں سے کوئی نہ کوئی ہر دور، ہر صدی اور ہر خطۂ زمین پر اللہ کی بات کرتا رہے گا۔ زمین کبھی میرے بیٹوں سے خالی نہیں ہوگی۔ دین اسلام انہی کے ہاتھوں میں محفوظ رہے گا۔ میری صدائے استغاثہ قیامت تک اسی طرح انسانی زمانوں، مختلف علاقوں، تہذیبوں اور معاشروں میں گونجتی رہے گی اور ہر دور میں انسان گروہ در گروہ میری مدد کو آگے بڑھتے رہیں گے۔"

"وہ کس طرح آپ کی مدد کریں گے؟" ایک فرشتے نے پوچھا۔

"وہ لوگ دین اسلام کو مضبوطی سے تھام لیں گے۔ وہ اس کی حفاظت کریں گے۔ زکوٰۃ ادا کریں گے، وقت پر نماز پڑھا کریں گے۔ مظلوموں کی مدد کریں گے۔ ظالموں کے آگے چٹان بن جائیں گے، دین کی حفاظت میں اپنی جانوں کی پروا نہیں کریں گے۔ مشکلات میں صبر کریں گے۔ نیکیوں کو عام کریں گے، برے کام خود بھی نہیں کریں گے اور دوسروں کو بھی برے کاموں سے روکیں گے۔ علم کو پھیلائیں گے اور میرے پیغام کو دور دور تک

پہنچاتے رہیں گے۔ یہ سب انسان اپنے اپنے زمانوں، اپنے اپنے معاشروں ملکوں، شہروں اور قصبوں میں دراصل میری صدائے استغاثہ پر میری مدد کرنے والے ہوں گے۔ ایسے انسان، کسی بھی زمانے میں ہوں کسی بھی شہر میں رہتے ہوں، میرے ساتھی، میرے دوست اور میرے مددگار ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو اپنے زمانے کے امامؑ کے حکم کے مطابق اپنے اپنے انداز سے دینِ الٰہی کے لئے قربانیاں پیش کریں گے۔"

"اے حجت خدا۔۔۔! اے اپنی ہی امت کے ہاتھوں شہید ہونے والے۔۔۔! اے شہیدوں کے سردار! ہمارے لئے کیا حکم ہے؟" فرشتوں نے سوال کیا۔

"تم آسمان کی طرف لوٹ جاؤ اور قیامت تک میرے چاہنے والوں، مجھ پر آنسو بہانے والوں، میری محبت کا مطلب سمجھنے والوں، میری یاد میں بہنے والے آنسوؤں کی قدر و قیمت جاننے والوں، ظالموں سے ٹکرانے والوں اور دین کی خدمت کرنے والوں کے لئے دعائیں کرتے رہو!" امام حسینؑ نے فرمایا۔

ستر ہزار فرشتے اسی وقت آسمان کی طرف پرواز کر گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ اب تم سب فرشتے قیامت تک کے لئے زمین پر جا کر رہو۔ تمہارا قیام کربلا میں حسین ابنِ علیؑ کی قبر کے قریب رہے گا اور تم اس قبر کی زیارت کے لئے آنے والوں کے لئے مجھ سے دعا کیا کرو گے۔

یہ فرشتے جب دوبارہ کربلا کے میدان میں اترے تو دریائے فرات کے کنارے آندھیاں چل رہی تھیں۔ ہر طرف اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ شہیدوں کا خون ریگزار کربلا میں جذب ہو رہا تھا۔ مظلوموں کی لاشیں بے گور و کفن میدان میں بکھری ہوئی تھیں۔ خاندان بنی ہاشم کے تمام شہیدوں کے سروں کو ان کے جسموں سے کاٹ کر نیزوں پر

بلند کیا جا چکا تھا۔ قافلہ حسینؑ کے بچے اپنی اپنی ماؤں، پھپھیوں، بہنوں اور کنیزوں کی گودوں میں دبکے ہوئے تھے۔

ہوا کے جھونکوں میں پھیلی ہوئی سسکیوں کی آوازیں ان فرشتوں کی تھیں جو اللہ کے آخری نبی کی اولاد کی بے بسی اور مظلومی پر آنسو بہا رہے تھے۔

گیارہویں محرم کا زرد چاند گہنایا ہوا لگ رہا تھا۔ رسولؐ کے نواسے حسین ابن علیؑ نے اسلام کے نقاب پوش دشمنوں کے خلاف جو منصوبہ بنایا تھا اس کا دوسرا مرحلہ ختم ہو چکا تھا۔ آج کی شام سے اس منصوبے کے تیسرے مرحلے کا آغاز ہو رہا تھا۔ اس تیسرے مرحلے کی سربراہی حسین ابن علیؑ کی بہن جناب زینب بنت علیؑ کے سپرد تھی۔

منصوبے کا یہ تیسرا حصہ بڑا صبر آزما مرحلہ تھا۔ اب تک کے دونوں مرحلوں میں بنی ہاشم کے جوان موجود تھے امام حسینؑ کے بہت سارے ساتھی زندہ تھے اور سب سے بڑھ کر حسین ابن علیؑ جیسا بہادر سردار موجود تھا۔ اب صورت حال مختلف تھی۔ اب خاندان کے مردوں میں صرف سید سجاد علی ابن الحسینؑ زندہ بچے تھے اور انہیں بھی اس وقت تیز بخار تھا۔

قافلہ حسینؑ کی سپہ سالار اس وقت حضرت زینب بنت علیؑ تھیں۔ آپ تین دن کی بھوک پیاس اور اپنے بھائیوں، بیٹوں، بھتیجوں اور بھانجوں کی موت کے زخموں سے چور اور ظالم فوجیوں کی قید میں ہونے کے صدمے سے بے حال تھیں مگر اللہ کی دی ہوئی بے پناہ طاقت نے انہیں پہاڑوں کی طرح مضبوط بنا دیا تھا۔ آپ اپنے فرائض اور ذمے داریوں سے مکمل طور پر واقف تھیں۔ رسولؐ کے نواسے حسین ابن علیؑ کی قربانیوں کو بچانے اور اسلام کے نقاب پوش دشمنوں کی مکاریوں اور چالاکیوں کا پردہ

چاک کرنے کے لئے بی بی زینبؑ ایک ناقابلِ تسخیر چٹان بن گئی تھیں۔ اس وقت ان
کے ہاتھ میں ایک ٹوٹا ہوا نیزہ تھا اور وہ جلے ہوئے خیمے کی حفاظت کرنے کے لئے خیمے
کے چاروں طرف کسی مستعد بہادر اور نڈر سپاہی کی طرح گھوم رہی تھیں!

☆☆☆

قیامت سی رات خدا خدا کر کے ختم ہوئی۔ مشرق سے سورج ابھرا۔ کربلا
میدان دیکھتے ہی دیکھتے ایک بہت بڑے تنور میں تبدیل ہو گیا۔ یزیدی فوج نے جل
ہوئے خیمے کو گھیرنا شروع کیا۔ تمام عورتوں اور بچوں کے ہاتھ رسیوں سے باندھ د
گئے اور ان قیدیوں کو اونٹوں پر سوار ہونے کا حکم دیا گیا۔ خواتین اور بچے اونٹوں کی طرف
بڑھے تو کئی فوجیوں نے زبردستی دھکے دے کر انہیں اونٹوں پر بٹھانا چاہا۔ اس وقت اما
علی ابنِ الحسینؑ نے سپاہیوں سے کہا کہ تم لوگ آلِ رسولؐ کی اس طرح بے حرمتی نہ کر
۔ ہم خود اونٹوں پر بیٹھنے میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ اس کے بعد تمام عورتی
اور بچے کسی نہ کسی طرح اونٹوں پر سوار ہو گئے۔

حضرتِ علی ابنِ الحسینؑ بخار کی شدت سے بے حال تھے۔ کمزوری اور نقاہت
وجہ سے ان کے لئے اونٹ پر سنبھل کر بیٹھنا ممکن نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر ظالم فوجیوں
امامؑ کے پیروں میں رسی باندھ کر آپؑ کے پیر نیچے سے اونٹ کے پیٹ سے باندھ د
۔ پھر انہوں نے ایک رسی امامؑ کی گردن میں باندھی اور آپؑ کی گردن کو اونٹ کی گرد
سے باندھ دیا گیا۔

اونٹ ایک ایک کر کے کھڑے ہوتے جا رہے تھے۔ جب تمام اونٹ ایک ق
میں کھڑے ہو گئے تو عمر ابنِ سعد نے اپنی فوج کو کوفے کی سمت بڑھنے کا حکم دیا۔ بس

کیا تھا۔ گھوڑے اچھلتے ہوئے بھاگنے لگے۔ اونٹ سواروں نے اونٹوں کو دوڑانا شروع کر دیا۔ قیدیوں کے اونٹوں کو یزیدی فوجی چھڑیوں سے مار رہے تھے۔ ایک نکیل میں بندھے ہوئے یہ اونٹ بد حواس ہو کر صحرا میں دوڑ رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے خوفزدہ ہو کر بری طرح چیخنے لگتے تو یزیدی فوجی انہیں تازیانے مارتے۔ کسی ماں کی گود سے بچہ گر جاتا تو اسے اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ ماں اونٹ پر بندھی ہوتی اور بچہ گرم ریت پر گر کر تھوڑی دیر تڑپتا اور مر جاتا۔

یزیدی فوجیوں کو جلد از جلد کوفے پہنچنا تھا۔ انہیں یزیدی گورنر عبید اللہ ابن زیاد سے اپنی کامیابی کی داد لینے کی جلدی تھی۔ وہ حکومت سے آل رسولؐ کو شہید کرنے کا انعام لینے کو بے تاب تھے۔ وہ دنیا کے بہترین انسانوں کو بھوکا پیاسا قتل کر چکے تھے۔

اونٹ سے گرنے والے بچوں پر ان کی قیدی ماؤں سے انہیں کیا ہمدردی ہو سکتی تھی۔

سورج آگ برسا رہا تھا۔ بچے گرمی بھوک پیاس اور خوف سے بلک رہے تھے اور انسانی شکل والے درندوں کا قافلہ خوشی کے ڈھول تاشوں اور نعروں کے شور میں دیوانہ وار صحرائی راستوں پر کوفے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سب سے آگے منتخب گھڑ سواروں کا ایک دستہ تھا۔ ان گھڑ سواروں نے اپنے ہاتھوں میں لمبے لمبے نیزے اٹھا رکھے تھے۔ ان نیزوں میں انہوں نے رسولؐ کے خاندان کے افراد کے سروں کو بلند کر رکھا تھا۔ ان سروں سے ابھی تک تازہ خون ٹپک رہا تھا۔ گھڑ سواروں کے چہرے غرور تکبر کی آگ میں تانبے کی طرح سرخ ہو رہے تھے۔ ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا کیونکہ انہوں نے اپنے حاکم کے سب سے بڑے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

یہ گھڑ سوار بھی یزیدی فوج کے دوسرے سپاہیوں کی طرح "مسلمان" تھے۔ ان

اور اس کے رسولؐ کا کلمہ پڑھتے تھے مگر دنیا کی دولت اور عہدوں کے لالچ نے ان کی عقل پر پردے ڈال دیے تھے۔ شیطان نے بدترین گناہوں کو ان کے سامنے بہترین نیکی بنا کر پیش کر رکھا تھا۔ اسی لئے وہ اپنے ہی رسولؐ کے خاندان کو قتل کر کے فخر و غرور میں مبتلاء تھے۔

ان گھڑ سواروں کے پیچھے فوج کا حفاظتی دستہ چل رہا تھا کہ کہیں راستے میں کوئی قبیلہ حملہ کر کے یزیدی فوج سے خاندان رسالتؐ کے سروں کو چھین نہ لے۔ اس کے بعد قیدیوں کے اونٹ تھے۔ ہر اونٹ پر ایک قیدی عورت یا اس کے ساتھ کوئی چھوٹا بچہ سوار تھا۔ ان عورتوں میں اصحابِ حسینؓ کی خواتین کے علاوہ خاندانِ رسولؐ کی نواسیاں' بیٹیاں اور بہوئیں بھی موجود تھی۔ ان کے سروں پر چادریں نہیں تھیں لیکن شدید گرمی سے آنے والے پسینے کی وجہ سے ان کے بال ان کے چہروں پر کسی نقاب کی طرح چپکے ہوئے تھے۔ ایک اونٹ پر امام حسینؓ کی چھ برس کی بیٹی سکینہؓ سوار تھیں۔ ان کے ہاتھ بھی دوسری خواتین کی طرح گردن سے بندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہنیوں سے اپنے چہرے کو چھپا کر رکھا تھا۔

قیدیوں کے ان اونٹوں کے پیچھے بے ترتیب یزیدی لشکر ڈھول' دف اور نفیریاں بجاتا' خوشی کے نعرے لگاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ قیدیوں کے اونٹ آہستہ ہونے لگتے تو پیچھے والے گھڑ سوار آگے بڑھتے اور اونٹوں پر کوڑے برسانے لگتے۔ کوئی قیدی خاتون' یا بچہ پہلو بدلتا تو ساتھ چلنے والے گھڑ سوار انہیں کوڑے مار کر ڈانٹتے اور پھر قہقہے مار کر ہنسنے لگتے۔

لشکر یزید کا سالارِ اعلیٰ عمر ابنِ سعد ایک سجے سجائے گھوڑے پر سوار تھا اور مسلح

فوجیوں کے درمیان ایک ہاتھ سے گھوڑے کی باگیں پکڑے بڑے تکبر کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ عمر ابنِ سعد صحابیٔ رسولؐ جناب سعد بن وقاصؓ کا بیٹا تھا۔ حضرت علی ابنِ ابی طالبؑ ایک مرتبہ مسجد کوفہ میں خطبے کے دوران فرمارہے تھے کہ مجھ سے جو علم حاصل کرنا ہے کرلو۔ میں زمین سے زیادہ آسمان کے راستوں سے واقف ہوں۔ اس وقت سعد بن وقاصؓ نے امیر المومنینؑ سے پوچھا کہ بتایئے کہ میری داڑھی میں بال کتنے ہیں۔ امیر المومنینؑ نے سوال کا جواب دیا اور کہا کہ سعد! یہ بھی سن لے کہ ایک دن آئے گا کہ تیرا بیٹا میرے بیٹے حسینؑ کو قتل کرے گا۔

اس وقت کوئی مسلمان رسولؐ کے نواسے کو قتل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن گزشتہ روز امیر المومنینؑ کی پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہو چکی تھی۔

عمر ابن سعد اس وقت خوشی سے سرشار تھا۔ وہ ابھی سے خود کو "رے" (تہران) کے صوبے کا مالک سمجھنے لگا تھا۔ کوفے کے گورنر یزید کے دستِ راست عبید اللہ ابن زیاد نے عمر ابن سعد سے لکھ کر وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ نواسۂ رسول حسین ابن علیؑ کو قتل کردے تو اسے "رے" کے زرخیز صوبے کا حاکم بنا دیا جائے گا۔ عمر ابن سعد جانتا تھا کہ نواسۂ رسولؐ کو قتل کرنے کے بعد اس کا ٹھکانا ہمیشہ کے لئے جہنم میں ہوگا۔ اس نے رسول اللہ کی یہ حدیث بار بار سنی تھی کہ "حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ جس نے حسینؑ کو تکلیف پہنچائی اس نے مجھے تکلیف پہنچائی۔"

ابن زیاد کی پیش کش کے بعد وہ ساری رات اپنے گھر میں ٹہلتا رہا۔ ایک طرف اسے دنیاوی مال و دولت نظر آرہی تھی اور دوسری طرف جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلے اسے ڈرا رہے تھے۔ اس وقت اس نے سوچا۔ "کیا میں صوبہ "رے" کی حکومت چھوڑ

دوں ؟ جبکہ یہ عہدہ میری سب سے بڑی آرزو ہے۔ کیا رسول اسلامؐ کے نواسے حسینؑ کا قتل کر کے خود کو ایک عظیم ترین گناہ میں مبتلاء کرلوں ؟ حسینؑ کو قتل کرنا بہت بڑی مصیبت ہے لیکن بہر حال میں دل کی گہرائیوں سے "رے" کی حکومت حاصل کرنا چاہتا ہوں چاہے مجھے انسانوں اور جنوں میں سب سے ظالم ترین انسان ہی کیوں نہ کہا جائے۔"

بس اسی وقت شیطان نے اسے ایک راستہ دکھایا۔ ایسا راستہ جو بظاہر بڑا خوبصورت تھا مگر یہ راستہ سیدھا جہنم تک جاتا تھا۔ اس وقت ابنِ سعد بڑبڑایا۔ "جان لو کہ دنیا نقد کا سودا ہے اور کوئی عقل مند نقد کو چھوڑ کر ادھار قبول نہیں کرتا۔ کہتے ہیں کہ خدا نے دوزخ کے رہنے والوں کے لئے آگ کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بنائی ہیں اگر یہ سچ ہے تو میں حسینؑ کو قتل کر کے "رے" کی حکومت حاصل کرلوں گا اور دو سال کے اندر اندر اللہ سے توبہ کرلوں گا۔ سنا ہے اللہ سارے گناہ معاف کر دینے والا ہے اور اگر دوزخ و جنت کی باتیں جھوٹی ہوئیں تو میں اس دنیا میں بہت بڑی سلطنت کا مالک بن جاؤں گا۔"

جنگی باجوں کے شور اور فوجیوں کے وحشیانہ نعروں کے درمیان صحابی رسولؐ کا بیٹا، نواسۂ رسولؐ کا "اجرتی قاتل" اس وقت بڑے غرور سے گھوڑے کی باگیں تھامے، مستقبل کے سہانے خوابوں میں کھویا ہوا کوفے کی سمت بڑھ رہا تھا۔

حسین ابنِ علیؑ کا خون میں ڈوبا ہوا سر دس محرم کی شام ہی میں اس نے خولی اصبحی نامی ایک بااعتماد فوجی سردار کے ذریعے عبیداللہ ابنِ زیاد کے پاس کوفے بھجوا دیا تھا۔ اپنے فوجیوں کی لاشیں اس نے دفن کر دی تھیں۔ خاندانِ رسولؐ کی لاشوں کو اس کے حکم سے گھوڑوں کے سموں سے پامال کر کے انہیں اسی طرح کربلا کے ریگزار میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ اپنے وقت کے ان عظیم ترین انسانوں کے خاک و خون میں لتھڑے ہوئے سر

اس وقت اس کے آگے نیزوں پر آویزاں تھے۔

تیز دھوپ، گرد و غبار اور صحرائی ریت کے چکر کھاتے بگولوں کے دوسری طرف کوفے کی عمارتیں دھندلی سی دکھائی دینے لگی تھیں۔

جشن کا سماں

دنیا کے سارے کام معجزات کے ذریعے
ہونے لگیں تو انسانوں کی اپنے اللہ اور رسولؐ
سے محبت کی آزمائش کس طرح ہو سکتی ہے!

باب۔ ۸

کوفے کے گلی کوچوں میں اس روز جشن کا سماں تھا۔ خولی اصبحی صبح سویرے حسین ابنِ علیؑ کا سر لے کر آ گیا تھا۔ اس نے ابنِ زیاد کو بتایا تھا کہ عمر بن سعد آج دوپہر تک حسینؑ کے بیٹوں، بھائیوں، بھانجوں، بھتیجوں اور دوستوں کے سر لے کر کوفے پہنچ جائے گا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ رسول اللہؐ کے گھرانے کی تمام عورتیں اور بچے قیدی بنا لیے گئے ہیں۔ عمر بن سعد انہیں رسیوں میں باندھ کر اپنے ساتھ لا رہا ہے۔

یہ سن کر ابنِ زیاد خوشی سے بے حال ہو گیا۔ اس نے اپنے افسروں کو طلب کیا اور ان سے کہا۔ "تمام شہر میں منادی کرا دی جائے کہ آج کے دن خدا نے خلیفۃ المسلمین یزید ابنِ معاویہ کو باغیوں پر عظیم کامیابی عطا کی ہے۔ ان باغیوں کے کٹے ہوئے سر اور قیدی عورتیں بچے آج کسی وقت کوفے پہنچ جائیں گے۔ آج کے دن کوفے میں جشن منایا جائے۔ لوگ نیا لباس پہنیں، خوشی کے شادیانے بجائیں۔ گلیوں، بازاروں اور گھروں کو خوب سجائیں اور ہاں۔۔۔ گانے بجانے والوں اور ناچنے والی عورتوں کو بلایا جائے تاکہ وہ زرق برق لباس پہن کر شہر کے راستوں اور بازاروں میں جگہ جگہ رقص و سرور کی محفلیں سجائیں۔ کوفے کا کوئی مرد، عورت اور بچہ اپنے گھر میں

نہ رہے تاکہ جب حسین ابن علیؑ اور ان کے ساتھیوں کے کٹے ہوئے سر کوفے میں
داخل ہوں تو یہاں عید کا سا منظر دکھائی دے اور اہل بیت رسولؐ کی عورتیں اور بچے
شدید ذلت و ندامت محسوس کریں۔"

ابن زیاد کے افسروں نے شہر میں جگہ جگہ اعلان کرایا۔ مسجدوں کے پیش نمازوں
نے نمازوں کے بعد لوگوں کو یہ خوش خبری سنائی۔ شہر کے دولت مند لوگوں کو جو
حکومت سے فائدے اٹھاتے تھے گورنر ہاؤس میں طلب کرکے انہیں تمام شہر میں
جشن برپا کرنے کے انتظامات کی ذمے داری سونپ دی گئی۔ کوفے کی گلیوں میں درہم و
دینار اچھلنے لگے۔ شہر کے آوارہ گرد، بدکردار، لفنگے اور غنڈے اپنے اپنے گھروں سے
نکل آئے۔ عورتوں نے زرق برق لباس پہنے اور مردوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر
ناچنے گانے لگیں۔ ڈھول تاشے، دف اور نفیریاں بجانے والوں کی ٹولیاں شہر کے
چوراہوں اور کربلا سے کوفے میں داخلے کے دروازے کے دونوں طرف آکر جمع
ہوگئیں اور بچوں کے غول کے غول تماشہ دیکھنے بازاروں میں نکل آئے۔

ابن زیاد چمکیلا لباس پہنے اپنے فوجی دستے کے ساتھ شہر کے گلی کوچوں کا معائنہ
کرتا پھر رہا تھا۔ لوگ جھک جھک کر اسے مبارک باد پیش کر رہے تھے۔ اس کا چہرہ خوشی
سے کھلا جا رہا تھا۔ اس نے خولی کو حکم دیا تھا کہ وہ حسین ابن علیؑ کے سر کو سب سے بڑے
نیزے پر آویزاں کرکے ایک فوجی دستے کے ساتھ کوفے سے باہر نکل کر عمر ابن سعد کا
استقبال کرے۔ وہاں سے بنی ہاشم کے دوسرے تمام مردوں کے ساتھ حسین ابن علیؑ
کا سر ڈھول تاشوں اور خوشی کے نعروں کے ساتھ دارالامارہ کوفے کے دربار میں پیش کیا
جائے۔

...اہل بیت سے محبت کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ... موجود تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو قید یا قتل ہونے سے اس لیے بچ گئے تھے کہ انہوں نے کوفے میں ایک محتاط زندگی گزاری تھی۔ یہ لوگ حکومت کے ڈر کی وجہ سے کوئی احتجاج نہیں کر سکتے تھے۔ رسولؐ کے نواسے کی شہادت اور ان کے سروں کے آنے کی خبر ان پر بجلی بن کر گری تھی۔ ان میں کئی لوگ ایسے تھے کہ وہ امام حسینؓ سے محبت تو کرتے تھے مگر خوف کا شکار ہو گئے تھے۔ کئی افراد ایسے تھے جنہوں نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دے رکھی تھی کہ ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی حکومت رسولؐ کے نواسے کو قتل کر سکے۔ اگر ایسا ہوا تو دنیا تباہ ہو جائے گی اور یزیدی حکومت پر اللہ کا قہر نازل ہو گا۔

یہ اپنی ذمے داریوں سے فرار کا ایک راستہ تھا۔ اب ایک المناک حقیقت ان کے سامنے تھی اور وہ گھٹ گھٹ کر رو رہے تھے لیکن ندامت کے ان آنسوؤں میں ایک نیا جذبہ دھیرے دھیرے پروان چڑھ رہا تھا۔ شرمندگی کے یہ آنسو، پچھتاوے کے یہ لمحے ایسے لوگوں کے دلوں میں ایک آندھی کی طرح اٹھ رہے تھے مگر اس آندھی کے چلنے میں ابھی دیر تھی۔

اللہ تعالیٰ تو یزید، ابنِ زیاد، عمر ابنِ سعد، شمر ذی الجوشن، کوفے کے دارالامارہ، شام میں یزید کے محلات اور ساری یزیدی حکومت کو پل بھر میں جلتے ہوئے انگاروں میں تبدیل کر سکتا تھا لیکن اگر دنیا کے سارے کام معجزات کے ذریعے ہونے لگیں تو پھر انسانوں کی اپنے اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کی آزمائش کس طرح ہو سکتی ہے!

☆☆☆

یزیدی فوج کے دستے کوفے سے تین میل پہلے ٹھہر گئے۔ خولی اصبحی، ابنِ زیاد

کے حکم سے امام حسینؑ کا سر نے کر اسی جگہ ان سے ملا تھا۔ کوفے میں داخل ہونے کے لیے سید الشہداءؑ کا سر سب سے اونچے نیزے پر آویزاں کیا گیا تو ساری فوج نے مل کر "اللہ اکبر" کا نعرہ لگایا۔ یہ دیکھ کر امام کی بہنیں، بچے اور دوسری خواتین صدمے سے بے حال ہو گئیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے قیامت آ گئی اور سورج سوا نیزے پر بلند ہو گیا ہے۔ یزیدی فوج کے نعرے تھم گئے مگر جناب زینبؑ، جناب ام کلثومؑ، جناب ربابؑ، جناب سکینہؑ اور جناب فضہ کی دلدوز چیخیں نہ رکیں۔

انھوں نے اپنے بھائی، اپنے شریک حیات، اپنے باپ اور اپنے امامؑ کا چہرہ آخری بار کل عصر سے پہلے دیکھا تھا جب امام حسینؑ اپنے خاندان کی عورتوں اور بچوں کو آخری بار الوداع کہنے خیمے میں آئے تھے۔

خیمے کا پردہ اٹھا کر آپ نے کہا تھا۔ "اے زینب، کلثوم! میرا سلام۔۔۔ اے ام رباب! میرا سلام۔۔۔ اے سید سجاد! میرا سلام۔۔۔ اے اماں کی کنیز فضہ! میرا آخری سلام۔۔۔ اے میرے سینے پر سونے والی بیٹی سکینہ! میرا سلام۔۔۔"

تمام قیدی خواتین یہ منظر یاد کر کے نیزے پر امامؑ کے کٹے ہوئے سر کو دیکھتیں اور بے اختیار بلک بلک کر رونے لگتیں۔

امام حسینؑ کی چھ برس کی بیٹی سکینہؑ کی حالت سب سے خراب تھی۔ ان کی آنکھوں میں وہ منظر گھوم رہا تھا جب شب عاشور بابا نے انھیں سینے سے لگا کر سمجھایا تھا کہ "بیٹی! آج کے بعد تم اپنی ماں کے ساتھ سویا کرنا۔"

"لیکن بابا! اماں تو چھوٹے بھائی کو اپنے ساتھ سلاتی ہیں؟" معصوم بچی نے اپنے بابا سے کہا۔

"بیٹا! آج تمہارا ننھا بھائی میرے ساتھ میدان میں سوئے گا۔ تم ماں کے ساتھ سویا کرو گی۔" امام حسینؑ نے جواب دیا۔

"بابا! آپ میدان میں کیوں سوئیں گے۔ میدان میں بھلا کون سوتا ہے!" معصوم بچی نے حیرت سے پوچھا۔

امامِ حسینؑ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہہ رہی تھی۔ آپؑ نے بیٹی کو آنے والے وقت کے بارے میں بچوں کے انداز میں سمجھایا اور بتایا کہ بیٹی! اللہ کے دین کو بچانے کے لئے مجھے اپنی جان کی قربانی دینا ہوگی اور تمہیں یتیمی کے دکھ برداشت کرنا ہوں گے۔

"بابا! یتیمی کیا ہوتی ہے؟" سکینہ نے بابا کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

"یتیمی۔۔۔" چاہنے والے باپ کی آواز گلے میں اٹک گئی۔

گرم گرم آنسو سکینہ کے ہاتھوں پر گرے تو سکینہ تڑپ کر رہ گئیں۔ "بابا! آپ تو صرف نماز پڑھتے وقت رویا کرتے تھے آج اس طرح کیوں رو رہے ہیں؟ بتایئے ناں کہ یتیمی کسے کہتے ہیں۔"

امامؑ نے بیٹی کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔ "بیٹی! ذرا انتظار کرو۔ کل شام تک تمہیں یتیمی کا مطلب بھی معلوم ہو جائے گا۔"

جناب سکینہ ایک الگ اونٹ پر سوار تھیں۔ ان کے ہاتھ ان کی گردن کے پیچھے رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ بابا کے یہ جملے کسی تیز دھار خنجر کی طرح ان کے دل کو کاٹ رہے تھے اور وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھیں۔

یزیدی فوج کے دستے حرکت کرنے لگے۔ فریاد کرنے والی عورتوں اور بچوں کو شمر ذی الجوشن نے تازیانے مارنا شروع کیے۔ آوازیں رک گئیں مگر آنسو نہ رکے۔ فوجی باجے بجنے لگے۔ خوشی کے نعرے آسمان کو چھونے لگے۔

گھوڑے اچھل رہے تھے۔ اونٹ بلبلا رہے تھے اور گرد و غبار کے بادلوں میں لپٹا ہوا یہ قافلہ کوفے کی حدود میں داخل ہو رہا تھا۔

☆☆☆

مردوں، عورتوں، بوڑھوں، جوانوں اور بچوں کا ایک سیلاب تھا جو ہر طرف سے امنڈا پڑ رہا تھا۔ قافلے کے چاروں طرف کوفے کی فوج کے تازہ دم دستے حفاظت کے لئے موجود تھے۔ ابن زیاد نے فوجیوں کو حکم دیا تھا کہ ہجوم میں سے کسی شخص کو قیدیوں یا مقتولوں کے سروں کے قریب نہ آنے دیا جائے۔ اگر ہجوم میں کوئی شخص مشتبہ نظر آئے تو اسے فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ اس وقت بھی قیدیوں کے ہر اونٹ کے گرد با اعتماد سپاہی گھیرا ڈالے چل رہے تھے۔

بے شمار عورتیں اور بچے راستے کے مکانوں کی چھتوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ ان میں کئی عورتوں اور مردوں کو قیدی عورتوں اور بچوں پر رحم آ گیا۔ انہوں نے اپنی چادریں اور عبائیں مظلوم عورتوں کی طرف پھینکنا شروع کر دیں۔ یزیدی فوجی بے حد چوکنا تھے۔ جیسے ہی کسی قیدی خاتون یا بچے پر چادر آ کر گرتی تو یہ فوجی فوراً اپنے نیزے کی مدد سے اسے نوچ کر زمین پر پھینک دیتے۔ آخر لوگ سمجھ گئے کہ یہ کام کرنا فوجیوں کو پسند نہیں ہے۔ انہوں نے خوف کے مارے چادریں پھینکنا بند کر دیں۔

تماشائیوں کے اس ہجوم میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جنہیں معلوم تھا کہ

شہید ہوئے و رسو د ہیں ور وسول پر سر ہو حو ۔ رسو

نواسیاں ہیں مگر یہ لوگ خوف کے مارے چپ سادھے ہوئے تھے۔ ان کے دل غم سے پھٹ رہے تھے مگر یہ اپنے آنسوؤں کو بھی چھپائے ہوئے تھے۔

تماشائیوں میں اکثریت بے خبر مسلمانوں کی تھی۔ انہیں بس اتنا ہی معلوم تھا کہ یہ باغیوں کے سر ہیں اور یہ عورتیں باغیوں کے خاندان کی ہیں جنہوں نے اسلامی مملکت کے خلاف بغاوت کی تھی اور مسلمان فوجیوں نے انہیں کچل کر رکھ دیا ہے۔ ایسے لوگ خوشی سے ناچ رہے تھے اور قیدیوں پر طرح طرح کے جملے کس رہے تھے۔

چھتوں پر بیٹھی ہوئی کئی عورتوں نے اپنے بچوں کے سروں سے روٹی کے ٹکڑے اور کھجوریں مس کیں اور صدقے کے طور پر انہیں قیدی بچوں کی طرف پھینکا۔ یہ چھوٹے بچے تھے ان کے ہاتھ کھلے ہوئے تھے۔ بچوں نے ان کھجوروں کو منہ میں رکھا ہی تھا کہ علی ابنِ ابی طالبؑ کی چھوٹی بیٹی ام کلثوم نے چیخ کر کہا۔ ”بچو خبردار! یہ صدقہ ہے اور صدقہ آل محمدؐ پر حرام ہے۔“ یہ سننا تھا کہ بچوں نے کھجوریں زمین پر پھینک دیں۔

ایک عورت نے چھت پر سے یہ منظر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ اس نے چھت کی منڈیر پر جھک کر جنابِ ام کلثومؑ سے کہا۔ ”تم جیسے معزز قیدی میں نے آج تک نہیں دیکھے۔ تم لوگ ہو کون ؟“

”ہم رسول اسلامؐ کی اولاد ہیں۔“ جنابِ ام کلثومؑ نے جواب دیا۔ یہ سن کر اس عورت نے اپنا سر پیٹنا شروع کر دیا اور ”وامحمدا“ ”واعلیا“ کہہ کر بین کرنے لگی۔

یہ بات ایک عورت سے دوسری عورت تک پہنچی۔ انہوں نے کئی مردوں کو بتایا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہنسنے والے آنسو بہانے لگے۔ انہیں تو بتایا گیا تھا کہ یہ باغیوں کے سر

ہیں مگر اب انہیں معلوم ہوا کہ ان کی بے خبری میں دشمن اسلام پر ایک قیامت گزر گئی ہے۔

قافلہ بازار کوفہ کے بیچوں بیچ رکا ہوا تھا۔ باجوں کی آوازوں، فوجیوں کے نعروں اور لوگوں کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی کہ اچانک اونٹ پر بیٹھی ہوئی ایک خاتون کے لبوں کو حرکت ہوئی۔ یہ امام حسینؑ کی بہن حضرت زینب بنت علیؑ تھیں۔ پھر ایک آواز بلند ہوئی۔ "خاموش ہو جاؤ!"

سینکڑوں باجوں، ہزاروں نعروں اور بے شمار آوازوں کو چیرتی ہوئی یہ آواز کوفے کے در و دیوار سے ٹکرا کر گونجی تو خوشی کے شادیانے بجاتے لوگ، چیختے ہوئے فوجی، شور مچاتے بچے، اچھلتے ہوئے گھوڑے اور بلبلاتے ہوئے اونٹ ایک لمحے میں ساکت ہو کر رہ گئے۔ اس آواز میں ایک ایسی عجیب کیفیت تھی کہ ایک لمحے میں ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ جو جہاں تھا خاموش ہو گیا تھا۔ اس آواز نے ہر شخص کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔

حضرت زینب بنت علیؑ نے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو اپنی ہتھیلیوں سے خشک کیا پھر آسمان کی طرف دیکھا اور کہا

"حمد ہے اللہ رب العالمین کی تعداد میں اتنی زیادہ جتنے کہ صحراؤں میں ریت کے ذرات اور پتھروں کے ٹکڑے ہیں اور وزن میں اس قدر جتنا کہ آسمان سے زمین تک تمام چیزوں کا وزن ہے۔ میں اس کی تعریف کرتی ہوں۔ اسی پر میرا ایمان اور میرا بھروسا ہے اور میں اس بات کی گواہی دیتی ہوں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اس کا کوئی شریک نہیں۔ محمد مصطفیٰ

اس کے بندے اور رسولؐ ہیں۔"

اس کے بعد آپ نے ہجوم پر ادھر سے ادھر نظر دوڑائی اور کہا:

"اور یہ حقیقت بھی میں تم سب کو بتا رہی ہوں کہ اللہ کے اس آخری رسولؐ کی اولاد نہر فرات کے کنارے بغیر کسی جرم کے ذبح کر دی گئی ہے۔ اے میرے پالنے والے میں تجھ سے پناہ مانگتی ہوں اس بات سے کہ میں تجھ پر جھوٹ باندھوں۔ علیؑ جن کا حق چھین لیا گیا اور جنہیں اسلام کا دعویٰ کرنے والوں کے سامنے اللہ کے گھر میں قتل کر دیا گیا تھا کل ان کی اولاد کو بھی کربلا کے میدان میں شہید کر دیا گیا ہے۔"

جنابِ زینبؑ کی آواز شدت غم سے رندھنے لگی۔ ہجوم پر سناٹا طاری تھا۔ اس سناٹے میں اب سسکیوں کی آوازیں ابھرنے لگی تھیں۔ چھتوں پر بیٹھی ہوئی عورتوں اور بازار میں کھڑے ہوئے مردوں کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ جنابِ زینبؑ نے ان چہروں کو افسوس بھری نگاہوں سے دیکھا اور گرجدار آواز میں ان سے مخاطب ہوئیں:

"اے فریب دینے والو' اے دھوکے باز کوفیو' اے غدار لوگو! اب نہ کبھی تمہارے آنسو رکیں اور نہ کبھی تمہارا رونا بند ہو۔ تم نے ایمان کو ایک دوسرے کی گردن کاٹنے کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ تم میدانِ جنگ میں بزدل' دشمن سے مقابلہ کرنے سے معذور' بیعت کر کے توڑنے والے اور وعدہ کر کے مکر جانے والے ہو۔

آج روتے ہو! ہاں خدا کی قسم تمہیں رونا زیادہ اور ہنسنا کم چاہیے۔ تم نے ہمیشہ رہنے والی شرمندگی اور ہمیشہ باقی رہنے والی لعنت حاصل کر لی ہے۔ یہ وہ داغ ہے جسے تم قیامت تک نہیں مٹا سکو گے۔

اللہ کے آخری رسول کا بیٹا حسینؑ تو نوجوانانِ جنت کا سردار تھا۔ وہ تمہاری نیکیوں کی پناہ گاہ اور تمہاری مشکلات میں تمہارا مددگار تھا۔ اسی کو تم نے ساتھ نہ دے کر اکیلا کیا اور پھر شہید کر دیا۔

لعنت ہو تم پر! تمہارے تمام اعمال ضائع ہو گئے۔ تمہارے ہاتھ بدنام ہو گئے۔ تم نے اللہ کے عذاب کو خریدا ہے۔ اب ہمیشہ کی ذلت اور بدنامی تمہاری قسمت بن چکی ہے۔

ہجوم میں موجود لوگ بے جان مجسموں کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ ان کے سر جھک گئے تھے۔ آنسو سسکیوں میں، سسکیاں کراہوں میں اور کراہیں چیخوں میں بدل رہی تھیں کہ ایک مرتبہ پھر علی ابن ابی طالبؑ کی بیٹی کی جسموں کو لرزانے اور روحوں کو جھنجوڑنے والی آواز بلند ہوئی۔ لوگوں نے سر اٹھا کر ایک لمحے کو ان کی طرف دیکھا اور دوبارہ سر جھکا لیے۔ حضرت زینب بنت علیؑ کی آنکھوں سے آنسو امنڈ رہے تھے اور وہ ان آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے اب یزیدی فوجیوں سے مخاطب تھیں۔

"بربادی تمہارا مقدر بن جائے تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ محمدؐ کے جگر کے کس ٹکڑے کو تم نے ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے؟ محمدؐ کا کون سا خون تم نے بہایا ہے؟ محمدؐ کی کن بیٹیوں کے سروں سے چادریں چھین کر تم نے انہیں قیدی بنایا ہے؟

تم نے ایک عظیم گناہ کیا ہے۔ پھر بھی تمہیں اس بات پر حیرت ہے کہ آسمان سے خون کیوں برسا۔ ارے نواسۂ رسولؐ کا قتل تو ایسا عظیم گناہ تھا کہ اگر آسمان گر جاتا' زمین پھٹ جاتی اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتے تب بھی تعجب نہ ہوتا۔

اور ہاں سنو! اللہ کی طرف سے دی گئی اس مہلت سے کسی خیال میں نہ رہنا۔ وہ جلد عذاب نازل کرنے کی بھی طاقت رکھتا ہے اور اس سے ہمیں یہ خوف بھی نہیں ہے کہ وہ ہمارا انتقام نہیں لے گا۔"

کراہیں' بے اختیار چیخوں میں بدل گئی تھیں۔ ہر طرف سے رونے اور چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ عورتوں کے گریبان اور مردوں کی ڈاڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو چکی تھیں۔ تماش بین بچے کھیل تماشا بھول کر زار و قطار روئے جا رہے تھے۔ کوفے کے در و دیوار لرز رہے تھے۔ زینب بنتِ علیؑ اب خاموش تھیں مگر ان کا چہرۂ مبارک آنسوؤں سے تر بہ تر ہو رہا تھا۔

کوفے کے گورنر کی سرکاری رہائش گاہ ابھی سجائی جا رہی تھی۔ دربار کی تزئین و آرائش مکمل ہونے میں ابھی دیر تھی اس لئے قافلے کو شہر کے داخلی دروازے کے قریب روک دیا گیا۔

اچانک ہجوم میں موجود چند لوگوں کو اپنے سروں کے اوپر تلاوت قرآن کی آواز سنائی دی۔ لوگوں نے حیرت سے سر اٹھایا۔ ایک اونچے نیزے پر ایک کٹا ہوا سر بلند تھا۔ جسم سے الگ ہو جانے والا یہ چہرہ اگرچہ خون میں ڈوبا ہوا تھا لیکن اس چہرے پر زندگی کے آثار واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں پیشانی چمک رہی تھی،

ہونٹ آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے اور تلاوت قرآن کی آواز انہی ہونٹوں سے نکل رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر لوگ سکتے میں رہ گئے مجمع پر سکوت چھا گیا۔ حضرت امام حسینؑ کے ہونٹ سورۂ کہف کی ایک آیت تلاوت کر رہے تھے۔ "کیا تمہارا گمان ہے کہ اصحابِ کہف اور رقیم ہماری عجیب نشانیوں میں سے تھے۔"

یہ دیکھ کر کئی لوگ روتے روتے غش کھا کر گر پڑے اور بہت سے لوگ چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ یزیدی فوجیوں نے یہ منظر دیکھا تو تازیانے لے کر ہجوم کی طرف بڑھے اور مجمع کائی کی طرح پھٹنے لگا۔

ابنِ زیاد فتح کی خوشی میں زرق برق لباس پہنے اپنے محل میں ٹہل رہا تھا اور محل سے باہر کوفے کے بازاروں، گلی کوچوں اور گھروں میں زنجیروں کی گونج سے یزید کی دائمی شکست کا آغاز ہو چکا تھا۔ آج لوگوں نے اللہ کی ایک ایسی نشانی دیکھی تھی جو اصحاب کہف کے واقعے سے کہیں بڑھ کر عجیب تھی۔

محل میں زلزلہ

یزیدی گورنر خاندان رسولؐ کے قیدیوں کو اپنے ظلم اور شان
و شوکت سے متاثر کرنا چاہتا تھا لیکن کربلا کے قیدی اس کی
شان و شوکت کو اپنے قدموں سے روندنے والے تھے!

باب۔ ۹

آگ برساتا سورج مغرب کی طرف جھکنے لگا تھا لیکن گرمی اور حبس میں ابھی کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ گرم ہوا چہروں کو جھلسا رہی تھی۔ زمین سے گرمی کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ پوری گزر گاہ پر کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ ہجوم تھا کہ ہر طرف سے امنڈا ہی چلا آرہا تھا۔ اس ہجوم کی عجیب حالت تھی۔ جن لوگوں تک قیدیوں کی آوازیں پہنچ رہی تھیں وہ آنسو بہا رہے تھے اور جو لوگ باہر سے اس ہجوم میں آکر شامل ہو رہے تھے ان کے چہروں پر خوشیاں ناچ رہی تھیں۔

قافلہ اب کوفے کے دارالامارہ (گورنر ہاؤس) کے قریب پہنچ چکا تھا. ایسے میں قیدی خواتین نے سر اٹھا کر دارالامارہ کے اونچے محرابی دروازے کی طرف دیکھا تو ایک قیدی خاتون کے منہ سے بے اختیار دردناک چیخ نکل گئی اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں فریاد کی۔ ”عقیل کے مظلوم بیٹے! تمہیں غربت اور تنہائی میں مار دیا گیا۔ تمہارے دو بچے کوفے میں قتل کیے گئے اور دو بچے کربلا کے ریگ زار میں اپنے ماموں حسین ابن علیؑ پر قربان ہو گئے اور۔۔۔ میری حالت آپ دیکھ ہی رہے ہیں میرے شریک حیات!“

اس دردناک آواز نے سننے والوں کے دلوں کو تڑپا دیا۔ یہ آواز علی ابن ابی طالبؑ کی بیٹی حضرت ابوالفضل عباسؑ کی بہن اور مسلم بن عقیل کی بیوہ جناب رقیہ کی تھی۔ ہر شخص نے اس آواز کو سنتے ہی بے اختیار اس سمت دیکھا جدھر حضرت مسلم بن عقیل کی بیوہ دیکھ رہی تھیں۔ محرابی دروازے کے درمیان سفیرِ حسینؑ مسلم بن عقیل کا سر لٹکا ہوا تھا۔ ان کا چہرہ زخموں سے بھرا ہوا تھا اور داڑھی چہرے کے خون سے چپکی ہوئی تھی۔

حضرت علی ابن الحسینؑ کی گردن میں بندھی ہوئی رسی ڈھیلی ہو کر کھل گئی تھی۔ اب وہ اونٹ پر سیدھے ہو کر بیٹھے تھے۔ آپ کے پاؤں اب بھی اونٹ کے پیٹ سے بندھے ہوئے تھے اور ان سے خون رس رہا تھا۔

کوفے کے بہت سے بے خبر مسلمان دارالامارہ کے محرابی دروازے پر لٹکے ہوئے اس سر کو ابھی تک حکومت اسلامی کے کسی باغی کا سر سمجھتے رہے تھے لیکن اب حکومت کے پروپیگنڈے کے پردے ایک ایک کر کے چاک ہوتے جا رہے تھے۔ بازار کوفہ میں حضرت زینب بنت علیؑ نے بے پناہ بہادری کے ساتھ جو تقریر کی تھی اس نے کوفے کے باشندوں کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ یہ قیدی عورتیں اور بچے کسی باغی کے خاندان سے تعلق نہیں رکھتے۔ رسیوں میں جکڑی ہوئی یہ بھوکی پیاسی عورتیں اور بچے تو اللہ کے آخری رسول کی اولاد ہیں۔ تماشائیوں میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جن کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ان کے پیارے رسول کی اولاد کو اس طرح قیدی بنایا جا سکتا ہے حالانکہ مسجدوں میں آج بھی انھی پر درود و سلام پڑھا جا رہا تھا اور حکومت اسلامی اسی رسولؐ کے نام سے قائم تھی۔

حضرت علی ابن الحسینؑ کے بخار کی شدت کم ہو چکی تھی۔ آواز کی نقاہت دور ہو

گئی تھی۔ آپ نے حضرت مسلم بن عقیلؑ کے سر کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز میں سلام کیا تو سارے مجمع کی نظریں دوبارہ بے اختیار دار الامارہ کے دروازے پر ایک مہینے سے لٹکے ہوئے سر کی جانب اٹھ گئیں۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ سر بھی رسول اللہؐ کے خاندان کے کسی فرد کا ہے جسے نو ذی الحجہ کو ابن زیاد کی فوج نے چاروں طرف سے گھیر کر گرفتار کیا تھا اور بعد میں انہیں دار الامارہ کی چھت سے گرا کر شہید کر دیا گیا تھا۔

حضرت علی ابن الحسینؑ کی آواز درد و غم میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس آواز کو سن کر لوگوں کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ آنسو بہاتے' آہیں بھرتے اس مجمع میں سے امام سجادؑ کو کسی کی آواز سنائی دی۔

"یہ نوجوان کون ہے؟" مجمع میں سے کسی نے پوچھا تھا۔

"ایسا نورانی چہرہ تو میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔" ایک ادھیڑ عمر آدمی حیرت سے بولا۔

اس وقت امام زین العابدینؑ حضرت علی ابن الحسینؑ بائیس برس کے جوان تھے۔ کمزوری، نقاہت اور سفر کے گرد و غبار کے باوجود آپ کا چہرۂ مبارک ہزاروں میں الگ نظر آتا تھا۔ آپؑ نے اچٹتی سی نظروں سے ان دونوں کو دیکھا۔ پھر آپؑ نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

مجمع میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ باخبر بھی اور بے خبر بھی۔ یہ سارے ان کے نانا کے امتی تھے، ان کے نانا کا کلمہ پڑھنے والے۔ ان سے عقیدت و محبت کا دم بھرنے والے، نمازوں میں رسولؐ اور اس کی اولادؑ پر درود و سلام بھیجنے والے! لیکن آج جب اللہ نے ان کی محبت کا امتحان لیا تو یہ سارے مسلمان غیر جانبدار ہو کر کھڑے تھے اور اپنے

رسول کی اولاد کا تماشہ دیکھ رہے تھے یا مگر مچھ کے سے آنسو بہا رہے تھے۔ ان کا ایمان ان کی زبانوں تک محدود تھا۔ انہیں اپنے گھر، اپنی اولاد، اپنی جان اور اپنی عزت، اللہ کے رسولؐ کے گھر، اولاد اور عزت سے زیادہ پیاری تھی۔

قافلے کے نگران فوجی چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ شہیدوں کے سر نیزوں پر ساکت تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے لوگوں نے رسولؐ کے نواسے حسینؑ ابن علی کے کٹے ہوئے سر کو سورۂ کہف کی تلاوت کرتے سنا تھا۔ اس حیرت ناک واقعے نے ظالم فوجیوں تک کو ہیبت زدہ کر دیا تھا۔

امام علی ابن الحسینؑ نے وقت کے اس سناٹے اور دلوں کے نرم ہونے کی کیفیت کو محسوس کیا اور بلند آواز سے اللہ رب العالمین کی حمد و ثنا بیان کرنا شروع کی۔ سب لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

عزیزوں کے کٹے ہوئے سروں، گھر کی کھلے سر عورتوں، رسیوں میں جکڑے ہوئے بھوکے پیاسے بچوں اور ذلت و مصیبت کے ان سخت لمحوں میں اپنے رب کی حمد و ثنا بیان کرنا، اور اس کا شکر ادا کرنا کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ ایسے حالات میں تو بندے اللہ کے وجود ہی کا انکار کر دیتے ہیں۔ ایسے ماحول میں امام علی ابن الحسینؑ کو اپنے رب کا شکر ادا کرتے دیکھ کر لوگ سمجھ گئے کہ یہ شخص کوئی عام انسان نہیں۔ ایسے واقعات تو انہوں نے اللہ کے برگزیدہ نبیوں ہی کے بارے میں سنے تھے۔

اللہ کی حمد و ثنا بیان کرنے کے بعد امام سید سجادؑ نے اللہ کے رسولؐ اور ان کے اہل بیتؑ پر درود و سلام بھیجا پھر آپ نے اپنے اونٹ کے قریب باتیں کرتے ان دونوں افراد پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی جنہوں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ یہ نوجوان کون ہے۔

اس کے بعد آپ نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں، لوگوں کے آنکھوں
میں آنکھیں ڈالیں اور فرمایا:

"اے لوگو! جو مجھے پہچانتا ہے وہ تو جانتا ہے مگر جو مجھے نہیں پہچانتا
اسے میں بتائے دیتا ہوں کہ میں کون ہوں!
میرا نام علی ہے۔ میں رسولؐ کے نواسے حسینؑ ابن علیؑ کا بیٹا ہوں۔
میں رسولؐ کی اکلوتی بیٹی، عالمین کی عورتوں کی سردار، فاطمۃ
الزہراؑ اور امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ کا پوتا ہوں۔
میں اس کا بیٹا ہوں جس (عظیم انسان) کی بے حرمتی کی گئی، جس کا
سامان لوٹ لیا گیا، جس کے گھر کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا
گیا ہے۔
میں اس (عظیم انسان) کا بیٹا ہوں جسے نہر فرات کے کنارے بھوکا
پیاسا ذبح کر دیا گیا اور اس کے دوستوں، رشتے داروں کی لاشیں
کربلا کے میدان میں بے گور و کفن پڑی ہیں۔"

یہ کہہ کر امام علیہ السلام ذرا دیر کو رکے۔ مجمع سے رونے کی آوازیں بلند ہونے
لگی تھیں۔ امام علی ابن الحسینؑ کی آواز دوبارہ بلند ہوئی:

"لوگو! میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! ذرا اس بات پر تو غور کرو کہ
میرے عظیم باپ کو تم نے ہی تو خط لکھ کر یہاں آنے کی دعوت
دی تھی پھر خود تم ہی نے انہیں دھوکا دیا۔ ان سے ساتھ دینے
کا وعدہ کیا، مسلم بن عقیل کے ہاتھوں پر تم نے حسین ابن علیؑ کی

بیعت کی اور پھر خود تم ہی نے مسلم بن عقیل کو شہید کر دیا۔ تمہارا انجام برا ہو کہ تم نے تو اپنے ہاتھوں سے دنیا و آخرت کی رسوائی خرید لی ہے قیامت کے دن آخر تم کس طرح اللہ کے رسول کو منہ دکھا سکو گے جب کہ تم ان کی اولاد کے قاتل ہو!

اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو (اور اس سلسلے میں کسی غلط فہمی یا خوش فہمی میں نہ رہنا) رسول اللہ قیامت کے دن تم سے ضرور یہی کہیں گے کہ تم لوگوں نے میرے اہل بیت کو قتل کیا، میرے گھر کی عورتوں کو بے پردہ کیا، میرے بچوں کو قیدی بنایا۔ (تمہارا یہ جرم قابل معافی نہیں) اس لیے تم میری امت میں سے ہرگز نہیں ہو۔"

اتنا کہنے کے بعد حضرت علی ابن الحسین خاموش ہو گئے۔ مرد، عورتیں اور بچے آنسو بہاتی آنکھوں سے ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے اور چیخیں مار کر رو رہے تھے۔ بے شمار لوگ مجمع کو چیرتے ہوئے امام زین العابدین کے اونٹ کی جانب بڑھنے لگے۔ عورتوں نے اپنے سروں سے چادریں اور مردوں نے اپنی ٹوپیاں اتار اتار کر خاندان رسول کی قیدی عورتوں کی طرف پھینکنا شروع کر دیے۔

اچانک قافلے کی حفاظت کرنے والے یزیدی فوجیوں کو ہوش آیا۔ انھوں نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور ننگی تلواریں ہوا میں لہراتے ہوئے مجمع کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکانے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مجمع کائی کی طرح چھٹنے لگا۔ عورتوں اور مردوں نے اپنے اپنے بچوں کے ہاتھ پکڑے اور بدحواسی کے عالم میں ادھر ادھر بھاگنے لگے۔

اچانک گھوڑوں کی ٹاپوں سے راستہ گونجنے لگا۔ دار لامارہ کی طرف سے ابن زیاد کی فوج کا خصوصی دستہ اس طرف آرہا تھا۔ قافلے کی حفاظت کرنے والے فوجیوں اور نیزوں پر شہیدوں کے سروں کو اٹھانے والے گھڑ سوار دوبارہ ترتیب کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ وہ سمجھ گئے کہ حاکم کوفہ عبید اللہ ابن زیاد کا دربار سج چکا ہے اور یہ خصوصی دستہ قافلے کو لینے کے لئے ادھر آرہا ہے۔

☆☆☆

دارالامارہ کی عمارت پر نیا رنگ وروغن کیا گیا تھا۔ راہداریوں اور دروازوں پر رنگ برنگے کپڑے لہرا رہے تھے۔ سرکاری حکام اور فوجی افسروں نے خوش رنگ لباس پہن رکھے تھے۔ دربار کے غلام مخصوص وردیوں میں ملبوس تھے۔ ان کی کمر پر سنہری پٹکے بندھے ہوئے تھے۔ دربار میں داخلے کے دروازے کی دونوں طرف ننگی تلواریں لیے ہوئے فوجی مستعد کھڑے تھے۔ قافلے کی ساری گزرگاہ پر جگہ جگہ نقارے، دف اور ڈھول بجائے جارہے تھے۔

ابن زیاد کی فوج کے خصوصی دستے کے گھڑ سوار دارالامارہ کے اندر داخل ہونا شروع ہوئے۔ ان کے سجے سجائے گھوڑوں کے پیچھے ان فوجیوں کا دستہ تھا جو کربلا سے کوفے تک شہداءؑ کے سروں کو نیزوں پر بلند کر کے یہاں لائے تھے۔ یہ فوجی اب پیدل چل رہے تھے۔ شہداءؑ کے سروں کو انہوں نے نیزوں پر بلند کر رکھا تھا۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سمارہے تھے اور بار بار نعرہ تکبیر بلند کررہے تھے۔

ان وحشی درندوں کے بعد قیدی عورتوں اور بچوں کی قطار تھی۔ ان سب قیدیوں کو اب اونٹوں سے اتار کر ایک لمبی رسی میں باندھ دیا گیا تھا۔ قیدیوں میں سب سے آگے

حضرت علی ابن الحسینؑ تھے جو گردن جھکائے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ اگر آپ سیدھے ہو کر چلتے تو کئی معصوم بچے جن کی گردنیں رسی سے بندھی ہوئی تھیں ہوا میں معلق ہو جاتے۔ یہی حال حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی بیٹیوں اور بہوؤں کا تھا۔ یہ عظیم المرتبت خواتین بھی اسی طرح گردن جھکائے آگے قدم بڑھا رہی تھیں۔

یہ سارے انتظامات یزید کے گورنر عبیداللہ ابن زیاد کے حکم پر کئے گئے تھے۔ اس کا مقصد تھا کہ رسول اسلامؐ کے خاندان کو عوام کے سامنے اس قدر ذلیل و رسوا کیا جائے کہ لوگ ان کی طرف سے مایوس اور بدظن ہو جائیں۔ لوگ یہ سوچنے لگیں کہ رسول اللہؐ تو خود کو اللہ کا حبیب اور دوست کہتے تھے۔ اگر وہ اللہ کے دوست ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان کے خاندان کو اس طرح ذلیل و رسوا یوں کرتا؟

کچھ دوسرے لوگ اس طرح سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ رسول اللہؐ نے بتایا تھا کہ زمین و آسمان کے لشکر اللہ کے ہیں۔ پھر اس وقت اللہ کے لشکر کہاں گئے کہ اس کے حبیب محمد مصطفیٰؐ کے گھر کی عورتیں بے پردہ اور رسیوں میں بندھی ہوئی ہیں۔ لوگ ان کا مذاق اڑا رہے ہیں لیکن اللہ کے لشکر حرکت میں نہیں آتے۔ شاید محمدؐ کا یہ دین بس خود ان کا بنایا ہوا کوئی ڈرامہ ہے۔ اگر ان کا مذہب حق ہوتا تو اس وقت زمین پھٹ جاتی، آسمان سے آگ برستی اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتے۔

یزید اور اس کی حکومت کا مقصد کسی نہ کسی طرح دین اسلام کو بدنام کرنا تھا۔ بنوامیہ کی اصل دشمنی دین اسلام سے تھی جس کی آمد کی وجہ سے عربوں پر ان کے خاندان کی سرداری ختم ہو گئی تھی۔ اسلام کے بعد ان کی سب سے زیادہ دشمنی علی ابن ابی طالبؑ کے خاندان سے تھی جنہوں نے اپنی مستقل مزاجی، بہادری اور لازوال

قربانیوں کے ذریعے دشمنانِ اسلام کی ہر سازش کا مقابلہ کیا تھا۔ اس خاندان نے اپنی جانوں کی قربانی پیش کر کے کفر و شرک کے ہر حملے کو ناکام بنایا تھا۔ علی ابن ابی طالبؑ اس خاندان کے سربراہ تھے اور انہوں نے اپنی خداداد طاقت کے ذریعے یزید کے بہت سے بزرگوں کو مختلف جنگوں میں تلوار سے زیر کیا تھا۔ علی ابن ابی طالبؑ کی تلوار سے مرنے والے وہی مغرور انسان تھے جنہوں نے اللہ سے مقابلہ کرنا چاہا تھا اور جو شخص اللہ سے مقابلہ کرتا ہے اس کا ٹھکانہ جہنم کے علاوہ کہیں اور نہیں ہوتا۔

قیدیوں کو اب عبید اللہ ابن زیاد کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا۔ عبید اللہ ابن زیاد کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔ وہ غرور و تکبر کا مجسمہ بنا ہوا ایک اونچی کرسی پر بیٹھا تھا۔

سب سے پہلے شمر ذی الجوشن آگے بڑھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چاندی کی ایک تھالی پکڑ رکھی تھی۔ اس تھالی میں حضرت امام حسین ابن علیؑ کا کٹا ہوا سر رکھا تھا۔ اس کے پیچھے اٹھارہ فوجی تھے جنہوں نے خاندانِ رسولؐ کے اٹھارہ شہیدوں کے سروں کو نیزوں پر اٹھا رکھا تھا۔ شمر ذی الجوشن نے آگے بڑھ کر امام حسینؑ کا سر ابن زیاد کے سامنے پیش کرنا چاہا۔

"نہیں ایسے نہیں۔" ابن زیاد نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ شمر ذی الجوشن اپنی جگہ ٹھہر گیا۔ "تم نے حسینؑ کے سر کو چاندی کی تھالی میں کیوں رکھا؟ حسین کے نانا نے ہم مردوں پر سونے کا استعمال حرام کیا تھا اس لئے آج حسینؑ کے سر کو سونے کی تھالی میں رکھ کر ہمارے سامنے پیش کرو۔" ابن زیاد وحشیوں کی طرح ہنسنے لگا۔

اسی وقت ایک غلام باہر گیا اور سونے کی تھالی لے کر آ گیا۔ شمر نے امام مظلوم کے سر کو تھالی میں رکھ کر ابن زیاد کے سامنے پیش کیا۔ ابن زیاد نے تھالی کو پکڑا اور

رکھنے کا حق ہے۔ اور یہ جو تو ہماری رسوائی کی بات کر رہا ہے تو کان
کھول کر سن لے کہ رسوا اور ذلیل وہ لوگ ہوتے ہیں جو تیری
طرح بدکردار ہوں اور جھوٹ وہ لوگ بولتے ہیں جو تیری طرح
گناہ کبیرہ کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہوں۔ اللہ کا احسان ہے کہ ایسے
لوگ ہمارے دشمن ہی ہیں۔"

جناب زینبؑ کے یہ جملے ابن زیاد پر بجلی کے کوندے کی طرح گرے تھے۔ سچ کی تلوار کا یہ پہلا وار تھا جس نے ابنِ زیاد کے مسکراتے چہرے کو بھرپور طریقے پر مسخ کر دیا تھا۔ جناب زینبؑ کے آخری جملے نے بھرے دربار میں وہ حقیقت آشکار کر دی تھی جسے ابنِ زیاد خود اپنے سے بھی چھپانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے دل میں غصے کا الاؤ بھڑکنے لگا تھا لیکن اس نے اپنی ذلت اور شرمندگی کو اپنی مسکراہٹ میں چھپاتے ہوئے کہا۔ "اگر اللہ اہل بیتؑ سے محبت کرتا ہے تو تمہارے اہل بیتؑ کے ساتھ اس نے کیا سلوک کیا؟" اس نے طنز آمیز لہجے میں پوچھا۔

حضرت زینب بنت علیؑ کے چہرۂ مبارک پر یقین و اعتماد کا نور پھیلا ہوا تھا۔

"اہل بیتؑ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟" آپؑ نے اسی کا جملہ دہرایا۔

"میرے مہربان مالک نے میرے اہل بیتؑ کے ساتھ وہی سلوک
کیا جو اس کی رحمت اور اہل بیتؑ کی عظمت کے شایان شان تھا۔
اس نے اہل بیتؑ کو شہادت جیسے عظیم مرتبے پر فائز کیا اور تو کیا
جانے کہ شہادت کسے کہتے ہیں لیکن بہت جلد میرا مہربان مالک
تجھے اور اہل بیتؑ کو (میدان حشر میں) جمع کرے گا۔ وہ اپنا دعویٰ

دائر کریں گے اور اللہ سے انصاف طلب کریں گے۔ اس دن دیکھ لینا مرجانہ کے بد نصیب بیٹے! کہ کون کامیاب ہوتا ہے اور کون ناکام!"

حضرت زینب بنت علیؑ کے اعتماد نے ابن زیاد کے درباریوں کو لرزا کر رکھ دیا۔

مرجانہ، ابن زیاد کی ماں کا نام تھا جو زیاد کی بیوی تھی لیکن طلوع اسلام سے پہلے ایک رات اس نے دشمن اسلام ابو سفیان کے ساتھ گزاری تھی جس کے نتیجے میں ابن زیاد پیدا ہوا تھا اور اسی حرام کے رشتے کی بنیاد پر یزید کے باپ نے ابن زیاد کو اپنا بھائی بنالیا تھا۔

اپنی ذلت و رسوائی ابن زیاد کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ وہ کس طرح برداشت کر سکتا تھا کہ ساری دنیاوی کامیابیوں کے باوجود لوگ اسے ایک کمزور اور ناکام آدمی سمجھیں۔ اس نے غصے سے بپھر کر اپنے ایک غلام کو اشارہ دیا۔ "اس عورت کی گردن اڑا دو۔"

غلام کے آگے بڑھنے سے پہلے عمرو ابن حریث نامی ایک شخص بے اختیار آگے بڑھا اور اس نے ابن زیاد سے کہا۔ "اے امیر! یہ مجبور و بے کس عورت ہے۔ یہ تمہارا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ عورتوں سے اس طرح سختی سے پیش آنا مناسب نہیں۔"

ابن زیاد نے غصے میں یہ حکم تو دے دیا تھا لیکن وہ چاہتا تھا کہ کوئی اسے اس کام سے روکے۔ وہ جانتا تھا کہ خاندان رسالت کے مردوں کے قتل کے بعد رسول اللہ کی نواسی کا قتل اس کے لئے کوئی بڑی مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔ اس نے اپنے غصے کو ضبط کیا اور ہاتھ اٹھا کر اپنے غلام کو روک دیا۔

اسی وقت ابن زیاد کے کانوں میں ایک نوجوان کی آواز آئی۔ ''ابن زیاد! اللہ تیرے ہاتھوں اور پیروں کو کاٹے۔اے ظالم! تو کب تک آخر بنت زہراؑ کا دل جلاتا رہے گا؟''

ابن زیاد نے گردن گھمائی اور اس نوجوان کی طرف دیکھا جو قیدیوں کے لباس میں ہوتے ہوئے بھی عزم وہمت کی لازوال تصویر بنا ہوا تھا۔ ''تم کون ہو؟'' ابن زیاد نے غرور بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''میں حسین ابن علیؑ کا بیٹا ہوں۔ علی ابن الحسینؑ!'' امام سجادؑ نے بھرپور اعتماد سے جواب دیا۔

''کیا اللہ نے علی ابن الحسین کو قتل نہیں کیا؟'' ابن زیاد نے حیرت سے اپنے فوجی سرداروں کی طرف دیکھا۔ اس کے فوجیوں نے بتایا تھا کہ ہم نے حسینؑ کے بیٹے علیؑ کو قتل کر دیا ہے۔

''اللہ کی راہ میں شہادت پیش کرنے والے وہ میرے بھائی تھے علی اکبرؑ!'' جناب سجادؑ نے جواب دیا۔ ''میں زندہ ہوں۔ اللہ جب چاہے گا مجھے بھی اس رتبے سے سرفراز فرمائے گا۔''

امام سجادؑ کی آواز میں ایسی تیزی تھی کہ ابن زیاد غصے سے بے قابو ہو گیا۔ ''تجھ میں ابھی تک اتنی جرأت ہے کہ مجھے اس طرح دوٹوک جواب دے سکے!'' اس نے جھنجلاتے ہوئے کہا اور اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر حکم دیا کہ اس نوجوان کو لے جاؤ اور باہر لے جا کر قتل کر دو۔''

یہ سن کر جناب زینب بنت علیؑ اپنے بھتیجے کے سامنے آگئیں۔ ''اللہ کے دشمن! اگر اسے قتل کرنا ہے تو پہلے مجھے قتل کر دے۔۔۔!'' حضرت زینبؑ کے لہجے میں

چٹانوں کی سی سختی تھی۔

ابن زیاد نے اپنے جلاد کو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ حضرت علی ابن الحسینؑ نے اپنی پھوپی کو اپنے سامنے سے ہٹایا اور آگے بڑھ کر ابن زیاد سے مخاطب ہوئے۔ "ابن زیاد! تو مجھے قتل سے ڈرانا چاہتا ہے۔ تجھے ابھی تک یقین نہیں آیا کہ اللہ کی راہ میں قتل ہونا ہماری عادت اور شہادت ہمارے خاندان کا طرۂ امتیاز ہے۔"

ان کی بات سن کر ابن زیاد ایسا بن گیا جیسے اس نے یہ بات سنی ہی نہ ہو۔ "تم میں سے اُم کلثوم کون ہے؟" اس نے موضوع بدلا۔

"تو کیا چاہتا ہے؟" جناب ام کلثومؑ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم سب لوگ جھوٹے ہو۔ تمہارا جد (رسول اسلامؐ) بھی جھوٹا تھا۔ اسی لیے خدا نے تمہیں ذلیل و رسوا کر کے میرے قبضے میں دے دیا۔۔۔"

ابن زیاد نے جس طرح رسول اکرمؐ سے اپنی دشمنی اور نفرت کا اظہار کیا تھا ابھی اس کا جملہ نامکمل تھا کہ علی کی بیٹی کی تلوار زبان سے رواں ہو گئی۔ جناب ام کلثومؑ کے لہجے میں بجلی کی سی کڑک تھی۔ "اے گناہ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اللہ کے دشمن! جھوٹ اور بدکاری جیسے گناہوں کے لیے تیری ہی ذات مخصوص ہے۔ میں تجھے جہنم کی آگ میں جلنے کی خوشخبری سناتی ہوں۔" جناب ام کلثومؑ کے لہجے میں ایسی کاٹ تھی کہ ابن زیاد شرمندگی کے پسینے میں نہا گیا۔

ابن زیاد نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کے درباری سکتے کی سی کیفیت میں تھے۔ اس نے اپنی شرمندگی کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم عورت نہ ہوتیں تو میں تمہیں ابھی قتل کرا دیتا۔"

جناب ام کلثومؑ کو جلال آگیا۔ ”تیری ماں پر اللہ کی لعنت ہو جس نے تجھے جنم دیا۔ تو بہت جلد ایسی آگ میں جلے گا جس کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔“

ابن زیاد نے اپنی ندامت چھپانے کے لئے ایک قہقہہ بلند کیا۔ ”ارے اب اگر میں جہنم میں چلا بھی گیا تو پروا نہیں۔ میں نے تمہارا خون بہا کر اپنا دل تو ٹھنڈا کر ہی لیا ہے۔“

ابن زیاد سمجھ چکا تھا کہ وہ ان قیدیوں سے کبھی نہیں جیت سکتا جن کی زبانیں علیؑ کی تلوار کی طرح چلتی ہیں تو منافقوں کے چہروں کو بے نقاب کر دیتی ہیں۔ اس نے مزید بحث کرنے کی بجائے اپنے فوجیوں کو حکم دیا کہ قیدیوں کو لے جا کر قید خانے میں بند کر دو اور امیر المؤمنین یزید ابن معاویہ کے دشمنوں کے کٹے ہوئے سروں کو لے جا کر کوفے کے بازاروں میں گھماؤ تاکہ دوسرے لوگوں کو عبرت حاصل ہو اور حکومت سے ٹکر لینے کا خیال ان کے ذہنوں سے نکل جائے۔

نیزوں پر شہیدوں کے سروں کو اٹھانے والے فوجی ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگے۔ ان سپاہیوں کے جانے کے بعد قیدیوں کے نگراں ہاتھوں میں ننگی تلواریں اور کوڑے سنبھالے آگے بڑھے۔ آل محمدؐ کے قیدی عورتوں اور بچوں نے قدم اٹھانا شروع کر دیے۔ قید خانے کے نگراں ان قیدیوں کو ایک ایسے قید خانے کی طرف لے جا رہے تھے جس کی صرف چار دیواری موجود تھی۔ نہ کوئی چھت تھی نہ کہیں سایہ۔ زمین پر کنکر پتھر اور کوڑے کباڑ کے ڈھیر پھیلے ہوئے تھے۔

روشنی کا سفر

حکومت کے پروپیگنڈے کا پردہ چاک ہو رہا تھا۔ اسلام کی نقاب میں چھپے ہوئے مکروہ چہرے ایک ایک کر کے بے نقاب ہوتے جا رہے تھے۔

باب۔۱۰

جناب عبداللہ ابن عفیفؓ صحابی رسولؐ تھے۔ ان کا تعلق سعی ازد نامی قبیلے سے تھا۔ جناب عمار یاسرؓ، جناب اویس قرنیؓ اور دوسرے صحابہ رسولؐ کی طرح جناب عبداللہؓ بھی جنگ صفین میں حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی فوج میں شامل تھے۔ اس جنگ میں جو شامی حکومت کی جانب سے حکومت اسلامی پر مسلط کی گئی تھی جناب عمار یاسرؓ، جناب اویس قرنیؓ اور بہت سے صحابہؓ شامی فوجیوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے تھے۔ اس جنگ میں جناب عبداللہؓ کی آنکھوں پر زخم آئے تھے جن کی وجہ سے آپؓ کی بینائی ختم ہو گئی تھی۔ جنگ صفین کے دوران ایک سوچی سمجھی سازش کے ذریعے مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوادی گئی اور حضرت علی علیہ السلام کے بہت سے فوجی گمراہ ہو کر امیر المومنینؑ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ بعد میں حضرت علی ابن ابی طالبؑ کو ایک اسرار سازش کے ذریعے شہید کر دیا گیا۔

ان مایوس کن حالات میں اسلام کے بے شمار سچے جانثار ہمت ہار گئے یا مصلحت کے تحت مختلف مقامات پر بکھر کر خاموشی کی زندگی گزارنے لگے۔ جناب اللہ ابن عفیفؓ ایسے ہی افراد میں شامل تھے۔ وہ اب ضعیف ہو چکے تھے۔ بینائی سے

محروم ہونے کے بعد آپؓ کوفے میں گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی اولاد میں صرف ایک بیٹی تھی جو ان کی زندگی کا واحد سہارا تھی۔ ان کا قبیلہ بنی ازد کوفے ہی میں رہتا تھا۔ کوفے میں قیدیوں کی آمد اور جشن فتح میں شرکت کے لئے اس وقت جناب عبداللہؓ اور ان کے قبیلے کے تمام افراد دارالامارہ میں موجود تھے۔

جناب عبداللہؓ کو یہاں آنے سے پہلے معلوم نہیں تھا کہ یہ جشن نواسۂ رسول کو قتل کرنے کی خوشی میں منایا جارہا ہے لیکن دربار ابن زیاد میں جناب زینبؑ، جناب ام کلثوم اور حضرت علی ابن الحسینؑ کی گفتگو سن کر جناب عبداللہؓ کا خون جوش مارنے لگا تھا۔ شاید اللہ تعالٰی نے انہیں آج کے دن ظالم حاکم کے سامنے کلمہ حق کہنے کے لئے زندہ رکھا تھا۔ ان کی آنکھیں خون کے آنسو بہا رہی تھیں۔

قیدیوں کے جانے کے بعد عبیداللہ ابن زیاد ایک اونچے منبر پر جا کر بیٹھ گیا اور اس نے تقریر کرنا شروع کی تاکہ قیدیوں کی جرأت مندانہ تقریروں کے اثرات کو دور کیا جاسکے۔ ''اس اللہ کی حمد ہے جس نے حق اور اہل حق کو غلبہ عطا کیا۔ امیر المؤمنین یزید ابن معاویہ اور ان کے ساتھیوں کو فتح سے ہمکنار کیا اور کذاب ابن کذاب اور اس کے ساتھیوں کو قتل کیا۔۔۔''

ابھی وہ یہیں تک کہہ پایا تھا کہ جناب عبداللہ بن عفیفؓ کو جلال آگیا۔ وہ غصے سے کانپتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے:

''اے دشمن خدا! کذاب (جھوٹا) تو تو ہے اور تیرا وہ باپ (یعنی یزید) جس نے تجھے کوفے کا گورنر بنایا وہ سب سے بڑا جھوٹا ہے۔ وہ جھوٹا ہے اور اس کا باپ جھوٹا تھا۔ اے مرجانہ کے بیٹے! تجھے شرم

نہیں آتی کہ تو خلیفہ رسول علی ابن ابی طالب کو برا کہہ رہا ہے اور
آل رسول کو قتل کر کے اس منبر پر بیٹھا ہوا ہے جو صدیقوں کے
بیٹھنے کی جگہ ہے۔"

جناب عبداللہ نے گرجدار آواز میں ابن زیاد کو للکارا۔ ابن زیاد کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا جناب عبداللہ دوبارہ گرجنے لگے

"خدا تجھ پر، اے ابن زیاد اور تیرے باپ دادا پر لعنت کرے
اور تجھ پر ایسا عذاب نازل کرے کہ تو دنیا میں ذلیل و خوار ہو اور
آخرت میں جہنم تیرا ٹھکانہ قرار پائے۔ کیا حسین علیہ السلام کا قتل
تیرے لئے کافی نہیں تھا کہ اب تو ان کے بزرگوں کو برا بھلا کہہ
رہا ہے۔ خدا کی قسم میں نے اپنے کانوں سے رسول خدا کو یہ کہتے
سنا ہے کہ جس نے علیؑ کو برا کہا اس نے مجھے برا کہا اور جس نے مجھے
برا کہا اس نے اللہ کو برا کہا اور جس نے اللہ کو برا کہا خداوند تعالیٰ
اسے منہ کے بل جہنم کی آگ میں ڈال دے گا۔"

ابن زیاد کے لئے ان کا یہ رد عمل بالکل ہی غیر متوقع تھا۔ وہ غصے کی شدت سے آگ بگولا ہو گیا۔ "اس بڈھے کو پکڑ کر میرے پاس لاؤ۔" اس نے تخت پر بیٹھے ہوئے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔ سپاہی تیزی سے جناب عبداللہ کی جانب بڑھے۔ ابن زیاد کا حکم سن کر جناب عبداللہ نے اپنے قبیلے والوں کو آواز دی۔

ان کے قبیلے کے کئی سو نوجوانوں نے اپنی تلواریں نیاموں سے باہر نکال لیں اور تیزی سے ان کی مدد کے لیے آگے بڑھے۔ [illegible] عبداللہ کے [illegible]

خراش بھی آئی تو پھر یہاں کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔" بنی ازد کا ایک نوجوان تلوار ہوا میں لہراتے ہوئے چیخا۔

ابنِ زیاد کے سپاہیوں کے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ وہ ہاتھ میں تلوار تھامے ساکت کھڑے تھے اور ابنِ زیاد کے حکم کے منتظر تھے۔ ابنِ زیاد کے مکروہ چہرے پر ناگواری کے اثرات تھے۔ اس کے سازشی ذہن نے چند ہی لمحوں میں فیصلہ کیا اور اس کے چہرے پر ایک سفاکانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ "پیچھے ہٹ جاؤ"۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔

سپاہی پیچھے ہٹے تو قبیلہ بنی ازد کے نوجوانوں نے جناب عبداللہ ابنِ عفیفؓ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ جناب عبداللہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ بہ آواز بلند یزید اور ابنِ زیاد کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ ان کے قبیلے والے انھیں اپنے حلقے میں لئے ہوئے دربار ابنِ زیاد سے باہر نکال لے گئے۔

ابنِ زیاد کے چہرے پر سفاکانہ مسکراہٹ جم گئی تھی۔ اس کے شیطانی دماغ میں ایک منصوبہ تیار ہو رہا تھا اور وہ بے اختیار مسکرائے جا رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی چمک تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دربار برخواست کرنے کا حکم دیا۔ جب سب لوگ چلے گئے تو اس نے اپنے وفادار غلام خولی اصبحی کو قریب بلایا اور اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔

☆☆☆

عبداللہ ابنِ عفیفؓ عشاء کی نماز سے فارغ ہوئے تھے کہ ان کے گھر کی گلی گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونجنے لگی۔ خطرے کا احساس ہوتے ہیں عبداللہؓ نے اپنی تلوار

نیام سے باہر نکالی اور ایک تنگ جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اپنی چھوٹی سی بیٹی سے کہا۔ "بیٹی! میری بینائی ختم ہو چکی ہے اس لئے تم بس مجھے آواز دے کر بتاتی رہنا کہ دشمن کس طرف سے حملہ کر رہا ہے۔"

وہ ابھی یہ کہہ ہی رہے تھے کہ یزیدی فوجی دروازہ توڑ کر ان کے گھر میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہونا شروع کیا تو عبداللہؓ کی تلوار چلنے لگی۔ کئی سپاہی مارے گئے مگر آخر کار ابن زیاد کے فوجیوں نے عبداللہؓ کو ہر طرف سے گھیر کر گرفتار کر لیا۔

خولی اصبحی نے انہیں گرفتار کر کے یزیدی گورنر عبید اللہ ابن زیاد کے سامنے پیش کیا۔ عبداللہ ابن عفیف کا دل کربلا سے اٹھنے والی روشنی سے منور ہو چکا تھا۔ ان کی سانسوں میں کربلا کے گلابوں کی خوشبو مہک رہی تھی۔ رسول کریمؐ کا یہ صحابیؓ نواسہ رسولؐ کی محبت سے سرشار تھا۔ انہوں نے ابن زیاد اور اس کے درباریوں کی طرف حقارت کے ساتھ رخ کیا اور بولے

"ابن زیاد! میں نے اپنے دوستوں کو وصیت کر دی ہے کہ وقت آگیا ہے کہ تم دشمنان اسلام کے سامنے ڈٹ جاؤ۔ اپنے گھوڑوں، تلواروں اور نیزوں کا رخ دشمن کی طرف کر دو۔ اپنے دلوں کو حسینؓ کی محبت سے بھر لو جن کے نانا اور باپ بہترین مخلوق اور تمام دنیا والوں کے لئے راہ ہدایت تھے۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ جب سورج مشرق سے طلوع ہو تو تم حسینؓ کی مصیبتوں پر آنسو بہاؤ اور جب رات کے اندھیرے چھانے لگیں تو امام کی

مظلومیت پر گریہ کرو۔ اس قوم پر اللہ کی لعنت ہو جس نے امام حسینؑ کو خط لکھے جبکہ اس قوم میں نہ کوئی دینِ اسلام کا مددگار تھا نہ اپنے وعدوں کو پورا کرنے والا۔۔۔"

ابنِ زیاد کے ہونٹ نفرت سے بھنچے ہوئے تھے اور وہ بے تابی سے اپنی ڈاڑھی کے بالوں کو نوچ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عبداللہؓ اب اس کی گرفت سے نہیں نکل سکتے۔ اسے اب کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ عبداللہؓ کے دل کی باتیں سننا چاہتا تھا تاکہ ان کے ایمان اور ان کے قبیلے والوں کے ممکنہ ردِ عمل کا اندازہ لگا سکے اسی لئے وہ خاموشی سے جناب عبداللہؓ کی تقریر سن رہا تھا۔

عبداللہؓ کے لہجے میں بلا کا درد تھا۔ ان کی بے نور آنکھوں میں عجیب سی چمک آگئی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے :

"کربلا میں جنگ کی آگ بھڑکی تو کوئی ایسا نہیں تھا کہ ان بد کردار یزیدی فوجیوں کو امامؑ سے دور کرتا اور کوئی ایسا نہیں تھا جو کہتا کہ اس پاک و پاکیزہ انسان حسینؑ ابنِ علی کو قتل کر کے عذاب میں گرفتار ہونے سے بچو!

اے اللہ! اس قوم کی سزا ذلت و رسوائی قرار دے جس نے انھیں قتل کیا۔ کاش اس وقت میں ان کے ساتھ ہوتا اور جب تک میری جان میں جان رہتی دشمنوں سے جنگ کر کے ان کی حفاظت کرتا لیکن میری مجبوری سب کو معلوم ہے۔ یہ میری بد قسمتی ہے کہ میں نابینا ہو گیا ہوں۔۔۔"

شہید کربلاؑ کی مظلومیت اور اپنی معذوری کا تصور کر کے ان کا دل پھٹنے لگا۔ انہوں نے کہا:

"حسینؑ کی شہادت سے دنیا ہل کر رہ گئی' اسلام کا مضبوط قلعہ زمین بوس ہو گیا' پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گئے' سورج گہنا گیا' آسمان رونے لگا۔۔۔"

اتنا کہہ کر جناب عبداللہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور بولے۔

"اصحاب حسینؑ تو اپنی راتیں عبادت الٰہی میں گزارتے اور قرآن پڑھتے تھے لیکن ظالم اور گمراہ لوگوں نے ان سچے مسلمانوں کو بے دردی سے قتل کر دیا۔ ان پر ہمیشہ باد صبا چلتی رہے۔ چمکنے اور راستہ بتانے والے ستارے جب تک چمکتے رہیں ان عظیم انسانوں پر اللہ کی برکتیں اور رحمتیں نازل ہوتی رہیں۔ اب تم لوگ دشمنان اسلام کے خلاف تلواروں اور نیزوں سے کام لو تاکہ عذاب الٰہی سے بچ سکو۔"

جناب عبداللہؓ نے ادھر ادھر گردن گھماتے ہوئے کہا۔

جناب عبداللہؓ کی تقریر کا ایک ایک جملہ ابن زیاد اور وہاں موجود اس کے سپاہیوں کے دلوں میں خنجر کی طرح اتر رہا تھا۔ ابن زیاد کے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا تھا۔ غصے اور بے تابی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اس نے جناب عبداللہؓ کے پیچھے کھڑے ہوئے جلاد کو اشارہ کیا۔ ایک تلوار ہوا میں لہرائی اور صحابی رسولؐ کا سر فرش پر گر گیا پھر اگلے ہی لمحے ان کا دھڑ زمین پر گرا اور اپنے ہی لہو میں تڑپنے لگا۔

ابن زیاد نے ایک وحشیانہ قہقہہ لگایا۔ اپنے گلے میں پڑی ہوئی سونے کی زنجیر کو

مروڑتے ہوئے اس نے جناب عبداللہؓ کے جسم کو حقارت سے دیکھا اور اس کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

کربلا میں ڈوبنے والے آفتاب امامت کی روشنی نے بے خبری اور بے عملی کے اندھیروں میں سوئے ہوئے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنا شروع کر دیا تھا۔ ضمیر جاگنے لگے تھے' سوئے ہوئے جذبے بیدار ہونے لگے۔ یزیدی حکومت کے پروپیگنڈے کا جادو ٹوٹ رہا تھا۔ مرد ہوں یا عورتیں کسی کے دل کو چین نہیں تھا۔ گھروں کی خوشیاں' آنسوؤں میں بدل گئی تھیں۔ دلوں کے پچھتاوے راتوں کو سونے نہیں دیتے تھے۔

یزیدی حکومت واقعہ کربلا کو ایک صحرا میں دفن کر دینا چاہتی تھی لیکن امام حسینؑ کی جرأت و بہادری دین الٰہی سے ان کی محبت' یزیدی فوج کےظلم و تشدد اور امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی مظلومیت کی کہانی کربلا کے ریگزار سے نکل کر انسانوں کے دلوں کو فتح کرتی جارہی تھی۔

عبداللہ بن عفیفؓ کی بہادری' بے باکی اور ظالم حاکم کے سامنے کلمہ حق کہنے کی ہمت خون حسینؑ کی بے پناہ اور ابدی طاقت کا ایک معمولی سا کرشمہ تھا جس نے کوفے کے گورنر ہاؤس کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔

جس دن عبید اللہ ابن زیاد نے صحابی رسولؐ جناب عبداللہؓ کو شہید کیا اسی دن اس نے جناب مختار ثقفی کو قید خانے سے طلب کیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ مختار ثقفی کو بھی قتل کر دیا جائے کیونکہ جناب مختار پر جوش آدمی تھے اور اہل بیتؑ کی محبت کا دم بھرتے

تھے۔ مختار ثقفی دربار ابن زیاد میں آئے تو عین وقت پر ابن زیاد کو اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔
یوں کہ جناب مختار کے لیے دو انتہائی اہم آدمیوں کی سفارش آ گئی۔ سفارش کرنے
والوں میں ایک عبداللہ ابن عمر تھے اور دوسرے ابن زیاد کا سردار عمر ابن سعد۔ یہ دونوں
افراد مختار ثقفی کے بہنوئی لگتے تھے۔ ابن زیاد ان سفارشوں کو ٹال نہیں سکتا تھا۔

مختار ثقفی رہا ہوتے ہی کوفے سے باہر نکل گئے۔ ان کے سینے میں آگ
بھڑک رہی تھی۔ ان کی آنکھیں خون کے آنسو رو رہی تھیں لیکن ایک تنہا آدمی پوری
فوج سے نہیں لڑ سکتا تھا۔ مختار اپنی تنہائی کو تلوار بنانا چاہتے تھے اسی لیے انہوں
نے کوفے میں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور اپنی طاقت جمع کرنے کے لیے کوفے
سے باہر نکل گئے۔ مختار ثقفی کربلا کے بعد اٹھنے والی سب سے پہلی آندھی کا ایک بگولا تھے
جو یزید کی ملعون لشکروں فوجوں گورنروں غلاموں اور درندہ صفت چوپایوں کو
صفحۂ ہستی سے مٹانے کی طاقت رکھتا تھا۔

معصوم قیدی

اللہ پر یقین اور اس کی مرضی پر راضی رہنے والے یہ قیدی انہیں فرشتوں سے بھی زیادہ معصوم لگتے تھے۔ یہ عام انسان ہوتے تو ساری زندگی اللہ سے شکوے کر کے گزار دیتے!

باب۔ ۱۱

کوفے میں اسیرانِ کربلا کو ایک بے سایہ قید خانے میں قید کیا گیا تھا جہاں دن بھر چلچلاتی دھوپ ہوتی اور رات بھر آسمان سے شبنم کے آنسو گرا کوتے۔ قیدیوں کو کھانے پینے کے لئے اتنا ہی دیا جاتا تھا کہ ان کی سانسیں چلتی رہیں۔ اسی قید خانے کے قریب ہی وہ جگہ تھی جہاں بیس پچس سال پہلے جناب زینب بنت علیؑ نے اپنے والد کی خلافت کے زمانے میں کوفے کی عورتوں کو قرآن و سنت کی تعلیم دینے کے لئے ایک درس گاہ قائم کی تھی۔ کبھی وہ اسی شہر میں انتہائی عزت واحترام کے ساتھ رہا کرتی تھیں اور آج اسی شہر کے ایک قید خانے میں قید تھیں اور لوگ ان کے گھرانے سے اپنی عقیدت و محبت تک کو چھپانے پر مجبور تھے۔

ان تمام مشکلات، مسائل اور مصائب کے باوجود شام غریباں سے اب تک کوئی رات ایسی نہیں گزری تھی کہ جنابِ زینب بنت علیؑ نے نماز شب نہ ادا کی ہو۔ عاشور کی رات امام حسینؑ نے اپنی بہن کو وصیت کی تھی بہن! نماز شب میں مجھے نہ بھولنا۔ رات کے آخری پہر جنابِ زینبؑ تیمّم کر کے نمازِ شب ادا کرتیں، اپنے مظلوم بھائی کو یاد کر کے زار و قطار آنسو بہاتیں اور بارگاہِ الٰہی میں فریاد کرتیں۔

امام سجادؑ قید خانے کے الگ کونے میں عبادت میں مصروف رہتے۔ کبھی وہ اپنے

بابا کو یاد کرتے، کبھی اپنے چھوٹے بھائیوں کو۔ ایک ایک کا چہرہ ان کی آنکھوں کے سامنے گھومتا تو ان کا دل پھٹنے لگتا۔ وہ اپنی چیخوں کو بہ مشکل روکتے اور قریب سوئی ہوئی بہن کے معصوم چہرے پر نظر ڈالتے۔ چاند کی روشنی میں جناب سکینہؑ کے رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں چمکتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ امام زین العابدینؑ اپنے غموں اور تکلیفوں کو برداشت کرتے اور اللہ رب العالمین کی بارگاہ میں سجدہ شکر ادا کرتے کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے انھیں ایک سخت امتحان کے لئے منتخب کیا اور غموں کو برداشت کرنے کی بے پناہ طاقت بھی عطا فرمائی۔

نماز شفع کے بعد امام زین العابدینؑ دعا کے لئے ہاتھ بلند کرتے اور مناجات کرتے:

"اے میرے معبود! رات کے ان لمحوں میں تجھے پکارنے والے تجھے پکار رہے ہیں اور تیری بارگاہ کی طرف بڑھنے والوں نے تیری بارگاہ کا قصد کیا ہے اور یہ سب لوگ تیرے فضل و کرم کے امیدوار ہیں۔ یہ تجھ سے نیکیوں کے لئے دعائیں کر رہے ہیں۔ رات کے ان لمحوں میں تیری طرف سے لطف و کرم، انعامات، عطائیں اور بخششیں ہیں، جنھیں تو اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور جن بندوں پر تیری نظر عنایت نہ ہو انھیں عطا نہیں کرتا!

اور یہ میں ہوں تیرا ایک بندۂ فقیر جو تجھ سے تیرے فضل و کرم کا سوال کر رہا ہے۔ تو اے میرے مالک! اگر آج کی رات تو اپنی

مخلوق میں سے کسی پر فضل و کرم فرمائے اور اس پر اپنے انعام و اکرام کی بارش برسا دے تو رحمتیں اور برکتیں نازل فرما محمدؐ اور ان کی پاک وپاکیزہ اولادؑ پر جو نیک ہیں اور صاحبانِ فضیلت ہیں اور مجھ پر بھی اپنا احسان فرما۔ درودؐ و سلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی پاک وپاکیزہ آل پر جن سے اللہ نے رجس وناپاکی کو دور کر کے انھیں حق طہارت تک پاک وپاکیزہ رکھا۔ بے شک اللہ ہی لائق حمد اور صاحب بزرگی ہے۔

اے اللہ رب العالمین! میں نے تیرے حکم کے مطابق تجھ سے دعا کی ہے تو اب تو اسے قبول فرما کہ تو نے دعا قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے اور مجھے یقین کامل ہے کہ تو اپنے وعدے کو وفا کرنے والا ہے۔"

اللہ کی حمد و ثناء کی یہ آوازیں، رات کے سناٹے میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ قید خانے کے اردگرد بنے ہوئے مکانوں تک جاتیں تو اونگتے ہوئے لوگ اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ عورتیں سروں کو ڈھانک کر رونے لگتیں، نوجوان بے قراری سے کروٹیں بدلنے لگتے۔ ایسے قیدی انہوں نے کہاں دیکھے تھے جو مصائب و مشکلات کے اس آخری درجے میں بھی اپنی راتیں اللہ کی حمد و ثنا اور شکر کے سجدوں میں گزارتے ہوں!

صبر، برداشت، اپنے مالک اللہ رب العالمین کی ذات پر یقین اور اس کی مرضی پر راضی رہنے والے یہ قیدی انہیں فرشتوں سے بھی زیادہ معصوم لگنے لگے تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ ایسی صفات تو نبیوںؑ اور پیغمبروں ہی میں پائی جاتی ہیں۔ یہ قیدی اگر عام

گلے میں لوہے کا طوق، ہاتھوں میں زنجیریں اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ اونٹ پر بٹھانے کے بعد حضرت امام زین العابدینؑ کے پیروں میں دوبارہ رسی باندھ کر اس رسی کو اونٹ کے پیٹ کے نیچے کس دیا گیا۔ ایک اور رسی آپؑ کی گردن میں باندھی گئی اور اس کا دوسرا سرا اونٹ کے کجاوے سے باندھ دیا گیا تاکہ سفر کے دوران وہ اونٹ سے نیچے نہ گر پڑیں۔

آلِ رسولؐ کے ان محترم قیدیوں کے لئے ابنِ زیاد نے اپنے فوجیوں کو بہت واضح ہدایات دی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ قیدیوں کو کھانے پینے کے لئے اتنا ہی دیا جائے کہ یہ لوگ زندہ رہ سکیں۔ سواریوں کے تھکنے کی وجہ سے کسی جگہ ٹھہرنا ہو اور دن کا وقت ہو تو ان تمام قیدیوں کو دھوپ میں بٹھایا جائے۔ جہاں تک ممکن ہو انھیں بھوکا پیاسا رکھا جائے۔ جس شہر کے قریب سے گزریں وہاں لوگوں کو جمع کر کے قیدیوں اور سروں کی نمائش ضرور کی جائے۔

اس سلسلے میں ابن زیاد نے حکم دیا تھا کہ کسی شہر میں داخلے سے کئی میل پہلے قیدیوں کو اونٹوں سے اتار کر شہر کے اندر پیدل لے جایا جائے۔ اسی طرح ان کی نمائش کے بعد انہیں پیدل ہی شہر سے باہر اپنے کیمپ تک لایا جائے۔ ابنِ زیاد کی یہ ظالمانہ ہدایات، رسول اسلامؐ اور ان کے گھرانے سے اس کی نفرت کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔

ان تمام احکامات کے ساتھ رسول اللہؐ کے خاندان کی قیدی عورتوں اور بچوں کا یہ قافلہ ایک دن کوفے سے روانہ ہو گیا۔ راستے تماشائیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ سارے تماشائی کافر، مشرک، یہودی یا عیسائی نہیں تھے۔ یہ سب لوگ رسول اسلامؐ کا کلمہ پڑھتے تھے اور ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے رسولؐ کے اہل بیتؑ کو انتہائی ذلت و

رسوائی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

تماشائیوں کے اس ہجوم میں اہل بیت کے چاہنے والے بھی موجود تھے مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ بہت سے لوگ منہ پھیر پھیر کر رو رہے تھے اور ان کے دلوں میں نفرت و انتقام کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔

لہو کی روشنی

قیدیوں کا قافلہ شام کی طرف بڑھ رہا تھا۔
لہو کی روشنی بے خبری، بے عملی اور مایوسی
کے اندھیروں کو دور کرتی جا رہی تھی۔!

باب۔۱۲

آسمان سے آگ برساتا سورج اب مغرب میں اتر رہا تھا۔ گرم ہوا کے صحرائی بگولے، ٹیلوں، میدانوں، راستوں پر چکراتے پھر رہے تھے۔ پریشان حال، غم زدہ اور مظلوم قیدیوں کا قافلہ انسانی شکل والے درندوں اور سفاک قاتلوں میں گھرا ہوا کربلا سے گزر کر منزل قادسیہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

آل محمدؐ کے ان قیدی عورتوں اور بچوں کو کربلا کے اس میدان میں سے گزارا گیا تھا جہاں ابھی کچھ دن پہلے انہی فوجیوں نے خاندان اہل بیت اور ان کے چاہنے والے تمام افراد کو بے دردی سے قتل کیا تھا۔ ان کی لاشوں کو کھلے میدان میں چھوڑ کر اگلے دن یہ درندے جشن فتح منانے کوفے چلے گئے تھے۔ یزیدی فوجی اب ان مظلوم قیدیوں کو اپنے خلیفہ یزید ابن معاویہ کے دربار میں پیش کرنے کے لئے شام لے جا رہے تھے۔

کوفے کے گورنر عبید اللہ ابن زیاد نے اپنے فوجیوں کو ہدایت کی تھی کہ ان قیدیوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہ کی جائے۔ خاندان رسول اسلامؐ کو جس قدر ممکن ہو تکلیف اور اذیت میں مبتلا کیا جائے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ راستے کی ہر آبادی

یہ سن کر بنی اسد کے مردوں کو غیرت آئی۔ پھر ان سب مردوں، عورتوں اور بچوں نے مل کر میدان کربلا میں قبریں کھودنا شروع کیں۔ ابھی وہ قبریں کھود رہے تھے کہ کوفے کی طرف سے ایک اونٹ سوار وہاں آپہنچا۔ اس نے بنی اسد کے لوگوں کو بتایا کہ کون سی لاش کس شہید کی ہے اور ان تمام لاشوں کو کس طرح اور کہاں سپرد خاک کیا جائے گا۔ یہ سوار کوئی عام انسان نہیں تھا۔ یہ حسین ابن علیؑ کے بڑے بیٹے اور امام وقت امام زین العابدینؑ حضرت علی ابن الحسینؑ تھے جو معجزانہ طور پر وہاں پہنچے تھے۔

امام معصومؑ اپنی زندگی میں عام انسانوں کی طرح تمام تکلیفیں برداشت کرتے ہیں۔ دنیا کے دکھ سکھ، صدمے اور مصیبتیں امامؑ پر بھی اسی طرح گزرتی ہیں جس طرح تمام انسانوں پر گزرتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی مصیبتیں اور مشکلات عام انسانوں پر پڑنے والی مصیبتوں سے کہیں زیادہ شدید اور تکلیف دہ ہوتی ہیں لیکن امامؑ اپنی محیر العقول طاقتوں کو کبھی اپنی مصیبتوں کو دور کرنے کے لئے استعمال نہیں کرتے۔ عقلوں کو حیران کر دینے والی خداداد صلاحیتوں کو امامؑ صرف ناگزیر حالت میں ہی استعمال کرتے ہیں۔

حضرت علی ابن الحسینؑ کوفے کے قید خانے میں تھے اور ساری تکلیفیں برداشت کر رہے تھے لیکن آپ نے اپنی معجزانہ طاقت کو اپنی مشکلات کو دور کرنے کے لئے استعمال نہیں کیا۔ آپؑ نے اپنی اس طاقت کو اس وقت استعمال کیا جب کربلا کے میدان میں شہدائے کربلاؑ کی قبریں تیار ہو رہی تھیں اس لئے کہ امامؑ کی نماز جنازہ صرف امام وقتؑ ہی پڑھا سکتا ہے۔ حضرت امام حسینؑ اپنے وقت کے امام تھے۔ ان کی نماز جنازہ

پڑھانا اور انہیں سپرد خاک کرنا اب ان کے بیٹے اور امام وقت حضرت علی ابن الحسینؑ کی ذمے داری تھی۔ اسی ذمے داری کو ادا کرنے کے لئے حضرت علی ابن الحسینؑ اپنی خصوصی طاقت کے ذریعے کوفے کے قید خانے سے کربلا پہنچے تھے۔

یزیدی فوج کا دستہ خاندان رسالت کی قیدی عورتوں اور بچوں کو لے کر یہاں پہنچا تو وہاں کسی شہید کی لاش موجود نہیں تھی۔ وہاں چند قبریں تھیں جنہیں دیکھ کر بے پناہ تقدس، احترام اور گہری اداسی کا احساس ہوتا تھا۔ اونٹوں پر بندھے ہوئے بچوں اور عورتوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ کئی خواتین چاہتی تھیں کہ نیچے اتر کر ان شہیدوں کو سلام کریں لیکن یزیدی فوجیوں نے اونٹوں کو تیزی سے ہنکانا شروع کر دیا۔ یزیدی فوجی قیدی عورتوں اور بچوں کو ان کے عزیزوں کی بے گور و کفن لاشیں دکھانے یہاں لائے تھے مگر لاشیں دفن کی جا چکی تھیں اس لئے اب یہاں ٹھہرنے سے انہیں کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اب انہیں قادسیہ پہنچنے کی جلدی تھی۔

***

یزیدی حکومت نے منصوبہ بنایا تھا کہ رسول اللہؐ کے خاندان کے تمام مردوں کو قتل کر کے اہلبیت رسولؐ کو قیدیوں کی طرح تمام قصبوں، شہروں اور آبادیوں میں گھمایا جائے۔ اس منصوبے کے پیچھے ان کے کئی مقاصد تھے۔ ان قیدیوں کو حکومت کے باغیوں کے طور پر پیش کرنا تھا اور نہیں رسول اسلامؐ کے اہل بیت کے طور پر۔ ان کے خیال میں اس طرح عوام یزیدی حکومت کی فوجی طاقت سے خوف زدہ ہو جائیں گے اور اہل بیت کو اس طرح قیدی بنا دیکھ کر عوام کے دلوں سے رسول اسلامؐ کی محبت اور عقیدت ختم ہو جائے گی۔

یزیدی حکومت کا اصل نشانہ اسلام اور رسول اسلامؐ تھے۔ وہ عوام کو بتانا چاہتے تھے کہ جو شخص بھی دین اسلام کی حمایت کرے گا اس کا وہی حشر ہو گا جو حسین ابن علیؑ اور ان کے خاندان والوں کا ہوا ہے۔ یزیدی کارندے عوام کے دلوں میں یہ بات بٹھا دینا چاہتے تھے کہ جب رسولؐ کا نواسہ اور علی ابن ابی طالبؑ کا بیٹا حکومت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو پھر شام، عراق، مصر اور ایران میں کس کی مجال ہے جو حکومت وقت سے ٹکر لینے کا تصور بھی کر سکے۔

شیطان کے نمائندے اپنی خفیہ چالیں چل رہے تھے، اللہ کے نمائندے مکمل صبر، برداشت، دلیری اور بہادری کے ساتھ اپنے طے شدہ منصوبے پر عمل کر رہے تھے۔ یزید کے فوجیوں کے ساتھ شیطان تھا، آل رسولؐ کے قیدیوں کے ساتھ اللہ رب العالمین کی مدد شامل تھی اس لئے یہ قافلہ جب شام کے وقت قادسیہ کی منزل پر ٹھہرا تو ایک پراسرار واقعے نے یزیدی فوجیوں کو دہلا کر رکھ دیا۔

یہاں قیدیوں کو ایک طرف بٹھا کر یزیدی فوجی ایک دیوار کے قریب بیٹھے کھانے پینے اور قہقہے لگانے میں مصروف تھے کہ اچانک پتھریلی دیوار پھٹی اور اس میں سے ایک لمبا چوڑا انسانی ہاتھ برآمد ہوا اس ہاتھ پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ یہ عجیب منظر دیکھ کر یزیدی فوجی اچھل پڑے اور وہاں سے دور ہٹ گئے۔ کچھ دیر بعد چند سپاہی ہمت کر کے آہستہ آہستہ آگے بڑھے تاکہ اس عبارت کو پڑھ سکیں۔ ہاتھ اپنی جگہ ساکت تھا۔ سپاہیوں نے عبارت کو بہ آواز بلند پڑھنا شروع کیا۔

"وہ لوگ جنھوں نے رسولؐ کے بیٹے کو قتل کیا ہے کیا قیامت کے روز حسین ابن علیؑ کے جدؐ سے شفاعت کی امید کر سکتے ہیں؟ خدا کی قسم

تکریت کے یزیدی حکمران کو اس قافلے کی اطلاع مل چکی تھی۔ اس نے راستوں کو رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجانے کا حکم دیا۔ میراثی اور گانے بجانے والی عورتوں کے طائفے بلائے گئے۔ اردگرد کے رہنے والے معززین کو مدعو کیا گیا تاکہ حکومت کے باغیوں کے سر اور قیدی عورتوں اور بچوں کا قافلہ تکریت سے گزرے تو وہاں جشن جیسا سماں نظر آئے۔

علاقے کے مسلمان اصل صورت حال سے بے خبر تھے لیکن تکریت کے رہنے والے نصرانیوں کو کسی طرح یہ معلوم ہو چکا تھا کہ یہاں آنے والے قیدی اللہ کے آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰؐ کی اولاد ہیں اور جن لوگوں کو حکومت کی طرف سے باغی قرار دیا جا رہا ہے وہ باغی نہیں بلکہ دین اسلام کے سچے جاںنثار اور مسلمانوں کے رسولؐ کی اولاد ہیں۔ اسی لیے تمام نصرانیوں نے اپنے اپنے گھروں کے دروازے بند کر لئے اور اپنے مذہب کے مطابق توبہ واستغفار کرنے لگے۔

یہ خبر اڑتی اڑتی مسلمانوں تک پہنچی تو خوشیاں منانے والوں کے دل بجھ کر رہ گئے۔ نوجوان صدمے اور غصہ سے بے حال تھے۔ انہوں نے یزیدی فوج پر حملہ کرنے کا پروگرام بنایا مگر انہی نوجوانوں کے درمیان حکومت کے جاسوس بھی موجود تھے انھوں نے یہ خبر تکریت کے حکمران کو پہنچا دی۔ حکمران نے مصلحت وقت دیکھتے ہوئے قیدیوں کی نمائش کرنے والے یزیدی دستے کو پیغام بھیجا کہ شہر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں ممکن ہے کہ مشتعل مسلمان ان پر حملہ آور ہو جائیں۔

یہ سن کر یزیدی فوجی دستے نے شہر میں داخل ہونے کا ارادہ ترک کر دیا اور تکریت کے باہر باہر سے نکلتے ہوئے "دیر عروہ" اور "وادی نخلہ" میں پہنچے۔ یہاں سے

یہ قافلہ "مرشاد" نامی آبادی میں ٹھہر کر "ارمینا" سے ہوتا ہوا "لبنا" نامی شہر جا پہنچا۔

لبنا کے مسلمانوں کو اصل صورتحال کا علم ہو چکا تھا۔ یزیدی فوجی شہر کے قریب پہنچے تو لبنا شہر کے مرد، عورتیں، نوجوان اور بچے اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ قیدیوں کو دیکھ دیکھ کر وہ زار قطار رو رہے تھے اور قاتلانِ امام حسینؑ پر لعنت بھیج رہے تھے۔ اس وقت تمام مسلمان سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے چیخ چیخ کر یزیدی فوجیوں پر لعنت بھیجی اور کہا۔ "اے اولادِ انبیاء کے قاتلو! سفاک انسانو! انسانوں کی شکل والے بھیڑیو! ہمارے شہر سے باہر نکل جاؤ۔"

یزیدی فوجیوں نے یہ حالات دیکھی تو شہر کے دروازے سے واپس لوٹ گئے۔ وہاں سے یہ قافلہ "کحیلہ" پہنچا۔ کحیلہ میں آرام کر کے یزیدی فوجی "جہینہ" نامی آبادی کی طرف بڑھنے لگے۔

جہینہ کے مسلمان سارے واقعے سے باخبر تھے۔ یزیدی دستے کی آمد کی خبر سن کر چار ہزار مسلح جوان جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ یہ خبر یزیدی فوجیوں کو ملی تو انہوں نے جہینہ جانے کی بجائے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا اور "تل اعفر" سے ہوتے ہوئے "موصل" نامی شہر کی طرف بڑھنے لگے۔

موصل کا حکمران متعصب نہیں تھا۔ اس کے دل میں اللہ اور رسولؐ کا کسی حد تک خوف موجود تھا۔ اس نے شہر کے معززین کو بلا کر ان سے مشورہ کیا۔ سب لوگوں نے اسے رائے دی کہ شہر میں اہل بیت کے قیدیوں اور شہیدوں کے سروں کی نمائش نہ کرائی جائے۔ موصل کا حکمران بھی یہی چاہتا تھا۔ اس نے یزیدی دستے کے لیے کھانے پینے کا سامان شہر سے دور ہی انہیں بھجوا دیا اور انہیں یہ پیغام بھیجا کہ موصل

شہر کے مسلمان سخت مشتعل ہیں۔ فوجی دستے پر حملہ ہو سکتا ہے اس لیے وہ لوگ اس طرف نہ آئیں۔

یزیدی فوجیوں نے موصل سے تین چار میل دور ٹھہر کر رات گزاری اور اگلے دن وہاں سے "نصیبین" نامی شہر میں پہنچے۔ یہاں کا حکمران سخت ظالم انسان تھا۔ اس نے شہر کو سجانے کا حکم دے رکھا تھا۔ یہاں کی زیادہ تر آبادی یزیدی حکومت کی وفادار تھی۔ شہیدوں کے کٹے ہوئے سر اور قیدیوں کا قافلہ جب نصیبین کے بازاروں سے گزرا تو وہاں کے لوگ خوشی کے نعرے بلند کرنے لگے۔ مکانوں کی چھتوں پر تماشہ دیکھنے والی عورتوں نے رسولؐ کے گھرانے کی قیدی عورتوں اور بچوں کو پتھر مارنا شروع کر دیئے۔

یزیدی فوجیوں نے نصیبین میں داخل ہونے سے پہلے آلِ محمدؐ کی ان محترم خواتین اور بچوں کے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے تھے اور ان سب کو ایک لمبی رسی میں باندھ کر انتہائی ذلت ورسوائی کے ساتھ شہر میں لے کر آئے تھے۔ چھت پر چڑھی ہوئی عورتوں نے قیدیوں پر پتھر برسانا شروع کیے تو آلِ رسولؐ کی محترم خواتین اور بچوں کے لیے اپنے چہروں کو پتھروں سے بچانا ممکن نہیں تھا۔

حضرت زینب بنتِ علیؑ نے جب اپنے خاندان کے ایک بچے کے چہرے سے خون بہتا دیکھا تو ان کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا اور اس شہر کے لوگوں کے لیے بددعا کی۔ "اے ہمارے پالنے والے! اس شہر کے رہنے والوں کو ان کے ظلم کی ایسی سزا دے جسے یہ کبھی نہ بھول سکیں۔"

یزیدی فوجی' قیدیوں کی نمائش کر کے باہر نکل رہے تھے کہ تیز ہوائیں چلنے

لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان بادلوں میں چھپ گیا اور کالے کالے بادلوں میں بجلی چمکنے لگی۔ بجلی کی گرج چمک اتنی تیز تھی کہ وہ لوگ خوف زدہ ہو کر اپنے گھروں میں چھپ گئے۔ پھر ذرا سی دیر بعد سارا شہر بادلوں کی تیز گڑگڑاہٹ سے لرز کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی آسمان سے بجلی کا ایک کوندا زمین کی طرف لپکا اور دیکھتے ہی دیکھتے آدھے شہر میں آگ بھڑک اٹھی۔

آلِ رسولؐ پر پتھر برسانے والی عورتیں اور ان کے گھر کے افراد جل کر کوئلوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ جشن منانے والے جلے ہوئے مکانوں کے ملبے سے اپنے رشتے داروں کی لاشوں کو نکالنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ یزیدی فوجی دستے نے یہ منظر دیکھا تو فوراً اس شہر سے نکل گیا۔

نصیبین کے بعد اس قافلے کا رخ [illegible] کی جانب تھا۔ یہ شہر دو بھائیوں نے آباد کیا تھا۔ یہ دونوں بھائی شامی حکومت سے منسلک تھے۔ ایک بھائی جنگ صفین میں قتل ہو چکا تھا۔ اب اس کا بیٹا اپنے چچا کے ساتھ اس شہر میں رہتا تھا۔ شہر کے دو بڑے دروازے ان دونوں بھائیوں کے نام سے مشہور تھے۔ اس وقت چچا حکمران تھا۔ چچا اور بھتیجے کو جب یہ اطلاع ملی کہ حسین ابن علیؑ کا سر اور ان کے خاندان کے قیدی کوفے سے دربار یزید میں پیش ہونے کے لیے شام جا رہے ہیں تو ان دونوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے شہر کو خوب سجایا۔ استقبال کے لیے ڈھول تاشے بجانے والوں اور ناچنے والی عورتوں کو کھڑا کیا گیا لیکن یزید کا فوجی دستہ شہر کے قریب پہنچا تو عین وقت پر چچا بھتیجے میں اس بات پر تکرار ہو گئی کہ فوجی دستے کو شہر کے دونوں میں سے کس دروازے سے اندر آنے دیا جائے۔

چچا چاہتا تھا کہ قیدیوں کا قافلہ اس کے نام سے منسوب دروازے سے شہر میں داخل ہو۔ بھتیجے کو ضد تھی کہ ان قیدیوں کو اس کے باپ سے منسوب دروازے سے اندر آنے کی دعوت دی جائے۔ یہ بحث اور تکرار اتنی بڑھی کہ دونوں طرف سے تلواریں نکل آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے "قریہ الاخوین" کے گلی کوچوں میں دست بہ دست لڑائی ہونے لگی۔ جنگ کے دوران شہر کا حاکم سلیمان مارا گیا۔

یزیدی لشکر کو شہر میں اس بدامنی کی اطلاع ملی تو وہ شہر میں داخل ہوئے بغیر باہر ہی باہر دوسری طرف نکل گیا۔ اس کے بعد یہ قافلہ "آمہ" نامی منزل پر ٹھہرا وہاں سے "عین الورد" پھر "میافارقین"، "دوغان" اور "راس عین" سے گزرتا ہوا "حلب" نامی شہر پہنچا۔ یہاں ٹھہر کر قافلے نے "معمورہ" کی طرف سفر شروع کیا۔

معمورہ ایک پہاڑ کے دامن میں آباد تھا۔ یہاں کے تمام باشندے یہودی تھے۔ یہاں سے یہ قافلہ "سرمدین" نامی آبادی میں پہنچا لیکن سرمدین کے مسلمانوں نے شہر کے دروازے بند کر لئے اور فصیل شہر سے یزیدیوں کو پتھر مار کر وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ یہاں سے یہ لوگ "قنسرین" پہنچے۔ یہ عیسائیوں کی آبادی تھی۔ یہاں ٹھہر کر یزیدی فوجیوں کا دستہ قیدیوں کو ساتھ لے کر "حران" کی طرف چل پڑا۔ اسی طرح یہ قافلہ اندرین، معرۃ النعمان اور شیزر سے ہوتا ہوا "کفر طاب" پہنچا۔

☆☆☆

یہ مسلمانوں کی آبادی تھی جو اسلام اور رسول اسلامؐ سے محبت کرتے تھے۔ یہاں کے نوجوانوں نے شہر کے دروازے بند کر لئے۔ یزیدی فوج کے سرداروں نے ان نوجوانوں کو ڈرانا دھمکانا شروع کیا۔ یہ دیکھ کر شہر کے بزرگوں نے پر جوش نوجوانوں

سے کہا کہ حکومت وقت سے ٹکر لینا آسان نہیں۔ یہ فوجی کوفے سے یہاں تک مختلف شہروں میں شہیدوں کے سروں اور خاندان رسالتؐ کے قیدیوں کی نمائش کرتے آئے ہیں۔ وہاں کسی نے ان کا مقابلہ نہیں کیا تو تم لوگ کیوں اپنی جان گنوانا چاہتے ہو؟

بزرگ لوگ کسی مشکل میں گرفتار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ وہ رسول اسلامؐ سے محبت بھی کرتے تھے لیکن ان کے خاندان کے قاتلوں سے جھگڑا بھی مول لینا نہیں چاہتے تھے۔

کفر طاب کے دلیر نوجوان بزرگوں کی مصلحت آمیز باتیں سن کر بپھر گئے۔ انہوں نے اپنے بزرگوں سے کہا۔ "آپ لوگوں کی یہ مصلحت پسندی نہ ہوتی تو آج یہ نوبت ہی نہ آتی کہ یزیدی فوج نے خاندان اہل بیت کے مردوں کو کربلا میں ذبح کر دیا۔ اب رسولؐ کے گھر کی محترم خواتین کو مملکت اسلامی کے شہروں میں قیدی بنا کر گھمایا جا رہا ہے اور رسول کا کلمہ پڑھنے والے مسلمان بے غیرتی سے یہ سارا تماشا دیکھ رہے ہیں۔"

"ہماری طاقت اتنی نہیں کہ حکومت کی فوجیوں سے ٹکرا سکیں۔" بزرگوں نے رائے ظاہر کی۔

"رسولؐ کے نواسے حسین ابن علی کے پاس کون سے لشکر تھے؟ جب وہ اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ حکومت وقت سے ٹکر لے سکتے ہیں تو ہماری جانیں ان کے ساتھیوں کی جانوں سے زیادہ قیمتی نہیں۔" ایک نوجوان نے اپنی تلوار لہراتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن دیکھو۔۔۔ تمہارے گھربار ہیں۔ بیوی بچے ہیں۔ تمہارے بعد ان کا

کیا۔۔۔"ایک بزرگ نے سمجھانا چاہا۔

"ان کا اللہ مالک ہے۔ آپ ہماری مخالفت نہ کریں۔ اگر حسین ابن علیؑ اور ان کے
ساتھیوں نے دین اسلام کو بچانے کے لئے اپنا لہو بہایا ہے تو ہم بھی انہی کے راستے
چلیں گے۔" ایک پرجوش نوجوان نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

بزرگوں نے شرمندگی سے سر جھکا لیے۔ پھر وہ اپنے اپنے گھروں میں گئے اور ا
تلواریں اور ڈھالیں لے کر ان نوجوانوں کے ساتھ آکر شامل ہو گئے۔ یہ دلیر باعمل
مسلمان خفیہ راستوں کے ذریعے شہر سے باہر نکلے اور انہوں نے یزیدی فوج پر حملہ کر
دیا۔

یزیدی فوج کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک حصہ کفر طاب
کے نوجوانوں سے لڑائی میں مصروف ہو گیا اور باقی فوج شہیدوں کے سروں ا
قیدیوں کو اپنے گھیرے میں لئے وہاں سے فرار ہو گئے۔

کفر طاب کے سچے مسلمانوں کے پرجوش نعروں سے در و دیوار ہل رہے تھے
جناب ام کلثومؑ نے ان مسلمانوں کا جوش و جذبہ دیکھا تو ان کا دل بھر آیا۔ انہیں کربلا میں
اپنے بھائی کی تنہائی اور مظلومیت یاد آگئی۔ انہوں نے سوچا۔ "کفر طاب کے یہ باعمل
مسلمان کاش کربلا میں میرے بھائی کے ساتھ ہوتے!"

شہر سے دور ہوتے ہوتے جناب ام کلثومؑ نے آسمان کی طرف دیکھا اور دعا فرمائی۔
"اے اللہ! اس شہر کے رہنے والوں کو میٹھا پانی عطا فرما۔ اے رب کریم! اس شہر میں
کبھی مہنگائی پیدا نہ ہو۔ اے میرے پالنے والے! اگر ساری دنیا ظلم و ناانصافی سے بھر
جائے تب بھی میرے مالک! اس شہر کے رہنے والوں کو امن اور عدل و انصاف کے

سائے میں خوش و خرم رکھنا۔"

کفر طاب سے یہ قافلہ "حماۃ" آیا۔ یہاں سے نکل کر یزیدی "حمص" نامی شہر میں داخل ہوئے لیکن یہاں کے باشندوں نے یزیدی فوجیوں پر اتنے پتھر برسائے کہ پچیس سے زیادہ فوجی ہلاک ہو گئے۔ باقی فوجی بڑی تیزی کے ساتھ یہاں سے نکل بھاگے۔ انہیں اپنے تعاقب کا خوف تھا اس لئے "بعلبک" نامی شہر پہنچنے کے لئے عام راستے کو چھوڑ کر انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ بعلبک سے یہ قافلہ "عسقلان" کے لیے روانہ ہوا۔ عسقلان اس قافلے کی انتالیسویں منزل تھی۔

٭٭٭

کوفے سے لے کر عسقلان تک یہ قافلہ ایک ہزار میل سے کہیں زیادہ سفر طے کر چکا تھا۔ صحرائی راستوں شدید گرمی اور بھوک پیاس کی حالت میں لمبا سفر طے کرنا کربلا کے غم زدہ قیدی عورتوں اور بچوں کے لئے ایک بہت بڑی آزمائش تھی۔ سارے راستے ان کے ہاتھ بندھے رہے۔ ہر شہر اور ہر منزل پر پہنچنے سے کئی میل پہلے ان تمام قیدیوں کو اونٹوں سے اتار کر انہیں ایک ساتھ باندھ دیا جاتا۔ امام علی ابن الحسین تمام راستے زنجیروں میں جکڑے رہے۔ ان کے گلے میں خاردار طوق تھا۔ ان کے پاؤں کی بیڑیاں اونٹ پر بٹھاتے وقت الگ کر دی جاتیں لیکن جب قافلہ کسی شہر کے قریب ہونے لگتا تو امام علیہ السلام کو اونٹ سے اتار کر ان کے پیروں میں یہ بیڑیاں دوبارہ ڈال دی جاتیں۔ صبح سے شام تک لوہے کی زنجیریں بیڑیاں اور طوق تیز دھوپ سے انگارے کی طرح جلنے لگتے اور امام کے جسم مبارک کو جھلساتے رہتے۔

عسقلان کا حاکم یعقوب عسقلانی تھا۔ یہ شخص کربلا میں بھی یزیدی فوج میں شامل

تھا۔ اس نے اپنے شہر میں جشن فتح منانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ سارا شہر خوشیوں کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ قیدیوں کا تھکا ماندہ قافلہ عسقلان کے بازاروں سے گزرنے لگا تو وہاں کے باشندوں کا جوش و خروش عروج پر پہنچ گیا۔ ہجوم میں ایک تاجر بھی موجود تھا جو کسی اور شہر سے یہاں پہنچا تھا۔

ضریر خزاعی نامی یہ تاجر خاندان اہل بیتؑ کے چاہنے والوں میں سے تھا۔ اس نے کسی فوجی سے پوچھا کہ یہ کٹے ہوئے سر کن باغیوں کے ہیں۔ ان کا سردار کون تھا؟ یزیدی سپاہی نے اسے بتایا کہ یہ حسین ابن علیؑ کا سر ہے اور یہ قیدی عورتیں اور بچے انھی کے خاندان کے ہیں۔

ضریر کانپ کر رہ گیا۔ اس کا دل شدید غم سے پھٹنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ریلا بہہ نکلا۔ وہ اسی طرح روتے روتے ہجوم میں سے گزرتا ہوا امام علی ابن الحسینؑ کے قریب پہنچا جو طوق و زنجیر میں جکڑے ہوئے بہ مشکل قدم بڑھا رہے تھے۔ ان کی مائیں، بہنیں اور بچیاں رسیوں میں بندھی ہوئی، سر ننگے، گردن جھکائے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ان خواتین اور بچوں کے قریب ہی یزیدی فوجی بنو ہاشم کے اٹھارہ شہیدوں کے سروں کو نیزوں پر اٹھائے، فتح کے نعرے بلند کرتے ہوئے غرور و تکبر کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔

ضریر خزاعی کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ وہ تو بس امام علی ابن الحسینؑ کو دیکھے جا رہا تھا اور آنسو بہائے جا رہا تھا۔ امام علیہ السلام نے اس کی طرف دیکھا۔ "اے اللہ کے بندے! تمھیں کیا ہوا؟ تمام لوگ تو ہمیں اس حال میں دیکھ کر خوشی سے ناچ رہے ہیں اور تم ہو کہ آنسو بہا رہے ہو؟" امام علیہ السلام نے تعجب سے پوچھا۔

"میں۔۔۔میں تو۔۔۔میں تو۔۔۔" ضریر کی آواز شدت غم سے بھرائی ہوئی تھی۔ "میں ایک تاجر ہوں۔ یہاں سے گزر رہا تھا۔ مجھے۔۔۔ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ۔۔۔کاش میری آنکھیں اندھی ہو جاتیں اور میں یہ منظر نہ دیکھتا۔۔۔" ضریر نے زارو قطار روتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے اہل بیت رسولؐ سے محبت کرنے والے معلوم ہوتے ہو؟" امام علی ابن الحسینؑ نے فرمایا۔

"میرے آقا!۔۔۔۔میں آپ کا غلام ہوں۔ آپ مجھے حکم دیں۔ آپ کے لئے میری جان بھی حاضر ہے۔" ضریر نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

"ہم تو خود قیدی ہیں کسی کو کیا حکم دے سکتے ہیں۔" امام علیہ السلام کے لہجے میں افسردگی تھی۔ "ہاں تم اگر ایک کام کر سکو تو اللہ تمہیں اس کی جزا ضرور دے گا۔"

"آپ حکم فرمائیں۔" ضریر نے اپنے آنسو آستین سے پونچھتے ہوئے عرض کی۔

"اگر تمہارے بس میں ہو تو میرے مظلوم بابا کا سر اٹھانے والے فوجی سے کہو کہ وہ بابا کے سر کو لے کر آگے کی طرف چلا جائے تاکہ میرے گھر کی خواتین پر نگاہیں ڈالنے والے یہ تماش بین بابا کے سر کی طرف متوجہ ہو جائیں" یہ کہتے کہتے امام علی ابن الحسینؑ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

ضریر خزاعی تیزی سے اس فوجی کے پاس گیا اور اسے کچھ رقم دے کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ امام حسین علیہ السلام کے سر کو لے کر آگے کی طرف چلا جائے۔ وہ سپاہی ذرا آگے بڑھا تھا کہ سید الشہداء کے لبوں کو حرکت ہوئی۔ آپ کے خون میں ڈوبے ہوئے ہونٹوں سے تلاوت قرآن کی آواز بلند ہونے لگی۔ یہ دیکھ کر تماشہ دیکھنے والے

حیران ہو گئے اور ان کی توجہ آل محمدؐ کی محترم خواتین کی طرف سے ہٹ کر سید الشہداء ؑ کے کٹے ہوئے سر کی جانب ہو گئی۔

ضریر دوبارہ امام علیہ السلام کے قریب پہنچا۔ "کوئی اور حکم ہو تو فرمائیں۔" اس نے ادب سے کہا۔

"اگر تمہارے پاس کچھ چادریں ہوں تو جا کر خاندان رسالتؐ کی ان محترم خواتین کو دے دو۔" امام علیہ السلام نے کہا۔

ضریر کے تھیلے میں بہت ساری چادریں موجود تھی۔ اس نے سر جھکا کر یہ ساری چادریں خواتین کی طرف بڑھا دیں۔ اسی وقت شمر ذی الجوشن نے اس طرف دیکھا۔ وہ اپنے گھوڑے کی باگیں موڑ کر اس طرف آیا۔ "تم کون ہو اور کس کی اجازت سے یہ چادریں ان عورتوں کو دے رہے ہو! تمہیں معلوم نہیں کہ یہ حکومت کے باغی ہیں۔" اس نے ضریر خزاعی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے ملعون! کہ یہ حکومت کے باغی نہیں، رسول اسلامؐ کی بیٹیاں ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اسلام کے باغی تم ہو اور تمہارا حاکم یزید ہے۔" ضریر کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔

اسی وقت یزیدی فوجیوں نے خواتین سے چادریں چھیننا شروع کر دیں۔ کئی سپاہی تلواریں لہراتے ضریر خزاعی کی طرف بڑھے۔ ضریر نے بھی اپنی تلوار نکال کر ہوا میں لہرائی اور یزیدی سپاہیوں پر حملہ کر دیا۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ یزیدی سپاہی ہر طرف سے ضریر پر حملہ کر رہے تھے۔ ایک تلوار اس کے سر پر پڑی اور ضریر خزاعی زمین پر گر کے بے حرکت ہو گیا۔ یزیدی فوجی اسے مردہ سمجھ کر آگے بڑھ گئے۔

کوفے سے عسقلان کے سفر میں پیش آنے والے واقعات یزیدی حکومت کی توقعات کے بالکل برعکس تھے۔ یزیدی فوجی مسلمانوں کو خوف زدہ کرنا چاہتے تھے مگر ہر جگہ خود انہیں خوف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یزید اور اس کے فوجی سمجھ رہے تھے ہمارے اس قدر ظلم و ستم کے بعد اب کوئی مسلمان سر اٹھانے کی جرات نہیں کرے گا لیکن تکریت، لینا، جہینہ، موصل، کفر طاب اور حمص نامی شہروں میں مسلمانوں نے یزیدی فوجیوں کے خلاف تلواریں کھینچ لی تھیں۔ کفر طاب میں تو باقاعدہ جنگ ہوئی تھی۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے شہروں میں ایسے پراسرار واقعات رونما ہوئے تھے کہ یہاں کئی عیسائی پادریوں اور یہودی راہبوں نے ان قیدیوں اور شہیدوں کے سروں کو دیکھ کر یزید کو کھلے عام برا بھلا کہا تھا۔ ان میں سے کئی یہودی اور عیسائی پادری اللہ کے رسول کا کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے تھے۔

یزید اور ابن زیاد نے آل محمدؐ کو رسوا کرنے کے لیے ہر شہر میں ان قیدیوں اور سروں کی نمائش کا اہتمام کیا تھا لیکن ان کے اس منصوبے کے نتیجے میں کوفے سے عسقلان تک کی تمام آبادیوں میں رہنے والے سچے مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہو گئے تھے۔ نوجوانوں، بزرگوں اور عورتوں کے دلوں میں حکومت کے خلاف نفرت اور غصے کا لاوا پکنے لگا تھا اور مایوسی میں ڈوبے ہوئے مسلمانوں کے دل ایک نئے جذبے کے ساتھ دھڑک رہے تھے۔

میدان کربلا سے اٹھنے والی سرخ آندھی آسمان پر پھیلتی جا رہی تھی۔ دوست نما نقاب پوش دشمن بے نقاب ہوتے جا رہے تھے۔ کربلا کے گلزاروں کی خوشبو سب شہروں، قصبوں، گھروں، بازاروں اور گلی کوچوں کو مہکا رہی تھی۔ زنجیروں کی جھنکار نے

حکمرانوں کی نیندیں اڑادی تھیں۔ محلات زلزلوں کی زد میں تھے۔ شہید کربلا کے لہو کی روشنی ظلم، ناانصافی، بے خبری، بے عملی اور مایوسی کے اندھیروں کو دور کرتی آگے ہی بڑھتی جارہی تھی۔

شام شام شام

عابد سے یہ وطن میں کسی نے کیا کلام
گزرے قلق زیادہ کہاں تم پہ یا امام
مولا نے تین بار کہا شام، شام، شام
سر ننگے میرا کنبہ تھا اور گرد خاص و عام

باب۔ ۱۳

یہ بدھ کا دن تھا اور سن اکسٹھ ہجری کے ربیع الاول کی سولہ تاریخ۔ کربلا کے ریگزار سے اپنے پیاروں اور چاند ستاروں کی قبروں پر سے گزرنے والی بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کا قافلہ تقریباً چودہ سو کلومیٹر کا بدترین صحرائی سفر طے کرکے شام میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ شہر یزید کا دارالخلافہ تھا۔

بھوکے پیاسے بچوں اور عورتوں کا یہ قافلہ صحرائی سفر میں میلوں پیدل چلا تھا۔ زیادہ تر بچوں کی پشت پر تازیانوں کے نشان تھے۔ عورتوں کی گردنوں اور بازوؤں پر رسیوں میں بندھے رہنے کی وجہ سے نیل پڑ گئے تھے۔ اس قافلے کے قافلہ سالار کی حالت سب سے گئی گزری تھی۔ گلے میں لوہے کا بھاری طوق، ہاتھوں میں دھوپ سے تپتی آہنی ہتھکڑیاں، پاؤں میں وزنی بیڑیاں۔ سات محرم سے اس کی زندگی میں دکھ اور مصائب کا آغاز ہوا تھا۔ پھر یہ سلسلہ بڑھتا ہی گیا۔ کون سی اذیت تھی جو اس نے صبر و شکر کے ساتھ برداشت نہ کی ہو۔ بھتیجوں، باپ، بھائیوں اور عزیزوں کے قتل کا صدمہ، ماؤں بہنوں اور پھوپھیوں کی بے پردگی کا دکھ، قید و بند کی مصیبتیں، کوفے سے شام کے درمیان شہروں شہروں اپنے گھر کی محترم خواتین کو بازاروں میں بے مقنعہ و ردا

کے درمیان قیدی بنے دیکھنا' دنیا کے حقیر ترین انسانوں کا حکم ماننے پر مجبور ہونا' سیکڑوں میل کے صحرائی سفر کے دوران بات بات پر یزیدی فوجیوں کے کوڑے کھانا' کون سا صدمہ اور کون سی دنیاوی مصیبت ایسی تھی جو اس پر نہ گزری ہو!

لیکن یہ شہید کربلا حسین ابنِ علیؑ جیسے صبر کرنے والے بہادر باپ کا بہادر بیٹا تھا۔ اس کا صبر انسانوں کے تصور سے بالاتر تھا۔ مصیبت و آلام کے طوفان' صبر و استقامت کے طوفان اس پہاڑ سے ٹکرا کر دم توڑتے رہے تھے لیکن ابھی مصیبتوں کے بادل چھٹے نہیں تھے۔ ابھی تو صبر و برداشت کے نئے مرحلے طے ہونا تھے اور حضرتِ امام علی ابن الحسینؑ ان طوفانوں کا سامنا کرنے کے لئے اپنی پھوپھی حضرتِ زینب بنتِ علیؑ کے ساتھ تنہا کھڑے تھے۔

دمشق کا شہر دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ کئی دن سے شہر کے گلی کوچوں میں جشن کا سماں تھا۔ تین دن پہلے یزید کو اطلاع دی گئی تھی کہ اس کے فوجی دستے رسول اللہؐ کے خاندان کے قیدیوں کو سارے ملک میں تماشا بنانے کے بعد دمشق کی سرحد سے بارہ میل کے فاصلے پر آکر ٹھہر گئے ہیں اور یزید کے حکم کا انتظار کر رہے ہیں۔ یزیدی دستے کے سردار نے یزید کو لکھا تھا کہ خاندان رسولؐ کے مردوں کے کٹے ہوئے سر اور اہل بیتؑ کی قیدی عورتیں اور بچے ہمارے ساتھ ہیں۔ ہمیں بتایا جائے کہ ہم شہر کے کس دروازے سے' کس وقت شہر میں داخل ہوں۔

اس خط کے پڑھتے ہی یزید خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ اس نے شراب کے کئی جام چڑھائے اور اپنے افسروں کو طلب کر کے انہیں جشن فتح منانے کا حکم دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شام کے گلی کوچے' راستے اور بازار حکومت کے ڈھنڈورچیوں کے ڈھول تاشوں

سے گونجنے لگے۔ راستہ چلتے لوگ، دکانوں کے خریدار، گھروں کی عورتیں اور کھیلتے
کودتے بچے ان ڈھنڈورچیوں کے گرد جمع ہونے لگے۔ جب لوگ جمع ہو جاتے تو ڈھول
پیٹنے والے سرکاری چیلے ڈھول بجانا بند کر دیتے اور بہ آوازِ بلند اعلان کرتے کہ یزید کے
عراقی گورنر نے حکومت کے ایک بہت بڑے باغی کو قتل کر دیا ہے۔ اس باغی کے
خاندان کی عورتیں اور بچے یزید کے دربار میں پیش ہونے کے لئے شہر کے باہر پہنچ چکے
ہیں۔ اس شاندار فتح کی خوشی میں یزید کا حکم ہے کہ ہر شخص اپنے گھر کو سجائے۔ جن
لوگوں کے گھر باب جیرون سے خلیفہ کے محل کے راستے میں واقع ہیں وہ اپنے گھروں
پر نیا رنگ و روغن کرائیں۔ راستوں اور چھتوں پر چراغ جلائے جائیں۔ دروازوں پر
رنگین پردے سجائے جائیں۔ گلیوں میں صفائی کے بعد عرق گلاب چھڑکا جائے۔ سب
لوگ عید کا لباس پہنیں۔ کوئی عورت چہرے پر نقاب نہ ڈالے۔ جو لوگ گانا بجانا جانتے
ہیں اپنے سازوں کے ساتھ گھروں سے نکل آئیں اور چوراہوں پر ناچ گانوں کی محفل
برپا کریں۔ آج کے دن حرام محرّم حرام نہیں رہ چکے ہیں۔ اور یزیدی حکومت جشن منانے
والوں کو قیمتی انعامات عطا کرے گی۔

یہ اعلان سن کر ہر شخص خوشی سے ناچنے لگا۔ گھروں، گلیوں اور محلوں کو سجانے
کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ شراب کے مٹکے گھروں سے نکل آئے۔ زرق برق پوشاکوں میں
آئی چھیلیوں، گویوں، رقاصوں، اپنے لفنگوں اور بدکردار عورتوں کی بن آئی۔ سارا شہر
بےہنگم موسیقی اور کانوں کے پردے پھاڑ دینے والے باجوں کی آوازوں سے گونجنے لگا۔

شام کی سرزمین ہمیشہ سے اللہ کے برگزیدہ نبیوں کی امتحان گاہ رہی تھی۔ اسی سر
زمین پر حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے تو یہاں کے رہنے والوں نے ان کی عظیم المرتبت ان

کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔ اسی سرزمین پر حضرتِ عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھایا گیا۔ اللہ کے نبی حضرتِ دانیالؑ کو اسی سرزمین کے باشندوں نے زمین میں زندہ دفن کیا۔ اسی سرزمین پر حضرت زکریاؑ کو آرے سے دو ٹکڑے کیا گیا۔ حضرت صالحؑ کے ناقے (اونٹنی) کا قتل کرنے والے بھی یہی شامی تھے۔ اللہ کے کتنے برگزیدہ پیغمبرانؑ وحشی درندوں کو انسان بنانے کے لئے یہاں آئے لیکن ان کی درندگی، سفاکی اور بربریت میں آج بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

آج یہ وحشی درندے اللہ کے آخری رسولؐ رحمت للعالمینؐ کے خاندان کے عظیم انسانوں کو سفاکی کے ساتھ قتل کر کے رسولؐ کی اولاد کو رسیوں میں جکڑ کر اس شہر میں بڑے فخر و غرور کے ساتھ داخل ہونے والے تھے!

☆☆☆

یزید کے حکم پر ایک سو بیس جھنڈے بنائے گئے تھے۔ ہر جھنڈے کے نیچے سینکڑوں ناچتے گاتے تماشائی موجود تھے اور یہ سارا جلوس فوجیوں کے زیر نگرانی شہر کے اس داخلی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں سے یزیدی فوجی آل محمدؐ کے قیدیوں کو لے کر شہر میں داخل ہونے والے تھے۔

شہر سے آنے والا استقبالی جلوس ناچتا گاتا شہر کے بیرونی دروازے تک آ گیا تھا۔ شہر کے باہر سے اندر داخل ہونے والا فوجی دستہ قیدیوں کو ساتھ لیے اندر داخل ہو رہا تھا۔ ٹھاٹھیں مارتے ہجوم کا ایک سمندر تھا جو راستوں، دکانوں، مکانوں اور چھتوں پر لہریں مار رہا تھا۔ اس ہجوم کو کنٹرول کرنے کے لئے سیکڑوں گھڑ سوار موجود تھے جو ہاتھوں میں نیزے اور کوڑے لیے لوگوں کو قافلے کے راستے سے ہٹا رہے تھے۔ ساری

یہ کامیابی ہی تو تھی کہ کوفے سے شام تک کے مسلمانوں کی آنکھیں کھلتی جا رہی تھیں۔ گاؤں گاؤں شہر شہر ہر گھر میں حسین ابنِ علیؑ کا تذکرہ تھا۔ رسول اسلامؐ اور ان کے اہل بیت کی مظلومیت ہر دل میں گھر کرتی جا رہی تھی۔ نیک و بد کی تمیز پیدا ہو رہی تھی۔ خیر و شر الگ الگ نظر آنے لگے تھے۔ جہاد جیسا اسلامی فریضہ لوگوں کو دوبارہ یاد آنے لگا تھا۔ کوفے اور مدینے میں جیالے اور بہادر نوجوانوں کے گروہ اسلام کے نقاب پوش دشمنوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

خوشیاں مناتے اس ہجوم میں ایک شخص نیزے پر بلند امام حسینؑ کے سر مبارک کو ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کا نام سہل ابن سعد تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سر کسی باغی کا نہیں اسلام کے حقیقی محافظ کا سر ہے۔ اس کے سانس بے قابو ہو رہے تھے۔ وہ بار بار اپنے ہاتھوں کو اپنے دانتوں سے کاٹتا اور اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتا لیکن پھر ایک لمحہ ایسا آیا کہ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ اپنی جان کی پروا کیے بغیر اس نے زور سے چیخ ماری اور اپنے منہ پر طمانچے مارتے ہوئے پوری طاقت سے بولا۔

"یا اللہ۔۔۔ یا اللہ فریاد ہے تجھ سے ان جسموں کے لئے جنہیں وطن سے دور ریت پر ذبح کر دیا گیا، جنہیں بے گور و کفن چھوڑ دیا گیا۔

فریاد ہے تجھ سے میرے مالک! ان رخساروں پر جنہیں خاک و خون میں لتھیڑ دیا گیا اور اس ریش مبارک پر جسے خون سے رنگ دیا گیا۔"

ارد گرد کے لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ شخص صدمے سے بے حال تھا اور بے اختیار اپنے سینے کو پیٹے جا رہا تھا۔

"یا رسول اللہؐ! کاش آج آپؐ کی آنکھیں اپنے بیٹے حسین ابنِ علیؑ کے سر کو

شخص سہل ابن سعد ہجوم کو چیرتا ہوا ان خاتون کے اونٹ کے قریب پہنچا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو بند کر کے اپنا چہرہ اوپر کیا اور بولا۔ "السلام علیکم یا اہلِ بیت محمدؐ ورحمت اللہ و برکاتہ"

اونٹ پر بیٹھی ہوئی اس غمزدہ خاتون نے نیچے دیکھ کر اس سلام کا جواب دیا اور حیرت سے پوچھا۔ "اے خدا کے بندے! تم کون ہو کہ ہمیں بازار شام میں اس طرح سلام کر رہے ہو؟"

"میں سہل ابن سعد ہوں۔ شہر "زور" کا رہنے والا۔ بیت المقدس کی زیارت کو جا رہا تھا، بد قسمتی مجھے اس شہر میں لے آئی۔ میری آنکھیں اندھی کیوں نہ ہو گئیں کہ انھوں نے وہ دیکھا جو نہیں دیکھنا تھا۔۔۔" اس نے اپنے منہ کو پیٹتے ہوئے کہا پھر اس نے اپنی آواز پر قابو پایا۔ "آپ۔۔۔ کہیں بنت۔۔۔ زہراؑ۔۔۔ تو نہیں؟" اس نے اٹک اٹک کر سوال کیا۔

"ہاں! میں زینب ہوں۔۔۔ علیؑ و فاطمہؑ کی بیٹی! رسولؐ کی نواسی لیکن۔۔۔ تم نے مجھے کیسے پہچانا؟" جنابِ زینبؑ نے پوچھا۔

"میری چھٹی حس مجھے بتا رہی تھی ورنہ مدینے اور کوفے میں تو آپؑ کا پردہ اتنا مشہور تھا کہ آپؑ کے پڑوسیوں نے بھی کبھی آپؑ کی آواز نہیں سنی تھی۔ آپؑ میرے لئے حکم فرمائیں۔۔۔" سہل نے سر جھکا کے عرض کی۔

"سہل! اگر ہو سکے تو نیزے پر سر اٹھانے والوں سے سفارش کر دو کہ وہ شہیدوں کے سروں کو ہمارے اونٹوں سے دور لے جائیں تاکہ تماش بینوں کی توجہ

یزیدیوں پر حملہ آور ہو گیا۔" سہل نے روتے روتے بتایا۔

اس وقت جنابِ زینبؑ کا دل بھر آیا۔ آپؑ نے مدینے کی طرف رخ کر کے فریاد کی۔ "اے نانا! اے رسول خدا آپ دیکھ رہے ہیں کہ آج شام کے بازار میں آپؐ کی اولاد کی مظلومیت اس حد کو پہنچ گئی کہ غیر مسلم ہم پر ترس کھا رہے ہیں اور آپ کی امت کے دلوں سے رحم و ہمدردی کا جذبہ فنا ہو گیا ہے۔"

عین اسی وقت نقارے بجنے لگے۔ یزید کے محل کی جانب سے کچھ گھڑ سوار اس طرف آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں جھنڈے تھے۔ وہ بڑھتے ہوئے ہجوم کو ٹھہرنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کے قدم رکنے لگے۔ سواروں نے گھوڑوں کی لگاموں کو کھینچ لیا اور تماش بینوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر پر سکون ہو گیا۔

آنے والے یزیدی فوجی چیخ چیخ کر اعلان کر رہے تھے۔ "امیر المومنین کا حکم ہے کہ قیدیوں کو اسی جگہ ٹھہرایا جائے۔ ابھی محل کی تزئین و آرائش مکمل نہیں ہوئی۔ آئندہ حکم تک تمام لوگ یہیں ٹھہریں" یہ کہہ کر ان فوجیوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں موڑیں اور یزید کے محل کی طرف واپس جانے لگے۔

یزید کا یہ حکم تھکے ماندے قیدی عورتوں اور بچوں پر قیامت بن کر ٹوٹا تھا۔ جس گندے ہجوم میں ایک لمحہ گزارنا مشکل تھا وہاں انجانی مدت تک ٹھہرنا بہت بڑی مصیبت تھا۔

یہ قافلہ باب جیرون پر تین گھنٹے ٹھہرا رہا۔ دمشق کے اس دروازے کا نام بعد میں "باب الساعات" اسی لیے پڑا تھا۔

یہ شام کی سرزمین تھی۔ انبیاءؑ کی امتحان گاہ۔ وحشی درندوں کی سرزمین۔ آج

اس سرزمین پر اللہ کے آخری رسولؐ کے اہل بیت صبر، شکر اور اللہ پر یقین کے امتحان سے گزر رہے تھے اور ان کے اردگرد وحشی درندوں کے غول پھیلے ہوئے تھے۔

فرشتے گروہ در گروہ آسمان سے اتر رہے تھے اور امام حسینؑ کے
سرِ مبارک کے گرد احترام سے کھڑے ہوتے جا رہے تھے۔
ان خاتون کی درد بھری آواز زمین سے آسمانوں تک پھیلتی جا رہی تھی۔

باب۔ ۱۴

گرمی اور حبس کی شدت کی وجہ سے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ انسانوں کا ایک سمندر تھا جو گلی کوچوں سے امنڈا پڑ رہا تھا۔ حفاظتی دستے نے اسیران آلِ محمدؐ کے اردگرد حصار بنا رکھا تھا۔ پر جوش تماش بینوں کے نعرے ‘طنزیہ فقرے اور حقارت آمیز نگاہیں قیدی عورتوں اور بچوں کے دلوں کو زہریلے تیروں کی طرح چھلنی کر رہی تھیں۔ عجیب بے بسی اور بے کسی کا وقت تھا۔ وہ عظیم خاندان جس کی عصمت اور پاکیزگی کے قصیدے قرآن مجید نے پڑھے تھے‘ وہ خاندان آج شام کے بازاروں میں اپنے ہی آزاد کئے ہوئے غلاموں کے نرغے میں تماشا بنا ہوا تھا۔ مظلوموں کے اس قافلے کو باب جیرون نامی دروازے پر تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ یہ تین گھنٹے ان مظلوم بچوں اور محترم خواتین پر تین صدیاں بن کر گزرے تھے

آخر اذیت ناک انتظار کے لمحے ختم ہوئے۔ یزیدی محل کی جانب سے سپاہیوں کا خصوصی دستہ جھنڈے لہراتا باب جیرون کی طرف بڑھنے لگا۔ محل کی تزئین و آرائش مکمل ہو چکی تھی۔ یزیدی محل کی جانب سے آنے والے سپاہی اپنے جھنڈوں کو ایک خاص انداز میں ہلا رہے تھے۔

آگے بڑھ آیا تھا۔ راستے کے مکانوں کی چھتیں کھڑکیاں اور دروازے تماش بین عورتوں سے چھلکے پڑ رہے تھے۔ ایک دو منزلہ مکان کے آگے ایک چھجا نکلا ہوا تھا۔ اس چھجے پر کئی عورتیں بیٹھی تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک اسی سالہ بڑھیا نے رسیوں میں بندھی ہوئی رسول کی نواسی کو دیکھا۔ کسی نے اس عورت کو بتایا کہ یہ علی ابن ابی طالبؑ کی بڑی بیٹی زینبؑ ہے۔ یہ سن کر اس بوڑھی عورت نے اپنے ساتھ بیٹھی عورتوں سے کہا کہ زینبؑ کا اونٹ قریب آئے تو تم علیؑ کی بیٹی کے پتھر ضرور مارنا۔ اس عورت کا سینہ اہل بیت اور خاص طور پر حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی دشمنی سے جہنم بنا ہوا تھا۔

جناب زینب بنت علیؑ کا اونٹ جیسے ہی اس مکان کے سامنے سے گزرا تو چھجے پر بیٹھی ہوئی عورتوں نے شہزادی زینبؑ کی طرف پتھر مارنا شروع کر دیئے۔ ان میں سے ایک پتھر نیزے پر موجود حضرت امام حسینؑ کے چہرہ مبارک پر جا کر لگا۔ آپؑ کے چہرے سے خون بہنے لگا۔

اسی وقت جناب علی ابن الحسینؑ کی نظریں اپنے بابا کے سر کی طرف گئیں۔ اپنے بابا کے ہونٹوں سے تازہ خون بہتے دیکھ کر آپ کا دل پھٹنے لگا۔ صبر و ضبط کے بندھن ٹوٹنے لگے۔ آپؑ نے آسمان کی طرف دیکھا اور بے اختیار کہا۔ ''یا اللہ! ان گستاخ عورتوں کو جہنم میں داخل فرما۔''

دعا کے الفاظ ابھی مکمل بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس مکان کی طرف سے گزرنے والا ہجوم گھبرا کر اوپر دیکھنے لگا۔ انہیں مکان کے چھجے پر سے لکڑیوں کے چرچرانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر وہ لوگ چیختے ہوئے بھاگے اور اسی لمحے مکان کا چھجا ایک دھماکے کے ساتھ زمین پر آ گرا۔ پتھر مارنے والی عورتیں ملبے کے نیچے دب کر زندگی

دربار کا جائزہ لینے کے بعد اس کے موٹے موٹے ہونٹوں کو حرکت ہوئی اور ا
نے حکم دیا کہ باغیوں کے کٹے ہوئے سر اس کے سامنے پیش کئے جائیں اور قیدیو
دربار کے باہر کھڑا رکھا جائے۔

ذرا ہی دیر میں سنہری پٹکوں سے آراستہ غلاموں کا ایک گروہ اندر داخل ہوا۔ ان
ہاتھوں میں سونے اور چاندی کے تھال تھے۔ ان حبشی غلاموں کے آگے آگے ایک انت
مکروہ شکل کا لمبا تڑنگا آدمی چل رہا تھا۔ اس شخص کا رنگ کالا' ناک چپٹی مگر لمبی۔ آنکھیں ا
کو دھنسی ہوئی' چہرے پر برص کے سفید داغ اور سامنے کے دو دانت آگے نکلے ہوئے ن
آرہے تھے۔ اس کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بال خنزیر کے بالو
کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ وہ یزید کو خوشامدانہ نظروں سے دیکھتا ہوا قدم قدم آگے بڑ
رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک طلائی تھال تھا اور اس تھال میں رسولؐ کے نواسے کا خو
میں ڈوبا ہوا سر رکھا ہوا تھا۔ کتے کی شکل والا یہ انسان شمر ذی الجوشن تھا۔

شمر کا اصل نام شرجیل اور کنیت ابو سابغہ تھی۔ یہ بنی کلاب کے قبیلے سے تعلق
رکھتا تھا اور قبیلہ ہوازن کے رئیسوں میں شمار ہوتا تھا۔ کوفے میں اسے بڑا بہادر او
جنگجو انسان سمجھا جاتا تھا۔ اس کا باپ ذی الجوشن تھا۔ ایران کے ایک بادشاہ نے ا
ایک زرہ انعام میں دی تھی جس کی وجہ سے وہ ذی الجوشن (یعنی زرہ والا) مشہو
ہو گیا تھا۔ شمر کی ماں ایک روز اپنے گھر سے صحرا کی طرف نکلی۔ راستے میں اسے سخت
پیاس لگنے لگی۔ اس نے ایک چرواہے سے پانی مانگا۔ چرواہے نے پانی کے بدلے اس ک
جسم طلب کیا۔ ان دونوں کے فعلِ حرام کے نتیجے میں شمر لعین پیدا ہوا۔

یہ شخص جنگ صفین میں حضرت علی علیہ السلام کی فوج میں شامل تھا لیکن بعد میں

شراب کی بدبو اردگرد پھیل گئی۔ پھر اس نے امام حسینؓ کے سر مبارک کو اپنے چہرے کے سامنے کیا اور خوشی سے بے قابو کر اپنے شعر پڑھنے لگا:

"ہم ایسے لوگوں کے سر کاٹ دیتے ہیں جو اللہ کے نزدیک ہم سے زیادہ معزز ہوتے ہیں۔ ہمیں تو دنیا کی حکومت چاہیئے اور اس میں ہم کامیاب ہو گئے۔ حالاں کہ اس کے بدلے آخرت میں دہکتی ہوئی آگ ہو گی!"

پھر اس نے اپنے درباریوں کی طرف دیکھا اور بولا:

"حسینؓ فخر کیا کرتا تھا کہ میرا باپ یزید کے باپ سے اور میری ماں یزید کی ماں سے افضل ہے۔ تو جہاں تک حسینؓ کے باپ کا تعلق ہے دنیا جانتی ہے میرے باپ نے حسینؓ کے باپ کو شکست دے دی تھی۔ ہاں میں اس بات کو مانتا ہوں کہ حسینؓ کی ماں میری ماں سے ضرور افضل تھی۔"

اسی وقت سامنے والی دیوار پر ایک کوا آ کر بیٹھ گیا اور شور مچانے لگا۔ یزید نے ہنستے ہوئے اسے دیکھا اور بولا۔ "ارے کوے! تو بین کرتا ہے تو ضرور کر مگر جس واقعے پر تو رو رہا ہے وہ تو اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ کاش میرے بزرگ جو میدان میں (علیؓ کے ہاتھوں) قتل ہوئے آج زندہ ہوتے تو یہ منظر دیکھ کر کس قدر خوش ہوتے۔۔۔!" یزید سر امام حسینؓ کو ہوا میں لہراتے ہوئے بڑبڑایا۔ "ہم نے محمدؐ کے بیٹوں سے اپنے بزرگوں کا بدلہ لے لیا۔"

پھر اس نے ایک قہقہہ لگایا اور درباریوں کو مخاطب کر کے بولا:

رسول اللہؐ کا زمانہ دیکھا تھا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ رسول اللہؐ حسنؑ و حسینؑ سے کس قدر محبت کرتے تھے۔ رسول اسلامؐ تو حسنؑ و حسینؑ کو اپنے جسم کا ٹکڑا کہا کرتے تھے۔ وقت کے بدلنے سے احترام کے معیار بھی بدلتے گئے۔ سیاست‘ دولت‘ عہدوں کے‘ لالچ موت کے خوف اور مفلسی کے خطروں نے زبانوں کو خاموش کر دیا تھا۔ سچ کہنے میں مصلحتیں آڑے آنے لگی تھیں۔

ابھی تک یہ سارے بزرگ خاموش تھے لیکن جب یزید نے نواسۂ رسولؐ کے دانتوں پر چھڑی مارنا شروع کی تو ایک بزرگ صحابی رسولؐ سے نہ رہا گیا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں یزید کو ڈانٹا۔ ”یزید! کچھ تو شرم کر۔ تو ان مبارک دانتوں کی بے حرمتی کر رہا ہے جنہیں اللہ کے رسولؐ بوسے دیا کرتے تھے۔“

یزید نے تیوریاں چڑھا کر ان صحابی کی طرف دیکھا۔ ”سمرہ بن جندب! اگر تم صحابی رسولؐ نہ ہوتے تو میں اس گستاخی پر تمہیں قتل کرا دیتا۔“

جناب سمرہ بن جندبؓ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ”ارے ظالم انسان! میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں۔ تو میرا احترام اس لئے کر رہا ہے کہ میں صحابی رسولؐ ہوں۔ اب تو یہ بتا کہ رسولؐ کا صحابی ہونا زیادہ قابل احترام ہے یا ان کی اولاد ہونا زیادہ قابل عزت ہے؟“

”مجھ سے بحث نہ کرو۔ نکل جاؤ یہاں سے۔۔“ یزید نے لاجواب ہو کر غصے سے کہا۔ سمرہ بن جندبؓ روتے ہوئے دربار سے باہر نکل گئے۔

اسی وقت ایک دوسرے صحابی جناب ابو بردہ اسلمیؓ اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔ ”اللہ کی لعنت ہو تجھ پر یزید! تیری یہ جرأت کہ تو حسین ابن فاطمہؑ کے دندان مبارک کو اپنی چھڑی سے توڑ رہا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں میں نے بے شمار مرتبہ یہ دیکھا کہ رسول اللہؐ

پردے کو چیرا اور حبشی غلاموں کے درمیان سے چیختی ہوئی باہر نکلی۔ یہ ایک کنیز تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی آئی اور یزید کے تخت کے سامنے کھڑی ہو کر رونے لگی۔

"کیا ہوا ہے تجھے؟" یزید نے شراب کی صراحی تخت پر پھینکتے ہوئے اسے ڈانٹا۔

"اللہ تعالیٰ تیرے ہاتھوں اور پیروں کو کاٹ دے یزید! اور تجھے جہنم کی آگ سے پہلے اس دنیا میں بھی آگ میں جلائے۔ اے ملعون! تو نواسۂ رسولؐ کے ان مبارک دانتوں کی بے ادبی کر رہا ہے جنھیں رسول اللہؐ چومتے ہوئے نہیں تھکتے تھے!" کنیز کی آواز شدت غم سے کپکپا رہی تھی۔

"تیرا دماغ تو نہیں چل گیا!" یزید غرایا۔ "یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے تو نے۔ شاید تجھے اپنی زندگی پیاری نہیں؟"

"مجھے اپنی زندگی کی کوئی پروا نہیں۔ تیرا جو دل چاہے وہ کرنا میرے ساتھ لیکن جو کچھ مجھ پر گزری ہے وہ سن لے۔" کنیز نے روتے ہوئے کہا۔

"بتا کیا گزری ہے تجھ پر؟" یزید غرایا۔

"ایسے نہیں۔ ان تمام درباریوں کے سامنے مجھ سے وعدہ کر کہ جب تک میں اپنی بات پوری نہ کر لوں تو مجھے درمیان میں روکے گا نہیں۔ بعد میں تو مجھے قتل بھی کرنا چاہے تو کر دینا۔" کنیز نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے یزید سے کہا۔

"ٹھیک ہے میں وعدہ کرتا ہوں۔ اب جلدی بول کیا ہوا ہے تیرے ساتھ؟" یزید گاؤ تکیے کے ساتھ کمر ٹکا کر آرام سے بیٹھ گیا۔

"تو نے وعدہ کر لیا ہے تو اب سن کہ مجھ پر کیا بیتی۔" کنیز نے بلند آواز سے کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے میں اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ میں یہ نہیں بتا سکتی کہ میں

سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی لیکن میں نے جو دیکھا وہ ایک حقیقت تھی۔ میرا چہرہ آسمان کی طرف تھا۔ اچانک کمرے کی چھت میری نظروں سے غائب ہو گئی اور کھلا آسمان صاف دکھائی دینے لگا۔ میں نے دیکھا کہ آسمان سے لے کر زمین تک سفید روشنی سے بنا ہوا ایک راستہ ہے۔ اس راستے کے ذریعے دو نورانی وجود زمین پر اتر رہے ہیں۔ انہوں نے سبز ریشم کے لباس پہن رکھے ہیں۔ نیچے آکر انہوں نے میرے گھر کے صحن میں ایک خوب صورت دری بچھائی۔ اس دری سے اتنی روشنی نکل رہی تھی کہ مجھے مشرق سے مغرب تک ہر چیز صاف دکھائی دینے لگی تھی۔

میں نے دوبارہ آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان سے زمین تک چمکتے ہوئے اس راستے سے ایک نوجوان نیچے اتر رہے تھے۔ نوجوان کے چہرے سے روشنی دور دور تک پھیل رہی تھی۔ وہ نوجوان سر جھکائے ہوئے تھے۔ ان کی داڑھی کے بالوں میں مٹی لگی ہوئی تھی۔ گریبان کھلا ہوا تھا۔ رخسار آنسوؤں سے تر تھے۔ چہرے پر درد و غم کی ایسی کیفیت تھی کہ انہیں دیکھ کر میرا دل پھٹا جاتا تھا۔

یہ نوجوان فرش پر بچھی ہوئی دری پر آ بیٹھے۔ تو میں نے ان کے ہونٹوں کو ہلتے ہوئے دیکھا۔ ان کے ہونٹوں سے ہلکی ہلکی سسکیاں نکل رہی تھیں۔ آواز ہلکی ہونے کے باوجود مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ سسکیوں کی یہ آوازیں زمین سے آسمان تک پھیلتی جا رہی ہیں۔ وہ درد و غم میں ڈوبی ہوئی آواز میں پکار رہے تھے۔ ”اے میرے بابا آدم! یہاں تشریف لایئے۔۔۔ اے میرے بابا ابراہیم! آپ میرے پاس آئیں۔ اے میرے بھائی موسیٰ! مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ اے میرے بھائی عیسیٰ! آپ کہاں ہیں؟ آئیں میرے پاس آئیں۔“ وہ اللہ کے نبیوں کو پکارتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔

یزید کی بھنویں چڑھی ہوئی تھیں۔وہ بڑی ناگواری سے کنیز کو دیکھ رہا تھا لیکن کنیز کو اس کی پروا نہیں تھی۔وہ اپنی دھن میں بولے جا رہی تھی۔

''پھر میں نے دیکھا کہ اس صحن میں ایک نورانی فرش بچھایا گیا اور آسمان سے زمین تک پھیلے ہوئے سفید براق راستے سے ایک سیاہ پوش خاتون نیچے اتریں۔ان کے سر کے بال کھلے ہوئے تھے۔بالوں میں صحرا کی ریت چمک رہی تھی۔انہوں نے اپنا ہاتھ اپنے ایک پہلو پر رکھا ہوا تھا۔شاید اس طرف سے وہ زخمی تھیں۔ان کے ہاتھ میں ایک عصا تھی جس کے سہارے وہ آگے بڑھ رہی تھیں۔ان کا چہرہ درد و مصیبت کی تصویر بنا ہوا تھا۔یہ خاتون فرش پر بیٹھ کر بین کرنے لگیں۔

روتے روتے انہوں نے آسمان کی طرف رخ کیا اور بولیں۔''اماں حواؑ! اماں حاجرہؑ! اماں خدیجہؑ! آپ اپنی بیٹی کے پاس آکر بیٹھیں۔میری بہن مریمؑ! آپ بھی یہاں آئیں۔''

میں نے محسوس کیا کہ ان خاتون کی درد بھری آواز زمین سے آسمانوں تک پھیلتی جا رہی تھی۔ان کی آواز میں ایسا درد تھا کہ سارا ماحول درد و غم میں ڈوب گیا۔

اسی وقت میں نے ایک آواز سنی۔یہ آواز آسمان سے آ رہی تھی مگر آواز دینے والا کہیں نظر نہ آتا تھا۔یہ آواز کہہ رہی تھی کہ پہلے جو نوجوان انبیاء و مرسلینؑ کو پکار رہے تھے وہ نبیوںؑ کے سردار حضرت محمد مصطفیؐ ہیں اور جو خاتون بعد میں آئیں وہ اللہ کے رسولؐ کی اکلوتی بیٹی اور مظلوم کربلا حسین ابنِ علیؑ کی ماں' فاطمہؑ بنت محمدؐ ہیں۔''

یزید نے بے چینی سے پہلو بدلا۔کنیز نے درباریوں کو دیکھا اور بولی۔''یہ سن کر میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔میں نے چاہا کہ اٹھوں اور ان عظیم ہستیوں کے قدموں کو بوسہ دوں، لیکن میرے ہاتھ پیر کام نہیں کر رہے تھے۔میں بس دیکھ سکتی یا

سن سکتی تھی، اپنی جگہ سے اٹھنا میرے بس میں نہیں تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر نظریں گھمائیں تو مجھے فرش پر بہت سے نورانی وجود دکھائی دیے۔ اسی وقت جناب زہراؑ نے رسول اللہ کو مخاطب کیا۔ "بابا جان! آپؐ نے دیکھا کہ آپ کی امت نے میرے حسینؑ کے ساتھ کیا سلوک کیا۔" یہ کہہ کر جناب زہراؑ ہچکیوں سے رونے لگیں۔

جناب رسول خداؐ کا چہرہ مبارک شدت غم سے زرد ہو رہا تھا آپ کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر تھی۔ آپؐ نے اپنی بیٹی کو سینے سے لگایا اور رونے لگے۔ پھر اللہ کے رسولؐ نے حضرت آدمؑ کی طرف دیکھا۔ "اے میرے جد بزرگوار! آپ نے دیکھا کہ ان باغیوں نے میرے بیٹے حسینؑ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟"

حضرت آدمؑ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ انہوں نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیا۔ ان کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ پھر میں نے بہت سے مردوں اور عورتوں کے رونے کی آوازیں سنیں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے زمین اور آسمان کی ساری فضا گریہ و ماتم کی ان آوازوں سے پر ہو گئی ہو۔ اسی وقت [illegible] مجھے امام حسینؑ سورج کی طرح چمکتا نظر آیا۔ فرشتے [illegible] امام حسینؑ کے اردگرد احترام سے [illegible] تھے۔ [illegible] سر جھکائے آگے بڑھتے۔ امام حسینؑ [illegible] فضا میں سسکیوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اس وقت مجھے پتہ چلا [illegible] ہوں۔ میں نے ان فرشتوں سے پوچھا۔ "تم لوگ کون ہو؟"

"ہم اللہ کے فرشتے ہیں۔" مجھے جواب ملا۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"ہم سید الشہداء حضرت حسین ابنِ علیؑ کی زیارت کے لئے آئے ہیں۔" فرشتوں نے جواب دیا۔

پھر میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان کی مختلف سمتوں سے عذاب کے فرشتے نیچے اتر رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں آگ سے بنے ہوئے گرز اور نیزے تھے۔ ان نیزوں کے آگے آگے آگ کے تند و تیز شعلے لپک رہے تھے اور یہ آگ تیرے گھر میں ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ ایک فرشتہ آگ کا گرز لئے تیرے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ پھر مجھے تیری چیخیں سنائی دیں۔ تیری آوازوں کے بلند ہوتے ہی ایسا لگا جیسے سوتے سوتے میری آنکھ کھل گئی ہو لیکن خدا کی قسم نہ میں سوئی تھی اور نہ کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔"

"میں فوراً اپنے بستر سے اٹھی اور دربار کی طرف بھاگی کہ تجھے خبردار کر دوں۔ یہاں آکر پردے کے پیچھے سے میں نے دیکھا کہ فرزند رسولؐ کا سرِ مبارک تجھے پیش کیا گیا۔ پھر میں نے دیکھا تو میرے آقاؑ کے دندان مبارک پر چھڑی مار رہا ہے۔۔۔ ہٹا لے اپنی چھڑی کو یہاں سے یزید! اللہ تیرے ان ہاتھوں کو شل کر دے اور تجھے جہنم سے پہلے اس دنیا میں بھی آگ میں جلائے۔"

یہ کہتے کہتے کنیز کی آواز بھرانے لگی اور وہ سر جھکا کر زار و قطار رونے لگی۔

اپنی ذلت اور رسوائی کے یہ لمحے یزید نے بڑی مشکل سے گزارے تھے۔ اگر وہ پوری بات سننے کا وعدہ نہ کر چکا ہوتا تو اسے کبھی کا قتل کرا چکا ہوتا۔ بھرے دربار میں ایک کنیز اسے اس طرح ذلیل کرے گی یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس نے تو یہ ساری محفل اپنی شان و شوکت دکھانے کے لئے سجائی تھی۔ عظیم الشان

سلطنت کے بڑے بڑے سرداروں، شیخوں، عالموں، قاضیوں، فوجی حکمرانوں، گورنروں اور غیر ملکی سفیروں کو تو اس نے اپنی بے پناہ طاقت دکھانے کے لئے یہاں جمع کیا تھا۔ لیکن کنیز کے آنسوؤں، اس کے لہجے کی سچائی، یقین اور اعتماد نے اس کے گناہوں کی غلاظت بھرے دربار میں اس کے منہ پر مل دی تھی۔ وہ خود کو جواہرات سے سجے ہوئے شاہی تخت پر بیٹھا ہوا ایک حقیر چوہا سمجھ رہا تھا۔ ایسا چوہا جس کے سر پر کسی نے سونے کا تاج رکھ دیا ہو۔

اس نے پہلو بدل کر دربار میں ادھر سے ادھر نظر دوڑائی۔ ہر شخص اس سے نظریں چرا رہا تھا کیونکہ ہر شخص کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ ہر شخص احساس جرم کا شکار تھا۔ ہر طرف ایک گہرا سناٹا تھا۔ کوئی بھی شخص اس وقت یزید کی طرف داری کے لئے دل سے تیار نہیں تھا۔

اس سناٹے سے یزید کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ تنہا رہ گیا تھا۔ اس نے جلدی جلدی شراب کے تین چار گھونٹ حلق سے اتارے اور تن کر بیٹھ گیا۔ "تم نے اپنی بات پوری کر لی؟" وہ ضرورت سے زیادہ زور سے چیخا۔

"ہاں میں نے اپنی بات مکمل کر لی ہے لیکن اللہ کا انتقام ابھی شروع ہوا ہے یزید۔ یہ انتقام آخرت میں مکمل ہوگا۔" کنیز نے تن کر جواب دیا۔

کنیز کے لہجے میں ایسا یقین تھا کہ یزید کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑنے لگی مگر اس نے خود پر قابو پایا۔ "اب اپنی زبان بند [illegible] ---" [illegible] گئی۔ [illegible] گیا۔

پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے حبشی غلاموں کو قریب بلایا۔ "اسے یہاں سے

یہاں۔۔۔ سے اور اس کا سر کاٹ کر باہر پھینک دو۔" اس نے چیختے ہوئے حکم دیا۔ حکم کے غلام ننگی تلواریں سونتے کنیز کو ہر طرف سے گھیر نے لگے۔

"سن لے یزید! جہنم کی آگ کے شعلے تیرے لئے بے قرار ہیں۔" کنیز نے جلادوں کی تلواروں سے خوف زدہ ہوئے بغیر یزید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تو اپنی فکر کر۔" یزید نے طنز کے ساتھ جواب دیا۔

"اب مجھے اپنی کوئی فکر نہیں۔ تیری کنیزوں میں رہتی تو جہنم کی آگ میں جلتی لیکن اب حسینؑ کی مظلوم ماںؑ نے مجھے اپنی کنیزی میں لے لیا ہے۔۔۔ وہ دیکھ۔۔۔ وہ سامنے۔۔۔ دونوں جہاں کی عورتوں کی سردار حضرت فاطمہ بنت محمدؐ سامنے کھڑی ہیں۔ انہوں نے اپنی پاکیزہ چادر کو میرے لئے پھیلا دیا ہے اور اس چادر کے نیچے مجھے فرشتوں کی حمد و ثناء کی آوازیں صاف سنائی دے رہی ہیں۔ تو سمجھتا ہے کہ میرا سر کاٹ کر تو مجھے سزا دے رہا ہے۔ ارے او جہنمی! میرا سر کٹنا تو اہل بیتؑ رسولؐ سے میری محبت کا انعام ہے۔ تیری کیا مجال کہ تو مجھے سزا دے سکے۔۔۔" کنیز کے بازوؤں میں نجانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ حبشی غلام اسے اپنی جگہ سے ہٹانے میں ہانپ گئے تھے۔ اس نے اپنی بات مکمل کر کے خود قدم اٹھائے اور غلاموں کے آگے آگے چلتی ہوئی بڑی شان کے ساتھ دربار کے دروازے سے باہر نکلتی چلی گئی۔

دربار پر ہولناک سناٹا طاری تھا اور یہ سناٹا کسی تیز دھار والے خنجر کی طرح یزید کے دل کو اندر ہی اندر کاٹ رہا تھا!

ٹھوکر میں تاج

سچائی اور مظلومیت کی طاقت نے اس کے تخت و تاج
کو ٹھوکروں میں گرا دیا تھا۔ پہلی ٹھوکر اس کی ایک کنیز
نے ماری تھی اور دوسری ٹھوکر جیسے ہوا نے ماری۔

باب۔ ۱۵

دربار پر گہرا سناٹا طاری تھا۔ اس سناٹے کو ہوا میں لہراتے ریشمی پردوں کی سرسراہٹ اور یزید کے لرزتے ہاتھوں میں سونے کے کنگنوں اور شیشے کے جام کی کھنک توڑ رہی تھی۔ سچائی اور مظلومیت کی بے پناہ طاقت نے کئی درباریوں کی آنکھوں کو بھی نم کر دیا تھا۔ یزید کی تنہائی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ بھرے دربار میں اس کی ایک کنیز نے اسے جس طرح ذلیل و رسوا کیا تھا اس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ابھی تک اس دروازے کی طرف دیکھے جا رہا تھا جس دروازے سے اس کی کنیز فاتحانہ انداز سے قدم اٹھاتی جلادوں کے ساتھ باہر نکلی تھی۔

ایک کنیز شراب کی نئی صراحی لے کر آگے بڑھی۔ اس نے یزید کے تخت پر شراب کی نئی صراحی رکھ دی اور الٹے قدموں چلتی ہوئی ایک کونے میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ اسی لمحے دربار کے آخری کونے میں بیٹھے ہوئے ایک سارنگی نواز نے اپنی سارنگی کے تاروں کو چھوا۔ سارنگی کی لے بلند ہوئی تو یزید نے شراب کی صراحی سے جام بھرا اور اپنے شعر گنگنانے لگا۔

"ساتھیو اٹھو اور گانے والیوں کی آوازیں سنو
اٹھو اور شراب کے جام پیو اور معانی کا تذکرہ چھوڑو

مجھے تو سارنگی کی لے نے اذان کی آواز سے بے خبر کر دیا ہے۔"

اپنے شعر گنگناتے ہوئے اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اس کی نظریں دربار میں بیٹھے ہوئے سرکاری عالموں کی طرف اٹھ گئیں۔ ان کی سفید داڑھیوں' ان کی عباؤں قباؤں' ان کے رکھ رکھاؤ اور ہاتھوں میں گردش کرتی تسبیحوں کو دیکھ کر وہ بے اختیار مسکرایا۔ پھر اس نے اپنے شعر پڑھے۔

"اگر دین محمد میں شراب کو حرام کہا گیا ہے تو کوئی بات نہیں تم عیسائیوں کے مذہب میں اسے حلال سمجھ کر پی لو! اور یہ جو باتیں تمہیں سنائی جاتی ہیں کہ کوئی قیامت کا دن بھی ہوگا یہ سب ایسی بے ہودہ باتیں ہیں جن سے دل پریشان ہوتا ہے۔"

مملکت کے قاضی اور جہاندیدہ عالم قاضی شریح کی نظریں زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ اس کا اصل نام شریح بن حارث تھا اور یہ کندی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ نبی کریمؐ کے زمانے میں یہ جوان تھا مگر نبی کریمؐ کی زیارت نہیں کر سکا۔ یہ شخص بلا کا ذہین اور قابل آدمی تھا۔ خلیفہ ثانی نے اپنے دور میں اسے کوفے کا قاضی مقرر کیا تھا۔ خلیفہ سوم کے دور میں بھی یہ اسی عہدے پر فائز رہا۔ حضرت علی علیہ السلام نے بھی اپنے دور میں اسے اس کے عہدے پر قائم رکھا۔ بعد میں جب کوفہ حکومت شام کی چھاؤنی بنا تو شامی حکمران نے بھی اس کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے اسے اس کے عہدے پر برقرار رکھا۔ جب یزید برسر اقتدار آیا تو اس کے گورنر ابن زیاد نے اسے منہ مانگی قیمت دے کر خریدا اور یزیدی حکومت کے استحکام کے لیے اس سے مشورہ طلب کیا۔

قاضی شریح اب ساٹھ سال کا جہاں دیدہ انسان تھا۔ اس نے ابن زیاد کو رائے

دی کہ ملک بھر کے عالموں، متقی پرہیزگار لوگوں، قرآن کے حافظوں، مسجدوں کے خطیبوں، حدیثیں جمع کرنے والوں، تفسیر قرآن بیان کرنے والوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زمانہ دیکھے ہوئے بزرگ حضرات سے یزید کی حمایت میں ایک عہد نامے پر دستخط کرا لیے جائیں۔ ان میں سے جو شخص خلیفۂ وقت یزید ابن معاویہ کی بیعت کرنے سے انکار کرے اسے واجب القتل سمجھا جائے۔

یہ حلف نامہ بڑے اہتمام سے تیار کیا گیا تھا۔ بہت سے لوگوں نے تو خوشی خوشی اس پر دستخط کیے اور کچھ لوگوں سے زبردستی کروائے گئے۔ کسی کو جان جانے کا خوف تو کسی کو عہدوں سے چمٹے رہنے کا لالچ۔ یہ حلف نامہ دراصل شریعت کی وہ تلوار تھی جس نے اسلام کے سچے شیدائیوں کی گردنیں ایک ایک کر کے کاٹ ڈالیں اور ظالموں کے لیے سب سے بڑی ڈھال بن کر یزید اور اس کی حکومت کے بدترین جرائم کو چھپا لیا۔

یہ تلوار سب سے پہلے کوفے میں اہل بیت کے ایک چاہنے والے جناب ہانی بن عروہ پر گری کیونکہ انہوں نے سفیر حسینؑ حضرت مسلم بن عقیلؑ کو ابن زیاد کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ صحابی رسولؐ جناب ہانی بن عروہ کو پانچ سو کوڑے مارے گئے۔ یہ خبر کوفے میں پھیلی تو ان کے قبیلے کے چار ہزار نوجوانوں نے کوفے کے دارالامارہ کو گھیر لیا۔ ابن زیاد گھبرا گیا۔ اس نے قاضی شریح سے کہا کہ تم باہر جا کر ان مشتعل نوجوانوں کو سمجھاؤ۔

قاضی صاحب گورنر ہاؤس کی چھت پر چڑھے۔ انہوں نے مشتعل نوجوانوں کو انتہائی میٹھے لہجے میں سمجھایا، اپنی سفید داڑھی پکڑ کر اللہ رسولؐ کی قسمیں کھائیں اور ان سے کہا کہ میرے ہوتے ہوئے ہانی بن عروہ جیسے عظیم انسان کے ساتھ زور زبردستی

بدسلوکی نہیں ہو سکتی۔ ان کی طرف کوئی آنکھ بھر کر نہیں دیکھ سکتا۔ وہ تو گورنر کے مہمان بنے ہوئے ہیں اور آپ کو جو خبریں پہنچائی گئی ہیں ان کا مقصد مسلمانوں کو ایک دوسرے سے لڑانے کے علاوہ کچھ نہیں۔

حقیقت حال یہ تھی کہ اس وقت ہانی بن عروہؓ قتل کیے جا چکے تھے۔ ہجوم میں سے کئی باخبر لوگوں نے کہا کہ یہ بڈھا جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آؤ۔ یہ ایک بکا ہوا عالم ہے مگر زیادہ تر لوگ بے وقوف بن گئے اور ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔

قاضی شریح کے تیار کردہ حلف نامے کا دوسرا شکار حضرت مسلم بن عقیلؓ اور ان کے کم سن بچے بنے اور پھر تو یہ تلوار اس تیزی کے ساتھ چلی کہ اس نے رسول اسلامؐ کے پورے خاندان کو کاٹ کر رکھ دیا۔ علیؑ و فاطمہؑ کا گھر اجڑ گیا۔ عقیل بن ابی طالبؑ کے گھر کے سارے جوان لہو میں نہا گئے، جعفر ابن ابی طالبؑ کا گھر ویران ہو گیا۔ یہ حلف نامہ کبھی تلوار بن جاتا اور کبھی ڈھال۔ اس وقت شام کے دربار میں یزید ابن معاویہ اسی ڈھال کے پیچھے چھپا تخت شاہی پر بیٹھا تھا اور اس کی نظریں قاضی شریح ابن حارث کندی کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں جس کا سر جھکا ہوا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ میری ساری عقل و دانش، مکر و فریب، ذہانت، بہترین صلاحیتوں اور سارے علم و فضل کو سچائی کی طاقت رکھنے والی ایک معمولی کنیز نے ایک لمحے میں خاک میں ملا دیا۔ قاضی شریح کی دوربین نگاہیں یزید کے تخت شاہی کو لرزتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے ایک زمانہ دیکھا تھا۔ یزید کے اشعار سن سن کر وہ ندامت اور شرمندگی کے پسینے میں ڈوبا جا رہا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے یزید جیسے دشمن اسلام کے حق میں فتویٰ دے کر کیا حاصل کیا! یہ ہے خلیفۃ المسلمین امیر المومنین!... شراب نوش کتوں کے ساتھ کھانے پینے والا، بدکردار، اللہ کے پیغام لانے والے کے جگر کے ٹکڑوں کا قاتل، حرام محمد کو حلال اور حلال محمد کو حرام کرنے والا... اسے اسلام سے کیا واسطہ؟ یہ تو نہ جنت کا قائل ہے نہ جہنم کا۔ اس نے تو قیامت کو بھی مذاق سمجھ رکھا ہے۔

پھر قاضی شریح کے دماغ میں اللہ کی کتاب کی آیتیں گونجنے لگیں۔ "بلکہ (حقیقت تو یہ ہے) کہ ان لوگوں نے قیامت ہی کو جھوٹ سمجھ رکھا ہے اور جس شخص نے قیامت کو جھوٹ سمجھا اس کے لیے ہم نے جہنم کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

(سورہ فرقان)

پھر اسے سورہ مریم یاد آئی۔ "کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ہم نے کافروں پر شیطانوں کو (کھلا) چھوڑ رکھا ہے کہ وہ انہیں اکساتے رہتے ہیں؟"

اس وقت یزید کا ایک ایک عمل اور اس کی حرکات و سکنات قرآن کی اس آیت کا واضح نمونہ دکھائی دے رہی تھیں۔

قاضی شریح کے دماغ میں قرآن کی مختلف آیتیں تیزی سے آتیں اور اسے لرزا دیتیں۔ وہ حافظ قرآن تھا۔ قرآن و حدیث کا عالم تھا۔ اسے سورہ بقرہ کی آیت یاد آئی جو اسی جیسے عالموں کے چہروں کو بے نقاب کرنے کے لیے نازل ہوئی تھی۔ "بے شک جو لوگ ان باتوں کو جو اللہ نے کتاب میں نازل کی ہیں چھپاتے ہیں اور اس (چھپانے) کے بدلے تھوڑی سی (دنیاوی) قیمت وصول کر لیتے ہیں (تو) یہ لوگ انگاروں سے اپنے پیٹ بھرتے ہیں۔"

اس نے بھی تو چند حقیر سکوں کے عوض حق کو چھپایا اور باطل کو آگے بڑھایا تھا!

اس کا دل لرزنے لگا۔ اسی لمحے اس کی نظر یزید کے تخت کے نیچے سنہرے تھال میں رکھے ہوئے خون آلود سر کی طرف گئی۔

سید الشہداءؑ کے چہرۂ مبارک پر ایک ابدی سکون پھیلا ہوا تھا۔ آپؑ کی کھلی ہوئی خوب صورت آنکھیں بولتی ہوئی لگ رہی تھیں۔ جیسے یہ آنکھیں اس سے کہہ رہی ہوں۔ ''حارث کے بدنصیب بیٹے! اللہ نے تجھے جو علم' عزت اور مقام عطا کیا اسے تو نے محض چند سکوں کے عوض اللہ کے دشمن کے ہاتھ گروی رکھ دیا۔ سونے کی یہ اشرفیاں کب تک تیرا ساتھ دیں گی۔ دنیا و آخرت کا عذاب تیرے تعاقب میں ہے۔ یزید کے پالتو کتے! تو کب تک بھاگ سکتا ہے اللہ کے عذاب سے!'' قاضی شریح کو جھرجھری سی آگئی۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے یزید کی ایک کنیز نے اس کی تمام سازشوں کو خاک میں ملا دیا تھا۔ اب وہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ سچائی اور مظلومیت کی طاقت کے آگے جھوٹے فتوے اور مکارانہ سازشیں مکڑی کے جالے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔

دربار کے داخلی دروازے کا ریشمی پردہ غلاموں نے بڑے ادب سے ہٹایا تو قاضی شریح چونکا۔ کوئی اہم شخصیت اندر آرہی تھی۔ تبھی تو غلاموں نے اس کے لیے پردہ سمیٹا تھا۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک انتہائی ضعیف آدمی عصا کا سہارا لیے دربار میں داخل ہو رہا ہے۔ اس نے عیسائی عالموں کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے دائیں بائیں کئی عیسائی پادری تھے جنہوں نے اسے احترام کے ساتھ سہارا دے رکھا تھا۔ یہ عیسائیوں کا مذہبی رہنما جاثلیق تھا۔ جاثلیق عیسائیوں کے اس مذہبی رہنما کا خطاب تھا جو عیسائیوں

کے سب سے بڑے مذہبی رہنما پوپ کا نمائندہ کہلاتا تھا۔

جاثلیق اور عیسائی پادریوں کو دیکھ کر یزید کے دماغ میں تکبر اور غرور نے سر ابھارا۔ اس نے دوبارہ اپنی چھڑی اٹھائی اور سید الشہداءؑ کے دانتوں پر مارنے لگا۔ جاثلیق نے یہ منظر دیکھا تو ٹھٹک کر وہیں کھڑا ہو گیا۔ "یہ کس کا سر ہے؟" اس نے یزید سے پوچھا۔

"یہ حسین ابن علی کا سر ہے۔" یزید نے تکبر کے ساتھ کہا۔

"حسین... علی..." جاثلیق نے سوچتے ہوئے دہرایا۔ "اس کی ماں کا نام کیا ہے؟" اس نے دوبارہ سوال کیا۔

"فاطمہ بنت محمد..." یزید نے جواب دیا۔

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہ مسلمانوں کے رسول محمد مصطفیٰ کے بیٹے کا سر ہے؟" جاثلیق کی آواز میں گہرا طنز تھا۔ اس نے سر کا اشارہ کرتے ہوئے یزید کی طرف گردن موڑی۔

"یہی سمجھ لو..." یزید نے بے رخی سے کہا۔

"سمجھ تو میں اسی وقت گیا تھا جب صبح میں نے خواب میں حضرت محمد مصطفیٰؐ کو دیکھا کہ ان کے سر کے بالوں میں مٹی ہے اور ان کے بال بکھرے بکھرے خون کا ہوا ہے۔" جاثلیق کی آواز میں گہرا درد تھا۔

"پھر تم یہاں کیا بتانے آئے ہو؟" یزید نے شراب کی صراحی سے اپنا جام بھرتے ہوئے طنز کیا۔

"میں تمہیں اور تمہارے ان درباری مسلمانوں کو یہ بتانے آیا ہوں کہ میں جناب داؤدؑ کی نسل سے تعلق رکھتا ہوں جو اللہ کے نبی تھے۔ ان کے اور میرے درمیان تیس

نسلوں کا فاصلہ ہے مگر آج بھی جب میں کسی راستے سے گزرتا ہوں تو میرے ہم مذہب میرے احترام میں سر جھکا دیتے ہیں' میرے ہاتھوں کو چومتے ہیں اور میرے قدموں کے نیچے کی مٹی اٹھا کر اسے احترام سے اپنے پاس رکھنے میں فخر محسوس کرتے ہیں حالاں کہ حضرت داؤدؑ کو گزرے صدیاں بیت چکی ہیں۔۔۔ اور ایک تم مسلمان ہو کہ تمہارے نبی کا تو ابھی کفن بھی میلا نہیں ہوا اور تم نے انؐ کے بیٹے کو ذبح کر ڈالا اور اب یہاں بیٹھ کر اپنی بدنصیبی کا جشن منا رہے ہو!" جاثلیق کی آواز غصے اور غم سے بھرانے لگی تھی۔

یزید کا چہرہ غصے سے تنا ہوا تھا۔۔ "دیکھو! یہ ہمارا اپنا معاملہ ہے تم سے کیا مطلب! ہم آپس میں جو چاہیں کریں۔" اس نے غصے سے کہا۔

جاثلیق کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب امنڈ رہا تھا۔ اس نے یزید کی بات سنی ان سنی کر دی اور لرزتا ہوا آگے بڑھا۔ یزید کے تخت کے قریب پہنچ کر اس نے سونے کے تھال میں رکھے ہوئے خون آلود سر کو احترام سے اٹھایا اور بے اختیار سید الشہداءؑ کی زخمی پیشانی کے بوسے لینے لگا۔ اس کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں' وہ سر مبارک کو چومتا جا رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا۔ "حسین ابن علیؑ! گواہ رہنا قیامت کے دن کہ آج اس وقت ان سب نام و نہاد مسلمانوں کے سامنے میں آپ کے ناناؐ کی نبوت اور آپؑ کے والدؑ کی ولایت پر ایمان لے آیا ہوں۔" پھر اس نے بہ آواز بلند کلمہ پڑھا۔ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ' علیا ولی اللہ" کلمہ پڑھتے پڑھتے اس کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی۔ اس نے سر مبارک کو بوسہ دے کر دوبارہ اس کی جگہ پر رکھ دیا۔

"تو اب تم مسلمان ہو گئے ہو!" یزید کی مکروہ آواز گونجی۔

"ہاں اور ایمان کی یہ دولت مجھے حسین ابن علیؑ کے صدقے میں ملی ہے۔" جاثلیق نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"میں یہی سننا چاہتا تھا۔" یزید بولا۔ "سنو! تمہاری حفاظت اس وقت تک ہماری ذمے داری تھی جب تک تم اپنے دین پر تھے۔ اب تم مسلمان ہو گئے ہو تو اب ہم تم سے اپنے مذہب کے مطابق سلوک کریں گے۔" یزید نے قاضی شریح اور دوسرے درباری عالموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جیسے وہ ان درباری مولویوں سے اپنے فتوے کی تصدیق چاہتا ہو۔

"مجھے اب کوئی پرواہ نہیں۔۔۔ اور یہ جو تو اپنے ٹکڑوں پر پلنے والے ان ملاؤں کی طرف دیکھ رہا ہے تو مجھے معلوم ہے کہ یہ پالتو جانور کیا کہیں گے۔ جو لوگ اپنے رسولؐ کے بیٹے کے قتل کا فتویٰ دے سکتے ہیں ان کے لیے میرے قتل کو قرآن و حدیث سے کارِ ثواب قرار دینا کیا مشکل ہے۔" جاثلیق نے سچ میں ایک بات کہی۔ کئی درباری شرمندہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ قاضی شریح کی گردن اس کے سینے سے جا لگی۔ اس کی انگلیاں مشینی انداز سے تسبیح کے دانوں کو حرکت دینے لگی تھیں۔

"تجھے آلِ رسولؐ سے محبت کی سزا معلوم ہے؟" یزید چیخا۔

"میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔" جاثلیق نے سینہ تان کر جواب دیا۔

کئی غلام آگے بڑھے۔ پہلے انہوں نے جاثلیق کے ساتھ کھڑے ہوئے عیسائیوں کو دھکے دے کر وہاں سے ہٹایا اور جاثلیق پر کوڑے برسانا شروع کر دیے۔

"زور سے مارو۔ کھال اتار دو اس کی۔۔۔" یزید غصے میں چیخا۔

دربار میں سناٹا طاری تھا اور اس سناٹے میں کوڑوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

جاثلیق جب تک برداشت کر سکتا تھا اس وقت تک سینہ تان کر کھڑا رہا لیکن جلد ہی وہ بے دم ہو کر ایک طرف کو لڑھک گیا۔

''ٹھہر جاؤ۔'' یزید نے اشارہ کیا۔ ''ایسے تو یہ جلدی مر جائے گا۔ اسے ٹھہر ٹھہر کر کوڑے مارو تاکہ یہ سسک سسک کر مرے اور اسے معلوم ہو جائے کہ اسلام کیسا مذہب ہے!'' اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے شراب کا جام ہونٹوں سے لگایا اور جاثلیق کی طرف دیکھنے لگا۔

کوڑے مارنے والے غلام ایک طرف کھڑے ہانپ رہے تھے۔ جاثلیق نے لیٹے لیٹے آنکھیں کھولیں اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ کر یزید بھنا گیا۔ ''تو اب بھی مسکرا رہا ہے؟'' اس نے شراب کا جام غصے میں زمین پر پٹخا۔

''میں اپنی خوش نصیبی پر مسکرا رہا ہوں۔ میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اللہ مجھے جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے گا اور ابھی ابھی میں نے اپنی زندگی ہی میں جنت کا نظارہ بھی کر لیا ہے۔ وہ دیکھ۔۔۔ اللہ کے آخری رسولؐ، تمام انبیاء و مرسلین کے سردار حضرت محمد مصطفیٰؐ میرا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ دیکھ۔۔۔ وہ دیکھ جنت کے فرشتے میرے لیے تحفے لے کر آ رہے ہیں۔ مگر۔۔۔ تو کہاں دیکھ سکتا ہے۔۔۔ انہیں۔۔۔ تو تو ان کی خوشبو تک نہیں سونگھ سکتا جہنم کے کتے۔۔۔'' جاثلیق کی آنکھیں کمزوری اور تکلیف سے بند ہوتی جا رہی تھیں مگر اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔

یزید کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جاثلیق کی باتیں دوسرے لوگوں کو متاثر کریں۔ ''ختم کرو اس قصے کو۔۔۔'' وہ غصے سے چیخا۔ اس کے لہجے میں بلا کی سفاکی تھی۔ اس حکم کو سنتے ہی ایک جلاد ننگی تلوار بلند کیے آگے بڑھا اور اس نے جاثلیق

کی گردن اڑادی۔ جاثلیق کا سر اس کے جسم سے الگ ہو گیا اور جسم اپنے ہی خون میں لوٹنے لگا۔

یزید نے جاثلیق کے بتدریج ساکت ہوتے جسم کی طرف دیکھتے دیکھتے اپنے ہاتھ سے تخت پر شراب کے جام کو پکڑنا چاہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ شراب کا جام تو ابھی اس نے زمین پر پٹخا تھا۔ اسی لمحے ایک غلام شراب کا دوسرا جام لے کر آگے بڑھا۔ یزید نے اس کے ہاتھ سے جام لے لیا اور صراحی سے شراب انڈیلنے لگا۔

٭٭٭

شکست کے صدمے نے اسے اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا لیکن بہرحال وہ شیطان کا نمائندہ تھا۔ شیطان اسے تنہا کب چھوڑ سکتا تھا۔ وہ تو شراب کے ذریعے اس کے اندر اترا ہوا تھا اس کے تو اعصاب پر چھایا ہوا تھا اس کے دل میں پنجے گاڑے بیٹھا تھا۔ اس کی زبان سے بول رہا تھا اس کے دماغ میں سرگوشیاں کر رہا تھا۔ تم اتنی بڑی مملکت کے مالک ہو۔ کتنے طاقتور ہو تم! تم نے اپنے بزرگوں کا خوب اچھی طرح بدلہ لیا۔ اگر تم یہ نہ کرتے تو تمہارے بزرگوں کی روحیں ہمیشہ انتقام کی آگ میں جلتی رہتیں۔ یہ کام تم جیسا بہادر انسان ہی کر سکتا تھا۔ اب تمہارے راستے کے سارے کانٹے دور ہو چکے ہیں۔ ایک محمدؐ کا نواسہ ہی تو تھے جنہیں تم دولت سے خرید سکتے تھے نہ موت سے ڈرا سکتے تھے۔ اسی سے خطرہ تھا تمہیں۔۔۔ تو اس کا کٹا ہوا سر تمہارے تخت کے نیچے پڑا ہے اور اس کے خاندان والے قیدی بنے باہر کھڑے ہیں!

شیطان نے اس کے اعصاب کو سہارا دیا تو یزید تخت پر تن کر بیٹھ گیا۔ اس کے غلام جاثلیق کی لاش اٹھا کر باہر لے جا رہے تھے۔ یزید کو اپنے اندر ایک نئی طاقت اور

توانائی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی گردن سیدھی کی' درباریوں پر نظر دوڑائی اور غرور و تکبر سے بھری ہوئی آواز میں بولا۔ "قیدیوں کو حاضر کیا جائے!"

اس کا حکم سنتے ہی غلاموں نے دربار کے سب سے بڑے دروازے کے پردے سمیٹنا شروع کیے۔ درباریوں نے کرسیوں پر پہلو بدلے۔ چند لمحوں بعد غلاموں کا ایک دستہ ننگی تلواریں لیے اندر داخل ہوا۔ دربار میں زنجیروں کی جھنکار اور بچوں کی دبی دبی سسکیوں کی مدھم آوازیں گونجنے لگیں۔

غلاموں کے پیچھے قیدی عورتوں اور بچوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ چھوٹے بڑے سب ایک ہی رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ زنجیروں کی جھنکار ایک بیس بائیس سالہ نوجوان کے قدم اٹھانے سے پیدا ہو رہی تھی جو سب سے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں' پاؤں میں وزنی بیڑیاں' گلے میں لوہے کا خاردار طوق۔ اس طوق کے ساتھ اس کے گلے میں ایک رسی بندھی ہوئی تھی اور اسی رسی سے باقی تمام قیدیوں کی گردنیں بندھی ہوئی تھیں۔ یہ نوجوان' حسین علیہ السلامؑ کا بیٹا اور علی ابن ابی طالبؑ کا پوتا تھا۔ اس کے پیچھے رسولؐ کی نواسیاں ننگے سر' گردن جھکائے آگے بڑھ رہی تھیں۔

سب قیدیوں کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ ان قیدیوں میں ایک چھ سال کی بچی بھی تھی جس کے ہاتھ اس کی گردن کے پیچھے بندھے ہوئے تھے اس نے کہنیوں سے اپنا منہ چھپا رکھا تھا۔ اس وقت ایک درباری نے قیدیوں پر نظر دوڑائی اور یزید سے کہا۔ "خلیفتہ المسلمین! یہ قیدی مال غنیمت ہیں۔ ان میں سے یہ بچی مجھے کنیز کے طور پر عطا کر دیں۔" اس بدبخت کا اشارہ جناب سکینہؑ کی طرف تھا۔

جناب سکینہؑ گھبرا گئیں۔ انہوں نے سر اٹھا کر اپنی پھوپھی کی طرف دیکھا۔ "پھوپھی اماں! کیا رسول اسلام کی اولاد ان ظالموں کی کنیز بنے گی؟" ان کے لہجے میں ایسا درد تھا کہ کئی درباری اپنی جگہ لرز کر رہ گئے۔

"نہیں بیٹا! تم فکر نہ کرو۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔" جناب زینب بنت علیؑ کے لہجے میں عجب طرح کا جلال تھا۔ جناب سکینہؑ کو اپنے قریب کر کے انہوں نے اس شخص کی طرف نفرت و حقارت کے ساتھ دیکھا اور ڈانٹ کر کہا۔ "حرام زادے! چپ ہو جا۔ اللہ تعالیٰ تیری اس زبان کو کاٹ دے۔ تیری آنکھیں اندھی ہو جائیں' تیرے ہاتھ سوکھ جائیں اور اللہ تجھے جہنم میں داخل کرے۔۔۔ تجھے معلوم نہیں بے غیرت انسان! کہ نبیوں کی اولاد حرام زادوں کی کنیز نہیں ہوا کرتی۔"

جناب زینبؑ کی آواز بجلی کے کوندے کی طرح تھی۔ اس آواز کو سن کر اس شخص کا پورا جسم کپکپانے لگا۔ پھر جانے کیا ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک چیخ ماری اور زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ کئی درباری گھبرا کر اپنی اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور حیرت سے اس شخص کو دیکھنے لگے۔

وہ شخص اب زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ اس کی زبان اس کے ہونٹوں کے درمیان آ کر دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی تھی اور اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک غلام نے اسے اٹھانا چاہا تو اسے معلوم ہوا کہ اس شخص کے ہاتھ سوکھی لکڑی کی طرح سخت ہو کر اس کی گردن سے چپک گئے ہیں۔ غلام نے اس کی آنکھوں کو کھول کر دیکھا تو گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی آنکھوں کے ڈھیلے پھٹ چکے تھے اور ان سے خون کی دھاریں بہہ کر اس کی کانوں پر سے ہوتی ہوئی نیچے بچھے ہوئے دبیز قالین میں جذب ہوتی جا رہی

تھیں۔ درباری حیرت اور خوف کے مارے منہ کھولے ساکت کھڑے تھے۔
یہ منظر دیکھ کر جناب زینبؑ نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر آپؑ نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ "اس اللہ کی حمد کرتی ہوں جس نے آخرت سے پہلے اسی دنیا میں اس شخص کو اس گستاخی کی سزا دے دی۔" پھر آپؑ نے درباریوں کی طرف دیکھا اور بولیں۔ "اولاد انبیاءؑ کی طرف ناپاک نظروں سے دیکھنے والوں کا یہی انجام ہوا کرتا ہے۔"

علیؑ کی تلوار

سرداروں کے سر جھکے ہوئے تھے، درباری علماء
کھسیاہٹ کے مارے اپنی داڑھیاں کھجا رہے
تھے، جلادوں کے دل پگھل رہے تھے۔
یزید کے دربار میں علیؑ کی تلوار چلنے کی روداد

باب۔ ۱۶

اہل بیت رسولؐ کی شان میں گستاخی کرنے والے شامی کا جسم تڑپ تڑپ کر ساکت ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بہنے والا خون اس کے چہرے اور کانوں سے ہوتا ہوا زمین پر بچھے ہوئے قالین میں جذب ہوتا جا رہا تھا۔ جناب زینب بنت علیؑ کے چہرے پر ابھی تک ایسا جلال تھا کہ تخت پر بیٹھا ہوا دنیا کا سب سے بد کردار اور ظالم انسان بھی ان کی طرف دیکھتے ہوئے ڈر رہا تھا۔

دربار کے حبشی غلام اس گستاخ کی لاش اٹھانے کے لئے آگے بڑھے تو دربار کا سکوت ٹوٹا۔ یزید نے شراب کا ایک نیا جام بھر کر ہونٹوں سے لگایا۔ شیطان کو شراب کے ذریعے توانائی حاصل ہوئی تو وہ اس کے خون میں گردش کرنے لگا۔ یزید نے شراب کے لمبے لمبے گھونٹ لئے اور جام میں بچی ہوئی شراب تخت کے نیچے سونے کے تھال میں رکھے ہوئے سر پر انڈیل دی۔ یہ دیکھ کر کئی درباری لرز کر رہ گئے لیکن شیطان نے یزید کو اس کے شعر یاد دلائے۔ وہ دوبارہ اپنے شعر گنگنانے لگا۔

"حسین! یہ شراب کیسی ہے۔ تمہارے خیال میں تمہارے والد

حوض کوثر کے ساقی ہیں۔ اگر کبھی اتفاقاً ایسا ہو کہ میں حوض کوثر
کے قریب سے پیاسا گزروں تو اپنے باپ سے کہنا کہ وہ مجھے جنت
کی پاکیزہ شراب نہ پلائیں۔
حسین! تمہارے نانا نے سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال حرام
کیا تھا نا۔۔۔ لیکن حسین! ذرا دیکھو تو سہی کہ تمہارا کٹا ہوا سر
سونے کی تھالی میں کیسا خوب صورت لگ رہا ہے!
مجھے تو سارنگی کی لے نے اذان کی آواز سے بے خبر کر دیا ہے۔ میں
نے جنت کی حوروں کی بجائے دنیا میں شراب ہی کو اپنے لئے پسند
کر لیا ہے۔"

اپنے جاہلانہ شعر پڑھتے پڑھتے اس نے رسیوں میں بندھے ہوئے قیدی عورتوں اور بچوں کو دیکھا۔ امام حسینؓ کے سر مبارک پر شراب انڈھیل کر اس نے جس طرح سید الشہداء حضرت امام حسین کے سر مبارک کی بے حرمتی کی تھی اس نے قیدی عورتوں اور بچوں کو آنسو بہانے پر مجبور کر دیا تھا۔ کوئی آنکھ ایسی نہیں تھی جس سے آنسو نہ امنڈ رہے ہوں۔ بے بسی، مجبوری اور بے کسی کا احساس ان کے دلوں کو خنجر کی طرح اندر ہی اندر کاٹ رہا تھا۔

جناب زینب بنت علیؓ نے ان عورتوں اور بچوں کے دلوں کو کاٹتی ہوئی بے کسی اور محرومی کو محسوس کیا۔ خود ان کا دل بھی شدت غم سے کٹا جا رہا تھا لیکن وہ جانتی تھیں کہ یہ وقت آنسو بہانے کا نہیں ہے۔ آنسوؤں کو دیکھ کر دشمنان اسلام کے حوصلے بلند ہو جائیں گے اس لیے آپ نے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو پی لیا۔

اس وقت انہیں اپنے ساتھ رسی میں بندھی ہوئی عورتوں اور بچوں کا حوصلہ بھی بلند کرنا تھا اور ظالم و جابر حکمران کے غرور کو اس کے غلاموں، کنیزوں، درباریوں، فوجیوں اور دوسرے ملکوں کے سفارتی نمائندوں کے سامنے خاک میں بھی ملانا تھا۔

یزید کی نظریں قیدی عورتوں اور بچوں کا معائنہ کرتے کرتے اس قافلے کی سب سے بلند قامت خاتون حضرت زینب بنت علیؑ کے چہرے پر ایک لمحے کو ٹھہری ہی تھیں کہ دربار یزید کے در و دیوار ایک گرج دار آواز سے لرز اٹھے۔

"ٹھہر جا یزید اور میری بات سن۔۔۔!" جناب زینبؑ کی آواز بجلی کے کوندے کی طرح لپکی تھی اور شہاب ثاقب کی طرح اس کے تخت و تاج پر گری تھی۔ اس آواز میں ایسی طاقت تھی کہ یزید کی رگوں میں دوڑتا ہوا شیطان بھی سہم کر رہ گیا۔ کئی درباری جنھوں نے جنگوں کے دوران حضرت علی ابن طالبؑ کو رجز پڑھتے سنا تھا ان کے دل تیز تیز دھڑکنے لگے۔ یہ آواز تو ہوبہو علی ابن ابی طالبؑ کی آواز تھی۔ انھوں نے بے اختیار اپنی آنکھوں کو مل کر دیکھا کہ کہیں وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہے!

جناب زینبؑ کی للکار نے یزید کے ہوش و حواس گم کر دیے تھے۔ ایک ایسی عورت جس کے بھائی، بیٹے، بھتیجے، بھانجے ایک ساتھ قتل کر دیے گئے ہوں۔ جسے کربلا سے کوفے اور کوفے سے شام تک رسیوں میں جکڑ کر انتہائی ذلت و رسوائی کے ساتھ اس کے دربار میں پیش کیا گیا ہو، ایسی مظلوم عورت اس جیسے ظالم بادشاہ کو اس قدر حقارت سے مخاطب کرے گی، یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ اس حیرانی کے عالم میں اسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ شراب کا خالی جام اس کے ہاتھ میں تھا مگر یہ ہاتھ اب بے حرکت تخت پر رکھا ہوا تھا۔

جناب زینبؑ نے سب سے پہلے اللہ رب العالمین کی حمد و ثنا بیان کی۔ پھر رسول اکرمؐ اور ان کے اہل بیتؑ پر درود و سلام بھیجا اور اپنی دل ہلا دینے والی تقریر کا آغاز سورہ روم کی دسویں آیت سے کیا۔

"آخر جن لوگوں نے برائیاں کی تھیں ان کا انجام بھی بہت برا ہوا اس لئے کہ وہ اللہ کی نشانیوں کو جھٹلاتے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے۔"

اس کے بعد آپؑ نے حقارت کے ساتھ یزید کو دیکھا۔

"کیوں یزید! زمین و آسمان کے سارے راستے ہم پر بند کر کے اور رسول اللہؐ کے خاندان والوں کو قیدیوں کی طرح بازاروں میں تماشا بنا کر' کیا تو یہ سمجھ رہا ہے کہ اللہ رب العالمین کی بارگاہ میں ہمارا جو مقام ہے اس میں کوئی کمی آگئی اور خود تو بڑا عزت دار بن گیا!

شاید تو اس خوش فہمی کا شکار ہے کہ تیری فوجوں نے ہمیں جس صدمے سے دوچار کیا ہے اس سے تیری وجاہت میں کچھ اضافہ ہو گیا ہے اور شاید اسی غلط فہمی کی وجہ سے تیری ناک چڑھ گئی اور تو غرور و تکبر کے مارے اپنے کندھے اچکانے لگا۔"

"ٹھہر جا یزید! چند لمحے ٹھہر جا۔ ایک دو سانسیں اور لے لے پھر دیکھنا کہ تیرے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ دراصل تو رب ذوالجلال کے اس فیصلے کو بھلا بیٹھا ہے کہ "کفر کے راستے پر چلنے والے اس غلط

فہمی میں نہ رہیں کہ ہم جو انہیں مہلت دے جاتے ہیں وہ ان کے حق میں بہتر ہے۔ ہم تو ان (کافروں) کو اس لئے ڈھیل دے رہے ہیں کہ یہ خوب جی بھر کر گناہ سمیٹ لیں۔ اس کے بعد ان کے لیے سخت ذلت آمیز سزا اور (جہنم کا) ذلیل و رسوا کر دینے والا عذاب (تیار) ہے۔" (سورہ آل عمران۔ آیت ۱۷۸)

جناب زینبؑ زخمی شیرنی کی طرح گرج رہی تھیں اور دربار پر سناٹا طاری تھا۔ ریشمی پردے ہوا میں بے آواز ہل رہے تھے۔ جناب زینبؑ کی آواز دیواروں، محرابوں، کھڑکیوں اور دروازوں سے ٹکرا کر ایک عجیب طرح کی گونج پیدا کر رہی تھی اور اس گونج نے سننے والوں کو بے جان مجسموں کی طرح ساکت کر دیا تھا۔

اچانک جناب زینبؑ کی آواز مزید بلند ہوئی۔ آپ کے لہجے میں یزید کے لئے حقارت اور نفرت مزید بڑھ گئی اور آپ نے گرجتے ہوئے کہا۔

"اے ہمارے آزاد کئے ہوئے غلاموں کی اولاد! آج تو محمدؐ کے پیاروں کا خون بہا کر اور عبدالمطلب کے چاند ستاروں کو خاک میں ملا کر اپنے مرے ہوئے رشتے داروں کو پکار رہا ہے۔ اپنے گندے مردوں کو آواز دے رہا ہے اور تجھے یہ علم ہی نہیں کہ بہت جلد تو بھی ان کے پاس پہنچنے والا ہے۔ جب تو اپنے ان بزرگوں کے پاس پہنچ جائے گا تو پھر دوبارہ کہے گا کاش (دنیا میں) نہ میری زبان بولنے کے قابل ہوتی اور نہ میرے ہاتھوں میں حرکت کرنے کی طاقت تاکہ جو کچھ کہا ہے وہ نہ کہتا اور جو کچھ کیا ہے وہ نہ

کرتا۔

خدا کی قسم یزید! تو نے دراصل اپنی کھال خود نوچی ہے اور اپنے ہاتھوں سے خود اپنے گوشت کی تکابوٹی کی ہے۔ جہاں تک ہمارے شہیدوں کا تعلق ہے تو ان کے لئے اللہ کا وعدہ ہے۔

"جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھنا۔ وہ زندہ ہیں اور اپنے پالنے والے کی بارگاہ سے رزق پا رہے ہیں۔" (سورہ آل عمران۔ آیت: ۱۶۹)

جناب زینبؑ کے چہرے کا رعب و جلال' ان کے چٹانوں کے سے اعتماد اور
کی آواز کے بلند آہنگ نے یزید اور اس کے درباریوں کو بے جان مجسموں کی طر
ساکت کرنے کے ساتھ ساتھ قیدی عورتوں اور بچوں کے کم زور جسموں میں خون
روانی کو تیز کر دیا تھا۔ عورتیں اور بچے اپنی بے بسی مجبوری اور مظلومی کو بھول چکے تھ
اب ان کے رخساروں پر آنسوؤں کے بجائے جوش و ولولے کا خون چمک رہا تھا۔ جنا
زینبؑ نے ان بچوں کے چہروں پر نظر ڈالی اور یزید کو مخاطب کر کے بولیں۔

"سن لے یزید! تیرے لئے تو بس اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ بہت جلد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کی عدالت میں حسینؑ مظلوم ان کے عزیزوں اور ان کے باوفا ساتھیوں کے قتل کا مقدمہ پیش کریں گے۔ جبرئیلؑ میرے نانا کے مددگار ہوں گے اور میرا پروردگار اس مقدمے کا فیصلہ کرے گا اور تو ہی نہیں وہ لوگ بھی اس وقت اپنا انجام دیکھ لیں گے جنہوں نے تجھ جیسے

بد کردار اور ظالم انسان کو رسول اللہؐ کے منبر پر لا بٹھانے کے لئے برسوں کوششیں کیں اور بالآخر تجھے مسلمانوں کی گردنوں پر سوار کر دیا۔"

یہ کہہ کر جناب زینب بنت علیؑ نے درباریوں کی طرف دیکھا۔ یزید جیسے لا مذہب انسان کو مسلمانوں کا خلیفہ بنانے میں یزید کے بزرگوں کے ساتھ یہ لوگ بھی شامل تھے جنھوں نے لالچ، خوف اور علی ابن ابی طالبؑ کی دشمنی میں یزید کو خلیفہ بنانے کے لیے بنی امیہ کے ہاتھ مضبوط کیے تھے اس وقت ان میں سے کسی کی ہمت نہیں تھی کہ رسول اسلام کی نواسی سے نگاہیں ملا سکے۔

یزید تخت پر بیٹھے چوہے کی طرح بیٹھا اپنی ٹھوڑی کو کھجا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بندر کی آنکھوں کی طرح سیاہ تھیں۔ چہرے پر ہونٹوں کے ایک طرف اونٹ کے پاؤں جیسا نشان تھا۔ ہونٹ حبشیوں کی طرح بھدے اور موٹے تھے۔ شکل و صورت سے وہ غلاموں سے بھی بدتر لگتا تھا۔

جناب زینبؑ نے دوبارہ اسے للکارا۔

"یہ زمانے کا انقلاب ہے یزید! کہ مجھے تجھ جیسے معمولی آدمی سے بات کرنا پڑ رہی ہے ورنہ میں تجھے انتہائی حقیر اور گھٹیا سمجھتی ہوں ہاں تجھے مخاطب کرنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ شدت غم سے میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔

یہ کہتے کہتے جناب زینبؑ کی آواز بھر آگئی۔ آپ نے اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"کس قدر حیرت کی بات ہے کہ اللہ کے وہ خاص بندے جنہیں اللہ نے عزت دے کر اپنی بارگاہ میں عظیم مرتبہ عطا کیا' وہی عظیم انسان فتح مکہ کے دن ہمارے آزاد کئے ہوئے شیطان صفت درندوں کے ہاتھوں تلواروں سے ذبح کئے جائیں! آہ۔۔۔ آہ۔۔۔ دشمن کی آستین سے ابھی تک ہمارے شہیدوں کا خون ٹپک رہا ہے۔ آج بھی اس کے ہونٹوں اور دانتوں پر ہمارا گوشت چبانے کے نشان موجود ہیں اور۔۔۔ اللہ کی راہ میں اپنی جانیں نثار کرنے والے عظیم انسانوں کے پاک وپاکیزہ جسم صحرا میں بے گور و کفن پڑے ہیں۔

پھر آپؑ نے اپنی کہنیوں سے اپنے آنسوؤں کو صاف کیا اور بجلی کی طرح کڑکتی ہوئی آواز میں بولیں۔

"دھوکے بازی' فریب اور ظلم کے جتنے حربے تیرے پاس ہیں یزید! انہیں جی کھول کر آزمالے۔ اپنی سازشوں اور فوجی مہموں کو مزید تیز کر کے دیکھ لے تاکہ تجھے کوئی حسرت نہ رہ جائے مگر ان سب کوششوں کے باوجود تو مسلمانوں کے دلوں میں ہماری مقبولیت اور محبت کو کم نہیں کر سکتا ہے۔۔۔
اور ہاں یہ بھی تیرے بس میں نہیں کہ تو ہماری فکر کو پھیلنے اور ہمارے پیغام کو عام ہونے سے روک سکے
اور تو کیا جانے حسین علیہ السلام کی قربانی کا مقصد کیا ہے۔ تو نہ تو

ہماری اس جدوجہد اور امتحان کا مطلب سمجھ سکتا ہے اور نہ حسین علیہ السلام کے عظیم مقاصد تک تیری نظر پہنچ سکتی ہے۔

تیری سوچ احمقانہ، تیری رائے ناکارہ اور تیری زندگی کے دن گنے ہوئے ہیں۔ تیری بساط الٹنے والی ہے یزید! تیرے یہ پالتو غلام، یہ بکے ہوئے درباری، خود غرض ساتھی اور یہ کرائے کے قاتل۔۔ یہ سب چند دنوں کے بعد اپنی جان بچانے کی فکر میں تجھے اکیلا چھوڑ دیں گے اور یہ بھی یاد رکھ کہ وہ دن بھی بہت قریب ہے

جب صور پھونکا جائے گا اور اللہ کا ایک فرشتہ آواز دے گا کہ "ظالموں پر اللہ کی لعنت ہو۔ (سورہ ھود، آیت ۱۹)

یہ آیت پڑھ کر جناب زینب نے اپنا چہرہ آسمان کی طرف کیا اور دعا فرمائی۔

"اے سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والے، اے رب کریم! ہمارے شہیدوں کو ہمیشہ بڑھتے رہنے والا ثواب عطا فرما۔ تو نے ہی ہمارے بزرگوں کو اپنی بارگاہ میں عظیم مرتبوں سے سرفراز کیا اور تو نے ہی ہمارے عزیزوں کو شہادت کی عظیم نعمت عطا کی۔ اے رب العالمین! ان کے وارثوں اور جانشینوں کو اپنے فضل و کرم سے بہرہ مند فرما۔

یقیناً میرا پروردگار سب سے بڑھ کر شفقت کرنے والا اور صدر درجہ

مہربان ہے اور ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی کارساز ہے۔"
(سورہ آل عمران۔ آیت : ۱۷۳)

جناب زینبؑ یہ کہہ کر خاموش ہوئیں تو ایسا لگا جیسے کڑکتی ہوئی بجلی تھم گئی ہو۔

جناب علی ابن الحسینؑ کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ان کی نگاہیں بڑے پیار اور فخر کے ساتھ اپنی پھوپھی کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں، جنہوں نے اپنی بے پناہ علمیت، لاجواب خطابت اور انتہائی جرات کے ذریعے اپنے وقت کے سب سے بڑے شیطان کے چہرے سے اسلام کی نقاب کھینچ کر اسے اسی کے بھرے دربار میں ذلیل و رسوا کر ڈالا تھا۔

انبیاءؑ کے قاتلوں کی سرزمین پر آج ایک نبیؐ کی بیٹی نے حق کی تلوار سے ان ظالموں کے دلوں میں کبھی نہ بھرنے والے زخم ڈال دیئے تھے۔ ظلم کے سارے حربے ناکارہ ہو گئے تھے۔ ساری تلواریں اور سارے خنجر علیؑ کی اس تلوار کے آگے کند ہو گئے تھے۔

جناب زینبؑ کی تقریر اس قدر بے ساختہ اور اچانک تھی کہ یزید بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ اس کی قوتِ فیصلہ جواب دے چکی تھی اور وہ شراب کے گھونٹوں سے اپنے اعصاب کو پرسکون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایسا لگ رہا تھا کہ اس وقت یزید کے دربار پر کسی ان دیکھی طاقت کا قبضہ ہے۔ یزید جیسا سفاک انسان جو بات بات پر انسانوں کو قتل کرا دیا کرتا تھا، اس وقت شراب میں بھیگے ہوئے چوہے کی طرح اپنے تخت پر سہما ہوا خاموش بیٹھا تھا۔ وہ مغرور فوجی جن کی تلواریں اہل بیتؑ کا نام سن کر نیاموں سے باہر نکل آتی تھیں اس وقت پتھر کے

مجسموں کی طرح ساکت تھے۔ جلادوں کے دل پگھل رہے تھے، غلام ہاتھ باندھے فرش کو تک رہے تھے، قبیلوں کے رئیس ندامت کے مارے ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے، درباری علماء کھسیاہٹ کے عالم میں اپنی داڑھیاں کھجا رہے تھے اور فوجوں، لشکروں، محلوں، باغوں اور تخت و تاج کا مالک یزید تھکے ہارے جواری کی طرح بیٹھا تھا۔

رات کا خواب

نماز سکھانے والے رسولؐ کی اولاد کو قتل کر
کے انہیں نماز پڑھنے کی جلدی ہو رہی تھی!
مسخ شدہ قوموں کی ایسی ہی نشانیاں ہوا کرتی ہیں۔

باب۔ ۱۷

یزید کے دربار میں علیؑ کی تلوار اس طرح چلی کہ اس نے ماضی، حال اور مستقبل کے تمام منافقوں کو بے نقاب کر کے رکھ دیا۔ یزید دم بہ خود تھا۔ درباری عالم سکتے کا شکار تھے، وہ ایک دوسرے سے بھی نگاہیں ملاتے ہوئے کترا رہے تھے۔ جناب زینبؑ کی تقریر مکمل ہونے تک ایک انجانی قوت نے سارے دربار کو ساکت اور تمام آوازوں کو خاموش کیے رکھا تھا۔ یہ اہل بیتؑ کی وہ الٰہی طاقت تھی جس کے ذریعے سنگریزے بولنے لگتے تھے اور بولنے والے ساکت مجسموں میں تبدیل ہو جایا کرتے تھے۔

جناب زینبؑ کسی شیرنی کی طرح گرجنے کے بعد اب خاموش ہو چکی تھیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی چھ سالہ بیٹی سکینہؑ اپنی پھوپھی کی بانہوں میں سر چھپائے روئے جا رہی تھیں۔ پھوپھی کی دلیرانہ تقریر نے سکینہؑ کو جہاں مصیبتوں سے لڑنے کا حوصلہ، ظالموں کے آگے سر نہ جھکانے کی طاقت اور بے پناہ عزم و حوصلہ عطا کیا تھا، وہیں ان کی نگاہوں میں اچھے دنوں کی تصویر بھی گھوم گئی تھی۔

انھوں نے جب سے ہوش سنبھالا یہی دیکھا کہ سارے گھر میں سب سے زیادہ اہمیت پھوپھی اماں ہی کو دی جاتی ہے۔ گھر کے معاملات میں جب بھی خاندان کا کوئی

فروان کے بابا سے مشورہ طلب کرتا تو ان کے بابا گھر کے بڑے ہونے کے باوجود اپنی بہن زینبؑ سے اس معاملے میں ان کی رائے ضرور معلوم کرتے۔ وہ اپنی بہن سے جس قدر محبت کرتے تھے، اسی قدر ان کا احترام بھی کرتے تھے۔ پھوپھی اماں کو بھی اپنے بھائی کے بغیر چین نہیں پڑتا تھا۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا کہ وہ اپنے شوہر جناب عبداللہؓ سے اجازت لے کر اپنے بھائی اور ان کے بچوں کو دیکھنے نہ آتی ہوں۔

چچا عباسؑ ہوں، یا بھائی علی اکبرؑ، چچا محمد ابن حنفیہ ہوں یا بھائی علی ابن الحسینؑ، پھوپھی اماں ان سب کے لئے ماں کی سی حیثیت رکھتی تھیں۔ اماں شہر بانو تو غیر خاندان سے آئی تھیں لیکن وہ بھی اپنی نند پر جان چھڑکتی تھیں۔ یہی حال اماں ام رباب کا تھا۔ پھوپھی اماں خود اپنی بھابھیوں کو دل و جان سے چاہتی تھیں۔ بھائی علی اکبر کو تو پالا ہی پھوپھی اماں نے تھا۔ خود بی بی سکینہ زیادہ تر پھوپھی اماں کے ساتھ رہتی تھیں۔ چھوٹا بھائی علی اصغرؑ پیدا ہوا تو وہ بھی اماں سے زیادہ پھوپھی کی گود میں رہتا تھا۔

۲۸ رجب کو جب بابا نے مدینے سے نکلنے کا ارادہ کیا تو اس وقت بھی انہوں نے سب سے پہلے پھوپھی اماں سے مشورہ کیا تھا۔ پھوپھی اماں جانتی تھیں کہ بھائی ایک لمبا اور تکلیف دہ سفر طے کرتا ہے اور اللہ کے دین کو مسخ ہونے سے بچانے کے لئے کربلا کے میدان میں بھوک پیاس برداشت کرتے ہوئے اپنے عزیزوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں شہید ہوتا ہے۔ ایسے میں ان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ بھائی کو اکیلا جانے دیتیں۔ انہوں نے اپنے شوہر سے بھائی کے ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کی۔ ان کے شوہر نے نہ صرف خوش دلی سے انہیں اجازت دی بلکہ اپنے دونوں بیٹوں کو بھی ساتھ جانے کے لئے کہا تاکہ یہ بچے ماں باپ کی طرف سے اللہ کی راہ میں قربانی پیش کر سکیں۔

جناب سکینہؑ کی آنکھوں میں ماضی کی تصویریں گھوم رہی تھی۔۔۔ مدینے سے
چلتے وقت قناتیں باندھ کر کس اہتمام کے ساتھ ان سب کو سوار کرایا گیا تھا۔ بنی ہا
کے بہادر جوان چچا عباسؑ کی سربراہی میں جناب زینبؑ کی سواری کے اردگرد ننگ
تلواریں سونتے مستعد کھڑے تھے۔۔۔ اور آج وہی پھوپھی اماں یزید کے دربار میں
قیدی بنی کھڑی تھیں۔ وہ لوگ جنہوں نے کبھی ان کا سایہ تک بھی نہیں دیکھا تھا آ
انہیں سر کھلے دیکھ رہے تھے۔ راستے کے گردوغبار نے خاک تیمم کی طرح ان کے چہر
مبارک کو چھپا رکھا تھا کہ رسولؐ کی نواسیوں کے لئے اب صرف خاک ہی کا پردہ باقی ر
گیا تھا۔

بس یہی سب کچھ سوچ سوچ کر جناب سکینہؑ کی آنکھوں سے آنسو بہتے چل
جا رہے تھے۔ ایسے میں انہیں کل رات کا دیکھا ہوا خواب یاد آگیا اور ان کے منہ میں سے
بے ساختہ ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

چیخ کی اس ہلکی سی آواز نے دربار کے سناٹے کو توڑا۔ یزید نے چونک کر
قیدیوں کے درمیان کھڑی ہوئی اس ننھی سی بچی کی طرف دیکھا جس کے رخساروں پر
آنسوؤں کے مسلسل بہتے رہنے سے سرخ سرخ سی دھاریاں پڑ گئی تھیں۔

”کیا ہوا تمہیں۔ اس طرح کیوں رو رہی ہو؟“ یزید نے نرمی کے ساتھ جناب
سکینہؑ سے سوال کیا۔

قیدیوں کی طرف سے اب تک اسے جس طرح کے منہ توڑ جواب ملے تھے ان
کی وجہ سے وہ قیدیوں سے بات کرتے ہوئے جھجک رہا تھا لیکن جناب سکینہؑ کی عمر اور
حالت دیکھ کر اسے یقین تھا کہ یہ تھکی ہاری یتیم بچی شاید اس کے چمکارنے پر اس کی

درباریوں کے سامنے اب مزید ذلیل و رسوا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اپنے بزرگوں کی چالاکیاں اسے وراثت میں ملی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے بزرگ جب تلوار کی طاقت کے آگے بے بس ہو جاتے تو کس طرح لمحے بھر میں وقت اور حالات کے مطابق خود کو تبدیل کر لیتے تھے! اس نے جلد ہی اپنے غصے پر قابو پالیا۔

"مگر تم اچانک اس طرح چیخ کر کیوں روئیں؟" وہ ایسا بن گیا جیسے جناب سکینہؑ کے تلخ جواب کو اس نے سنا ہی نہ ہو۔

"عاشور کے دن سے آج تک ہم جن صدموں اور مصیبتوں سے گزرے ہیں ان میں سے ہر صدمہ اور ہر مصیبت ایسی ہے یزید! کہ ہم زندگی بھر بھی روتے رہیں تو کم ہے۔" جنابِ سکینہؑ کے لہجے کی کاٹ اسی طرح برقرار تھی۔ "لیکن آج صبح جب سے جاگی ہوں تو رات کا خواب بار بار مجھے یاد آتا ہے اور بار بار مجھے رلاتا ہے۔" جنابِ سکینہؑ کی آنکھیں دوبارہ بھیگنے لگی تھیں۔

"رات تم نے کوئی خواب دیکھا تھا؟" یزید نے پوچھا۔

"ہاں۔ سات محرم کے بعد کل ہی تو شاید دو مہینے بعد میں ذرا گہری نیند سوئی تھی۔" جنابِ سکینہؑ نے کہا۔ "سات محرم سے عاشور کے دن تک تو پیاس نے نہیں سونے دیا۔ عاشور کے بعد سے کربلا سے کوفہ پھر کوفے سے یہاں تک سفر کے دوران تیرے غلام نہ ہمیں سونے دیتے تھے نہ رونے دیتے تھے۔ اگر رونا چاہتی تو زجر ابنِ قیس میری کمر پر تازیانے مارنے لگتا اور تھکن سے بے حال ہو کر سونا چاہتی تو آنکھ نہیں لگتی تھی۔ کل رات جب ہمارا قافلہ شہر سے باہر ٹھہرا تو پہلی رات تھی کہ کسی وقت میری آنکھ لگ گئی۔" جنابِ سکینہؑ نے بتایا۔

"پھر تم نے کوئی خواب دیکھا؟" یزید نے نرمی سے سوال کیا۔

شراب پینے والوں کی خاصیت ہوتی ہے کہ نشے حالت میں جو بات ان کے ذہن میں آجائے وہ اس بات کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور بار بار اسی ایک بات کو دہراتے رہتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب یزید بار بار سید الشہداءؑ کے دانتوں پر چھڑی مار رہا تھا تو اس وقت اس کے دماغ میں حضرت امام حسینؑ اور ان کے خاندان کی نفرت عود کر آئی تھی۔ اسے اسلامی جنگوں میں حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے ہاتھوں خاک و خون میں تڑپتے ہوئے اپنے بزرگ یاد آگئے تھے۔ اسی لئے اس وقت وہ بار بار اپنے جذبہ انتقام کو تسکین پہنچا رہا تھا۔ اب اس کی ذہنی رو کسی اور طرف کو چل پڑی تھی۔ اس کے دماغ کی سوئی جناب سکینہؑ کے خواب پر اٹک کر رہ گئی تھی۔

"ہاں میں نے رات کو ایک خواب دیکھا تھا۔" جناب سکینہؑ نے جواب دیا۔

"خواب۔۔۔ کیا دیکھا تم نے۔۔۔ خواب میں۔۔۔" یزید کی آواز نشے کی زیادتی سے لڑکھڑانے لگی تھی۔

کئی درباری اس کی ذہنی حالت کو محسوس کر رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ حسینؑ کی یتیم بیٹی اپنا خواب بیان کرے۔ ممکن ہے یہ خواب سن کر کئی لوگ بچی کی مظلومیت سے متاثر ہو جائیں۔ یہ سوچ کر ایک درباری نے کھنکھارتے ہوئے یزید کی توجہ ہٹانا چاہی لیکن یزید اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ وہ ابھی تک جناب سکینہؑ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جناب سکینہؑ نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ پھر انہوں نے سر اٹھا کر اپنی پھوپھی اماں کے چہرے کی جانب دیکھا۔ جیسے وہ پھوپھی اماں سے اجازت مانگ رہی ہوں۔

جناب زینبؑ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا تو بی بی سکینہؑ نے یزید کی طرف دیکھا اور بولیں۔ "تو وعدہ کر کہ جب میں اپنا خواب بیان کروں تو تو مجھے درمیان میں نہیں ٹوکے گا۔"

"تمہیں کوئی نہیں ٹوکے گا۔ تم اپنا خواب سناؤ۔" یزید اپنے ریشمی تکیے سے کمر ٹکا کر آرام سے بیٹھ گیا۔

"رات میں نے خواب میں ایک محل دیکھا۔۔" جناب سکینہؑ نے اپنا خواب بیان کرنا شروع کیا۔ "اس محل کی دیواریں سرخ یاقوت سے بنی ہوئی تھیں۔ اس کے ستون زبرجد کے تھے۔ محل کے دروازے ساگوان کی لکڑی سے بنے ہوئے تھے۔ میں اس محل کے باہر کھڑی تھی کہ محل کا بیرونی دروازہ کھلا اور ایک خادم اندر سے باہر نکل آیا۔

"یہ شاندار محل کس کا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ محل تو بی بی! آپ کے بابا شہید کربلا حسین ابن علی کا ہے۔" اس شخص نے ادب سے سر جھکاتے ہوئے مجھے بتایا۔ اتنے میں اسی دروازے سے پانچ نورانی ہستیاں باہر آتی دکھائی دیں تو میں نے اس خادم سے سوال کیا۔ "یہ بزرگ کون ہیں؟"

"بی بی! سب سے آگے جو بزرگ آ رہے ہیں وہ حضرت آدمؑ ہیں۔ ان کے پیچھے آدم ثانی حضرت نوحؑ ہیں۔ ان کے بعد حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ حضرت موسیٰؑ اور جناب عیسیٰؑ تشریف لا رہے ہیں۔" خادم نے بتایا۔

ابھی وہ پانچوں بزرگ مجھ سے فاصلے پر تھے کہ اسی دروازے سے میں نے ایک اور بزرگ کو باہر آتے دیکھا۔ ان کا چہرۂ مبارک بے حد نورانی تھا۔ انہیں دیکھ کر جانے کیوں مجھے اپنے بھائی علی اکبرؑ کی یاد آ گئی۔ شاید ان میں میرے بھائی کی شباہت آ رہی

تھی۔ ان بزرگ کا چہرہ شدت غم سے زرد تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور سر کے بالوں میں مٹی لگی ہوئی تھی۔ میں نے اس خادم سے پوچھا۔ "یہ بزرگ کون ہیں؟"

"آپ انہیں نہیں پہچانتیں؟" خادم حیرت سے بولا۔

"نہیں۔ میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا لیکن جانے کیا بات ہے کہ انہیں دیکھ دیکھ کر مجھے رونا چلا آ رہا ہے۔"

"بی بی! یہ آپ کے جدِ امجد پیغمبرِ اکرم حضرت محمد مصطفیٰؐ ہیں۔" خادم نے انتہائی ادب و احترام کے ساتھ بتایا۔

یہ سن کر میں نے بے اختیار ان کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ نانا رسول اللہؐ نے مجھے دیکھا تو اپنے بازو کھول دیے۔ میں انہیں سلام کرنا چاہتی تھی مگر شدت غم سے میری آواز گلے میں اٹک گئی۔ میں ان کی بانہوں کی پناہ میں چلی گئی۔ ان کی آنکھوں سے گرنے والے آنسو میرے بالوں میں گرنے لگے۔

بہت دیر تک انہوں نے مجھے اپنے سینے سے چمٹائے رکھا اور ہچکیاں لے لے کر روتے رہے۔ پھر انہوں نے میرا چہرہ اپنے سامنے کیا۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ روتے روتے انہوں نے میرا ماتھا چوما اور دوبارہ اپنے سینے میں بھینچ لیا۔ پھر انہوں نے میرے کانوں کی طرف دیکھا جن سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ زور زور سے رونے لگے۔ پھر انہوں نے میرے بازوؤں کو دیکھا جہاں نیلے نیلے نشان ابھرے ہوئے تھے۔ روتے روتے ان کی نگاہ میری گردن پر گئی جہاں کھردری رسی کی رگڑ سے زخم پڑ گئے تھے۔ یہ دیکھ کر انہوں نے دوبارہ مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔

انہیں روتا دیکھ کر میں بھی رونے لگی۔ روتے روتے میں نے کہا۔ "نانا جان!

میرے پیر آپ نے نہیں دیکھے! عاشور کے دن سے آج تک میں ننگے پاؤں گرم ریت پر چلتی رہی ہوں، کانٹوں پر دوڑتی رہی ہوں۔ آپ کی امت نے تو ہمارے جوتے تک چھین لئے تھے۔ نانا جان!"

رسول اللہؐ نے اپنے ہاتھوں سے میرے سوجے ہوئے زخمی پیروں کو سہلایا اور بہ آواز بلند گریہ کرنے لگے۔ ان کے رونے کی آواز سن کر جناب آدمؑ جناب نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ میرے نانا کے قریب آئے اور انہیں دلاسہ دینے لگے۔ ان سب کی آنکھوں سے بھی آنسو چھلک رہے تھے۔ نانا جان نے میری طرف دیکھا اور بولے۔ "میرے مظلوم بیٹے کی معصوم بیٹی! اب چپ ہو جا۔ میری بیٹی! تیری مظلومیت نے تو میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے میرے ماتھے کو چوما۔ "جا بیٹی! اندر چلی جا۔" نانا رسول اللہؐ نے مجھے گود سے زمین پر اتارتے ہوئے کہا۔

پھر میں نے خود کو ایک بڑے سے کمرے میں موجود پایا۔ اس کمرے میں چھ خواتین بیٹھی تھیں۔ ان میں سے پانچ خواتین ذرا بزرگ لگ رہی تھیں لیکن چھٹی خاتون کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ انہیں دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ وہ خاتون بہت دیر سے روتی رہی ہیں۔ انہوں نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا اور ان کے بالوں میں جگہ جگہ مٹی لگی ہوئی تھی۔ ان کے ہاتھ میں ایک خون آلود کرتہ تھا۔ کرتے میں جگہ جگہ تیروں کے نشان تھے۔"

میں نے ایک کنیز سے پوچھا کہ یہ خواتین کون ہیں؟

کنیز نے بتایا۔ "مظلوم کربلا کی بیٹی! ادھر جناب حواؑ ہیں، اس طرف جناب

مریمؑ بیٹھی ہیں، ان کے برابر جناب آسیہؑ ہیں، ان کے ساتھ جناب موسیٰؑ کی والدہ اور آپ کی جدہ جناب خدیجہؑ تشریف رکھتی ہیں اور ان پانچوں کے درمیان جو خاتون تیروں سے چھدا ہوا خون آلود کرتا اپنے ہاتھوں میں لئے بیٹھی ہیں وہ آپ کی دادی، خاتون جنت حضرت فاطمہ زہراؑ ہیں۔"

دادی کا نام سن کر مجھ میں ضبط کی تاب نہ رہی۔ میں زور زور سے روتی ہوئی ان کی طرف دوڑی۔ "دادی اماں! سکینہ کا سلام ہو۔" میں نے ان کے قریب جا کر کہا۔

دادی اماں بے قرار ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ میں ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ "دادی اماں! مجھے تو کم سنی میں یتیم کر دیا گیا۔" میں نے ان سے فریاد کی۔

دادی نے مجھے اپنی گود میں بٹھا لیا۔ وہ میرے خاک آلود بالوں کو سہلاتی جاتی تھیں اور روتی جاتی تھیں۔ "میری جان! تمہارے بابا کی شہادت کے بعد کیا ہوا؟" انہوں نے پوچھا۔

"دادی! کیا بتاؤں کیا ہوا۔۔۔ ہمارے خیموں کو آگ لگا دی گئی۔ دشمن ہمیں بھیڑ بکریوں کی طرح میدان میں دوڑا رہے تھے۔ انہوں نے ہمارے سروں سے چادریں اور کانوں سے بندے نوچ لئے۔ دادی!۔۔۔ انہوں نے تو ہمارے پیروں سے جوتے تک اتروا لئے۔۔۔"

"بیٹی! تیرے بیمار بھائی کا کیا حال ہے؟" دادی اماں نے روتے روتے مجھ سے سوال کیا۔

"دادی! عاشور کے دن بھائی کو اتنا تیز بخار تھا کہ وہ کھڑے ہوتے تو انہیں چکر

آجاتا تھا۔ کاش آپ اس وقت بھائی کی حالت دیکھتیں جب ظالم ان کے گلے میں لوہے کا بھاری طوق ڈال کر انہیں اونٹ پر بٹھا رہے تھے۔ کئی مرتبہ تو بھائی اونٹ پر سے چکرا کر زمین پر گرے۔ آخر ظالموں نے میرے بھائی کو اونٹ پر بیٹھا کر ان کے دونوں پاؤں رسی سے اونٹ کے پیٹ کے نیچے باندھ دیئے۔ کربلا سے کوفہ اور کوفے سے شام تک ان کے پاؤں رسی سے اسی طرح چھلتے رہے اور جگہ جگہ ان سے خون ٹپکتا رہا۔"

یہ سن کر دادی اماں زور زور سے رونے لگیں۔ ان کے قریب بیٹھی خواتین نے انہیں سنبھالا۔ پھر دادی اماں نے پوچھا۔ "میری جان۔۔۔ میری بیٹی! مجھے یہ بتاؤ کہ جب تمہارے بابا شہید ہو گئے تو انہیں کس نے دفن کیا۔۔۔؟"

یہ سن کر میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ مجھے دادی اماں میں سے بابا کی خوشبو آرہی تھی اور یہ خوشبو میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کئے دے رہی تھی۔ ابھی تک تو میں نے برداشت کیا تھا لیکن جب دادی نے میرے پیارے بابا کا نام لیا تو میری حالت غیر ہو گئی۔ دادی نے مجھے سینے سے لگالیا اور ہم دونوں بہت دیر تک روتے رہے۔

پھر جب میں بولنے کے قابل ہوئی تو میں نے دادی سے کہا۔ "دادی اماں! آپ نے پوچھا تھا کہ میرے بابا کو کس نے دفن کیا۔۔۔ تو دادی! آپ کا بیٹا ایک بار نہیں کئی بار دفن ہوا۔ پہلی دفعہ تو آپ کے بیٹے کی لاش گھوڑوں کے سموں کے نیچے دفن ہوئی۔ دوسری بار اس کا جسم سیاہ آندھیوں میں دفن ہوا اور تیسری بار وہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو کر دفن ہو گیا۔۔۔ دادی اماں! جب ہم قیدی بن کر کربلا سے چلے تو آپ کا بیٹا تپتی ہوئی دھوپ میں صحرا کی ریت پر بے گور و کفن پڑا تھا۔۔۔"

جناب سکینہؑ بولتے بولتے خاموش ہو گئیں۔ جناب زینب بنت علیؑ نے انہیں

اپنے قریب کر لیا۔ ان کی آنکھیں بھی آنسوؤں کو ضبط کرتے کرتے سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔

دربار کے سناٹے میں لوگوں کی دبی دبی سسکیوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ یزید شراب کے نشے کی وجہ سے نیم غنودگی کی حالت میں تھا۔ جناب سکینہ خاموش ہوئیں تو اچانک اسے گہرے سناٹے کا احساس ہوا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

اسی وقت دربار سے ملی ہوئی مسجد میں اذان کی آواز بلند ہوئی اور دربار میں بیٹھے ہوئے علماء اپنی کرسیوں پر کسمسانے لگے۔ پیچھے کی صفوں سے "الصلوٰۃ... الصلوٰۃ" کی آوازیں اٹھنے لگیں۔

انھیں نماز پڑھنے کا اتنا خیال تھا۔ جس گھرانے نے بت پرستی کی ظلمت سے نکال کر انھیں اللہ کی عبادت کرنے کا راستہ دکھایا، جس رسولؐ نے انھیں نماز پڑھنے کا طریقہ سکھایا، جس رسولؐ کے کہنے پر وہ اللہ کی وحدانیت پر ایمان لائے، جس رسولؐ پر اعتماد کر کے انھوں نے اللہ کے احکامات پر عمل کرنا شروع کیا آج اسی رسولؐ کے گھرانے کی عورتیں اور بچے ننگے پاؤں ننگے سر قیدی بنے ان کے سامنے کھڑے تھے اور وہ "الصلوٰۃ... الصلوٰۃ" کے نعرے بلند کر رہے تھے۔

نماز سکھانے والے رسولؐ کی اولاد کو بھوکا پیاسا قتل کرنے والوں کو اس وقت نماز پڑھنے کی جلدی ہو رہی تھی۔ شب زندہ داروں، قرآن پر عمل کرنے والوں اور سجدہ گزاروں کے پاکیزہ خون سے اپنے ہاتھ رنگنے والے اپنے ہی رسولؐ کی اولاد کا تماشا بنانے والے "الصلوٰۃ... الصلوٰۃ" کی آوازیں بلند کر رہے تھے۔ مسخ شدہ قوموں کی یہی نشانیاں ہوا کرتی ہیں۔ ان نام نہاد مسلمانوں نے اعمال اللہ کے نبیوں کو قتل کرنے

والے یہودیوں سے کس قدر ملتے جلتے تھے!

"الصلوٰۃ۔۔۔ الصلوٰۃ" کی کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں تو یزید لڑکھڑاتا ہوا تخت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "کیا شور مچا رکھا ہے تم نے!" ان آوازوں سے اس کا نشہ خراب ہو رہا تھا۔

یزید کی آواز سن کر دربار میں سناٹا چھا گیا۔ "الصلوٰۃ۔۔۔ الصلوٰۃ" کہنے والوں کو شیطان کے نمائندے نے ہلکی سی ڈانٹ سنائی تو انہیں سانپ سونگھ گیا۔ ہر آدمی ایسا بن گیا جیسے "الصلوٰۃ" کہنے کا گناہ اس نے نہیں کسی اور نے کیا ہو۔

"اچھا خیر۔۔۔" یزید نے ہچکی لیتے ہوئے درباریوں کی طرف دیکھا۔ "جسے نماز پڑھنے کا شوق ہو رہا ہے وہ جائے۔" پھر اس نے قیدی عورتوں اور بچوں کے نگران سپاہیوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ اٹھایا اور بولا۔ "ان سب کو لے جاؤ اور قید خانے میں بند کردو۔" یہ کہہ کر وہ مڑا اور دربار سے محل میں جانے والے دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ یزید کے لڑکھڑاتے قدموں کو دیکھ کر اس کے خاص غلام نے اسے سہارا دیا۔ یزید نے اس غلام کی گردن میں ہاتھ ڈال دیئے اور لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔

شام کا سورج

ان کے نزدیک قاتل بھی قابلِ احترام تھا اور مقتول بھی۔
وہ مظلوم کو مظلوم سمجھتے تھے مگر ظالم کو ظالم کہنے پر تیار نہیں
ہوتے تھے۔ ایک عادت ان کی نسلوں میں منتقل ہو رہی تھی۔

باب۔ ۱۸

شام کا سرمئی اندھیرا رات کی تاریکی میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ یزید کے محل کے کمروں، راہداریوں اور دالانوں میں غلام اور کنیزیں روم اور ایران سے آئے ہوئے شیشے کے شمع دانوں اور بلور کے فانوسوں کو روشن کرتی پھر رہی تھیں۔ آج جشنِ فتح کی خوشی میں زیادہ ہی چراغاں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ محل کے بیرونی دروازوں پر بھی جگہ جگہ مشعلیں روشن ہوتی جا رہی تھیں جگہ جگہ یزیدی سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ دھیرے دھیرے سارا محل روشنیوں سے جگمگانے لگا تھا۔

روشنیوں سے جھلمل کرتے اس ماحول سے باہر اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ محل کے اردگرد کی آبادی غربت اور ناداری کی منہ بولتی تصویر تھی۔ یہاں عام مسلمان رہتے تھے۔ یہ ایسے مسلمان تھے جو دین و مذہب کے بارے میں بہت کم معلومات رکھتے تھے۔ سرکاری مسجدوں کے تنخواہ دار مولویوں نے انہیں اللہ کے بجائے اپنے ہی جیسے انسانوں کی غلامی کا سبق پڑھا رکھا تھا۔ وہ لوگ حاکم وقت کی خوشنودی ہی کو اللہ کی خوشنودی سمجھتے تھے اور دل و جان سے یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ہمارے حاکم اللہ کی جانب سے ہم پر حکومت کرتے ہیں۔ حاکم برے سے برا کام کرے تب بھی اس کی اطاعت اور اس کا کہا ماننا ہمارا فرض ہے کیوں کہ ان حاکموں کو اللہ ہی نے ہمارا حاکم بنایا ہے۔

غربت، مفلسی، مشکلات اور ظلم و تشدد کو وہ اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر مطمئن تھے اور یہ نہیں جانتے تھے کہ خدا اس قوم کی حالت نہیں بدلا کرتا جسے خود اپنی حالت بدلنے کا شعور نہ ہو! سرکاری مسجدوں کے مولوی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انہیں یہی بتاتے تھے کہ اللہ غربت، مفلسی اور ظلم سہنے سے تمہارا امتحان لے رہا ہے اس لئے اس سے نفرت نہ کرو، ساری زندگی ان مشکلات کو برداشت کرتے ہوئے گزار دو۔ آخرت میں تمہیں اس کا عظیم ثواب ملے گا۔

یہ وہ سبق تھے جنہیں سنتے ہوئے ایک نسل ختم ہو رہی تھی اور دوسری نسل جوان ہو رہی تھی۔

دین اسلام کی انقلاب برپا کرنے والی روشنیاں مکے اور مدینے سے نکل کر جب انبیاءؑ کے قاتلوں کی سرزمین، شام کے صوبے میں پہنچیں تو یہاں منافقت کے بادلوں میں گھر کر رہ گئیں۔ یہاں اسلام کے دشمن اسلام ہی کی نقاب پہن کر حکمرانی کر رہے تھے۔ دین کے نام پر دین داروں کی گردنیں کاٹی جا رہی تھیں۔ مفسرین قرآن بک چکے تھے، علماء خریدے جا چکے تھے، حدیث بیان کرنے والوں کی نئی جماعتیں تیار ہو چکی تھیں جو "قال رسول اللہؐ" کہہ کر دنیا کا بڑے سے بڑا جھوٹ بولنے کو تیار رہتی تھیں۔ ہر وہ من گھڑت حدیث سونے کے بھاؤ بکتی تھی جس سے اسلام اور رسول اسلامؐ کی اہانت کا کوئی پہلو نکلتا ہو یا جس کے ذریعے سلسلہ منافقین کے کسی فرد کی شخصیت اجاگر ہوتی ہو۔

نواسۂ رسول حضرت امام حسینؑ انہی منافقوں کے چہروں سے اسلام کی نقابوں کو اتارنے اور عام مسلمانوں کو اسلام کی انقلاب آفریں، زندگی ساز تعلیمات سے آگاہ

کرنے کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ عاشور کے دن کربلا میں حضرت امام حسینؑ اپنے ساتھیوں کے ساتھ جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ اب ان کے الٰہی منصوبوں کی تکمیل کی ذمے داری ان کی بہن زینب بنت علی اور ان کے بیٹے حضرت علی ابن الحسینؑ کے سپرد تھی۔ ان دونوں ہستیوں نے اب تک جس بہادری کے ساتھ ان عظیم ذمے داریوں کو پورا کیا تھا اس نے قیدیوں کے اس قافلے میں موجود ہر عورت اور ہر بچے کو ظلم کے طوفانوں کے مقابلے میں کسی چٹان کی طرح مضبوط کر دیا تھا۔ اب اس قافلے کا ہر بچہ ایک حسین تھا اور ہر عورت میں زینب بنت علی کی ناقابل شکست روح سما چکی تھی۔

یزید اور اس کی خفیہ ایجنسیاں قیدی عورتوں اور بچوں کے اس عزم و استقلال سے خوف زدہ تھیں۔ وہ ان قیدیوں کو شام کے تاریک قید خانے میں طویل مدت تک قید کر کے اب ظلم کا آخری حربہ آزمانا چاہتی تھیں۔ ان کا اندازہ تھا کہ ابھی تو ان قیدیوں کے زخم تازہ ہیں ان کا جوش اور ولولہ باقی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب انہیں ہوش آئے گا تو قید خانے کی اذیتیں ان کے لیے ناقابل برداشت ہو جائیں گی۔ ممکن ہے اس وقت ان قیدیوں میں سے کوئی بچہ، کوئی عورت ان کے ظلم کے آگے جھک جائے ان سے رحم کی درخواست کرے اور وہ ان سے حسین ابن علی کے خلاف کچھ کہلوانے میں کامیاب ہو جائیں۔

اگر ایسا ہو جاتا تو یزیدی حکومت کے شیطانی منصوبہ ساز اور مستقبل میں غاصبوں کے طرف دار اس بات کو خوب اچھالتے۔ خود حسین ابن علی کے خاندان والے ان کے فیصلے کی مخالفت کرتے تھے۔ لیکن یہ قیدی کوئی عام عورتیں اور بچے نہیں تھے۔ یہ اللہ کے آخری رسول کی اولاد تھے جنہوں نے کافروں سے کہا تھا کہ تم میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند بھی لا کر رکھ دو تب بھی میں انسانوں کو اللہ کے

دین کی طرف بلانے سے باز نہیں آؤں گا۔

یہ علی ابن ابی طالبؑ کی اولاد تھے جنہوں نے کہا تھا کہ تمہاری یہ حکومت میرے نزدیک جذامی کے ہاتھ میں بکری کی اوجھڑی سے بھی زیادہ حقیر ہے۔

یہ عورتیں اور بچے ہر ظلم کو برداشت کرنے کے لئے تیار تھے۔ وہ دنیا کے حاکموں کے آگے جھکنا نہیں، ایسے حاکموں کے تخت و تاج کو اپنے قدموں تلے حقارت سے روندنا جانتے تھے۔

☆☆☆

یزید کے جگمگاتے محل کے پیچھے یہ کوئی پرانے زمانے کی عمارت تھی۔ اس کی چھتیں برسوں پہلے گر چکی تھیں۔ اونچی اونچی دیواریں سلامت تھیں۔ اندر سارا فرش اکھڑا اپڑا تھا۔ جگہ جگہ گڑھے تھے۔ چھت کا ملبہ، اینٹیں پتھر اور خودرو گھاس پھونس کی وجہ سے رات کے وقت کسی کو یہاں داخل ہونے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ یزید نے اس عمارت میں ایک پھاٹک لگوا کر اسے اپنے دشمنوں کیلئے قید خانے میں تبدیل کر دیا تھا۔

اس قید خانے میں جب خاندان رسولؐ کی عورتوں اور بچوں کو داخل کیا جا رہا تھا اس وقت یہاں اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ رات کے اندھیرے میں یہ عورتیں اور بچے محض اندازے سے آگے بڑھ رہے تھے۔ کبھی کوئی بچہ کسی پتھر سے ٹکرا کر زخمی ہو جاتا تو کبھی کوئی عورت گڑھے میں پاؤں آجانے سے لڑکھڑا جاتی۔ قید خانے کے محافظ قیدیوں کو اندر دھکیل کر باہر چلے گئے تھے۔

جناب زینب بنت علیؑ نے تمام عورتوں اور بچوں کو ایک شکستہ دیوار کے قریب جمع کیا اور رات گزرنے کا انتظار کرنے لگیں۔ جب آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی

عادی ہوئیں تو انھوں نے زمین کا ایک ہموار سا حصہ تلاش کیا اور تیمم کر کے نماز مغرب میں مصروف ہوگئیں۔

حضرت امام زین العابدینؑ کے پاؤں میں ابھی تک لوہے کی بیڑیاں اور گلے میں ایک بھاری طوق پڑا ہوا تھا۔ آپ بڑی مشکل سے نماز کے لیے اٹھے تو قید خانے کے سناٹے میں بیڑیوں کی گونج پھیل گئی۔ بیڑیوں کی گونج سن کر جناب زینبؑ کی آنکھیں بھر آئیں۔ قنوت کیلئے ہاتھ اٹھاتے ہوئے آپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں بہنے لگیں اور آپ نے بے اختیار کہا۔ "اے رب العالمین ان ظالموں کے خلاف ہماری مدد فرما۔"

حضرت علی ابن الحسینؑ نماز مغرب کے لئے کھڑے ہو چکے تھے۔ یزیدی محل کی جانب سے دف، نفیریوں اور سارنگیوں کی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔

☆☆☆

قید خانے میں رہتے ہوئے انھیں کئی دن گزر چکے تھے۔ گرمی کا موسم تھا۔ دن بھر چلچلاتی دھوپ ہوتی اور رات میں بلا کا حبس اور گرمی۔ قید خانے میں کسی جگہ چھت نہیں تھی۔ جوں جوں سورج اوپر آتا رہتا، مشرقی دیواروں کا سایہ گھٹتا رہتا۔ سیدانیاں اپنے بچوں کو دھوپ سے بچانے کے لیے سائے کے ساتھ ساتھ دیوار کی طرف سمٹتی رہتیں۔ دوپہر کے وقت سایہ غائب ہو جاتا تو چلچلاتی دھوپ سے بچنے کی کوئی جگہ نہ رہتی۔ آسمان سے سورج آگ برساتا اور زمین کی ریت آگ کی طرح تپنے لگتی تو سیدانیاں اپنے چھوٹے بچوں کو گود میں لے کر کھڑی ہو جاتیں اور انہیں اپنے سائے میں لے کر اس وقت تک کھڑی رہتیں جب تک سورج مغرب کی طرف نہ جھکنے لگتا۔ اس وقت قید خانے کی مغربی دیواروں کا سایہ زمین پر پھیلنے لگتا۔

قید خانے کی دیواروں میں جگہ جگہ سوراخ تھے جہاں سے اس علاقے کی عورتیں، بچے اور بوڑھے آتے جاتے یہ منظر دیکھتے اور قیدیوں کی حالت پر افسوس کرتے رہتے۔ قیدیوں کی مظلومیت کے بارے میں وہ کھلے عام تو کچھ نہیں کہہ سکتے تھے لیکن جب اپنے گھروں میں جاتے یا اپنے بااعتماد دوستوں میں بیٹھتے تو ان قیدی عورتوں اور بچوں کی جرات، بہادری، صبر اور استقلال کی تعریف ضرور کرتے۔

رات کے اندھیرے میں آخری پہر، رات گئے تک جاگنے والے بوڑھوں کو جب قید خانے سے اللہ کی حمد و ثنا کی صدائیں سنائی دیتیں، محمدؐ و آل محمدؐ پر درود و سلام پڑھنے کی آوازیں آتیں تو یہ بوڑھے سوچتے کہ یہ "آل محمدؐ" کون ہیں جن پر یہ قیدی درود و سلام پڑھتے ہیں!

شام کے باشندے تو یزید اور اس کے بزرگوں ہی کو رسول اللہؐ کا رشتے دار سمجھتے رہے تھے۔ درود و سلام کی آوازیں سن کر وہ سوچتے کہ یزید کا تعلق اگر خاندان رسالتؐ سے ہوتا تو وہ ان قیدیوں پر بے پناہ ظلم کیوں کرتا جو خود اس کے خاندان پر درود و سلام پڑھتے ہیں۔ اس لیے یہ قیدی یزید کے لیے تو دعا نہیں کر سکتے تھے! ضرور یہ آل محمدؐ کوئی اور ہیں۔ یوں بھی قرآن مجید میں ظالم قوموں کا جو حال انہوں نے پڑھا تھا وہ تو یزید کی شخصیت اور حکومت پر پورا اترتا تھا۔ شراب نوشی، کتے پالنا، سور کا گوشت کھانا، بے وجہ لوگوں کو قتل کر دینا، یہ کام تو اسلام سے تعلق ہی نہیں رکھتے تھے۔

وہ ان قیدی عورتوں، بچوں کو دیکھتے کہ یہ قیدی کس قدر صبر و استقامت کے ساتھ قید خانے میں اللہ کی عبادت کرتے ہوئے زندگی گزارتے ہیں۔ یہ ویرانہ ہر وقت تلاوت قرآن کی آوازوں سے گونجتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس انھیں یزید کے محل سے

رات بھر موسیقی اور گانے جانے کی آوازیں سنائی دیا کرتی تھیں!

بوڑھے ہوں یا جوان، عورتیں ہوں یا بچے یہ باتیں ان سب ہی کو پریشان رکھتی تھیں۔ ادھر ادھر چہ مہ گوئیاں ہوتیں۔ ذہنوں میں سوال اٹھتے اور لوگ ان کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کرتے۔

وہاں بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے یزید کے دربار میں ان قیدیوں کی بے پناہ جرات و بہادری کا نظارہ کیا تھا۔ وہ ان کے دیئے ان خطبے اور تقریریں سن چکے تھے۔ وہ جان گئے تھے کہ یہ قیدی اسلام کے دشمنوں کی نہیں بلکہ یہ رسول اسلامؐ کی اولاد ہیں تبھی تو انھوں نے یزید کے دربار میں بے بس اور بے سہارا ہونے کے باوجود یزید کو ذلیل ورسوا کرنے میں کوئی کمی باقی نہیں چھوڑی تھی

ان سب باتوں کے وہ خود عینی گواہ تھے لیکن یہ ایک ایسی حقیقت تھی جس کی سچائی سے وہ خوف زدہ بھی تھے۔ وہ اس بات پر خود بھی غور کرتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں حکومت کے جاسوس ان کے دلوں کی باتیں نہ جان جائیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب یہ باتیں عام ہونے لگی تھیں کیونکہ لوگ بہر حال اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے تھے اور اس طرح جو خبریں ابھی تک راز تھیں اب آہستہ آہستہ دلوں سے زبانوں اور زبانوں سے گھروں بازاروں اور گلی کوچوں میں پھیلتی جارہی تھیں۔

دمشق کے رہنے والوں کی بدنصیبی یہ تھی کہ ان کے گناہوں نے ان سے عمل کی قوت چھین لی تھی۔ اب وہ ایک واضح اور کھلی سچائی کو مکمل طور پر قبول کرنے کی بجائے ذہنی تضاد اور انتشار کا شکار ہو گئے تھے۔ یزید کے خوف کی وجہ سے وہ اسے برا نہیں کہتے تھے۔ اہل بیت رسولؐ کی مظلومیت اور سچائی ان کے دلوں کو اپنی طرف کھینچتی

تھی اسی لئے وہ اہل بیتؑ سے ہمدردی اور محبت کرنے پر فطری طور پر مجبور تھے۔ یہی کیفیت آہستہ آہستہ ان کے دلوں میں جڑ پکڑ گئی۔ اب ان کے نزدیک قاتل بھی قابل احترام تھا اور مقتول بھی، وہ مظلوم سے بھی محبت کرتے اور ظالم کو برا بھی نہیں کہتے تھے۔ اسی طرزِ زندگی میں انہیں اپنی زندگی محفوظ نظر آتی تھی اور یہی عادت آہستہ آہستہ ان کی نسلوں میں منتقل ہو رہی تھی۔

☆☆☆

کربلا کے قیدیوں کی دربار یزید میں حاضری کو کئی روز گزر چکے تھے۔ اپنی امیدوں کے برعکس بھرے دربار میں یزید کو جس ذلت اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا تھا اس نے یزید کے اعصاب کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ شراب کا نشہ کم ہوتا تو اس کے زخم دوبارہ تکلیف دینے لگتے۔ یہ وہ زخم تھے جو جناب زینبؑ کی تقریر، بی بی سکینہؑ کے خواب اور اس کی ایک کنیز نے اپنی باتوں اور حقارت آمیز رویے سے اسے لگائے تھے۔

ان ذلتوں کا غم غلط کرنے کے لیے یزید نے کئی دن تک گانے بجانے والیوں، میراثیوں اور کھیل تماشے دکھانے والوں کو اپنے اردگرد جمع کیے رکھا۔ کئی دن تک محل میں جشن کا سا سماں رہا۔ چند روز اس طرح گزارنے کے بعد یزید کے اعصاب کسی حد تک پر سکون ہوئے۔ وقت نے اس کی ذلتوں کی اذیت کو کم کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے اندر ایک نیا اعتماد، انتقام کا پرانا جذبہ اور اپنی طاقت و اقتدار کا احساس دوبارہ ابھر آیا تھا۔

ایک دن دربار میں اپنے خوشامدیوں کے ساتھ بیٹھے بیٹھے یزید کے انتقام کی آگ اچانک ہی بھڑک اٹھی۔ اسے ایک نوجوان یاد آیا جسے کئی دن پہلے قیدی عورتوں بچوں

کے ساتھ اس کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ کسی نے اسے بتایا تھا کہ بیس بائیس سال کا نوجوان حسینؑ کا بڑا بیٹا ہے۔ وہ اسی دن اس نوجوان سے بات کرنا چاہتا تھا کہ اچانک اس کی کنیز روتی ہوئی دربار میں آگئی۔ پھر یکے بعد دیگرے ایسے واقعات رونما ہوتے رہے کہ اسے شراب پینے کے علاوہ کچھ یاد ہی نہیں رہا۔ آج کئی دن بعد اسے اس نوجوان کا خیال آیا تھا۔ اس نے اسی وقت اپنے دربان کو حکم دیا کہ اس نوجوان کو دربار میں حاضر کیا جائے۔

دربان نے یہ حکم قید خانے کے نگراں کو پہنچایا۔ اس نے امام زین العابدینؑ کو اندر آواز دے کر یزید کے حکم سے آگاہ کیا۔ امام علی ابن الحسینؑ اپنی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کو سنبھالتے ہوئے قید خانے کے دروازے پر پہنچے۔ بی بی زینبؑ سایے کی طرح ان کے ساتھ تھیں۔ یزید کے دربار میں طلبی کا سن کر جناب زینبؑ کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ انھیں خوف تھا کہ یزید کہیں ان کے بھتیجے اور امام وقت کو کسی بات پر قتل کرنے کا حکم نہ دے دے۔

امام سید سجادؑ نے اپنی پھوپھی کو دلاسا دلایا اور پورے اعتماد کے ساتھ قید خانے سے نکل کر قید خانے کے نگراں کے ساتھ ساتھ یزید کے محل کی طرف بڑھنے لگے۔

☆☆☆

اس وقت سورج کافی اوپر ابھر آیا تھا۔ سیدانیاں اپنے بچوں کو لیے قید خانے کی مشرقی دیواروں کے سائے میں بیٹھی تھیں۔ جناب سکینہؑ نے رات کے وقت اپنے مظلوم بابا کو خواب میں دیکھا تھا اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھیں۔ رات کی تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بس انھوں نے گھبرا کر رونا شروع کر دیا۔ کئی اور چھوٹے بچے بھی

جاگ گئے اور وہ بھی بلک بلک کر رونے لگے۔

امام سید سجادؑ، جناب زینبؑ، بی بی ام رباب، جناب ام کلثومؑ اور کئی دوسری خواتین اس وقت نماز شب میں مصروف تھیں۔ جناب ام رباب نماز تمام کر کے بچوں کی طرف دوڑیں' انہیں دلاسا دیا۔ ایک ایک کو تھپک تھپک کر سلایا لیکن جناب سکینہؑ کی سسکیاں نہیں رک رہی تھیں۔ جناب ام رباب ان کا سر سہلانے لگیں۔ بڑی مشکل سے جناب سکینہؑ کے آنسو رکے تو بی بی ام رباب نے نماز وتر ادا کی اور پھر جناب سکینہؑ کا سر اپنی گود میں رکھ کر بیٹھ گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے فجر کا وقت ہوا۔ سب قیدی عورتوں اور بچوں نے نماز فجر ادا کی۔ جناب سکینہؑ تو آدھی رات سے جاگ رہی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سورج نکل آیا۔

اس وقت بھی بی بی ام ربابؑ جناب سکینہؑ کا سر اپنی گود میں رکھے بیٹھی تھیں۔ جناب زینبؑ قید خانے کے دروازے سے لوٹ کر سیدھی اپنی بھائی کے پاس پہنچیں اور انہیں علی ابن الحسینؑ کی دربار یزید میں طلبی کے بارے میں بتایا۔ دوسری خواتین بھی وہیں جمع ہو گئیں۔ سب کے چہرے زرد ہو رہے تھے۔ بی بی سکینہؑ نے دوبارہ رونا شروع کر دیا تھا۔ کئی بچوں نے یہ بات سنی تو وہ بھی رونے لگے۔

پھر سب عورتوں نے جلدی جلدی تیمّم کیا اور تپتی زمین پر نماز حاجت پڑھنے کھڑی ہو گئیں۔ نماز کے بعد انہوں نے رو رو کر بارگاہ خداوندی میں دعا کی۔ "اے رب العالمین! علی ابن الحسینؑ کے علاوہ ہمارا کوئی سرپرست باقی نہیں رہا۔ اے سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والے! ہم بے کس ولاچار بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں پر رحم فرما۔ ہدایت کے اس چراغ کو بجھنے نہ دے۔ جس طرح تو نے اپنے نبی موسیٰؑ کو

فرعون کے ظلم سے محفوظ رکھا تھا اسی طرح اے رب العالمین! آج یزید کے دربار میں حسینؑ کے مظلوم بیٹے کو ظالموں کے شر سے محفوظ رکھنا۔"

ماؤں کو دعائیں مانگتے دیکھ کر چھوٹے چھوٹے بچے بھی ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے ننھے ننھے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کئے اور رو رو کر حضرت علی ابن الحسینؑ کی زندگی کے لئے دعائیں مانگنے لگے۔

پرانی سازش

بزرگوں نے شکست سے بچنے کے لیے قرآن نیزوں پر بلند کیے تھے۔
یزید اپنی شکست سے بچنے کے لیے بے وقت اذان دلوا رہا تھا۔
دربار شام میں حضرت علی ابن الحسینؑ کے خطبے کا احوال

باب۔۔ ۱۹

دربار سجا ہوا تھا۔ دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ باریک ریشمی پردے ہوا میں سرسرا رہے تھے۔ زرق برق لباسوں میں ملبوس غلام اور کنیزیں ہوشیار اور مستعد کھڑے تھے۔ سنہری کرسیوں پر بیٹھے ہوئے درباری، قبیلوں کے سربراہ، درباری علماء اور دوسرے ملکوں کے سفارتی نمائندے اپنی اپنی نشستوں پر براجمان تھے۔ کنیزیں رنگ برنگے لباس پہنے شیشے کے جاموں میں شراب لئے ایک ایک درباری کے پاس آجارہی تھیں۔ دربار کے ایک کونے میں بربط، دف اور ڈھول بجانے والے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے کے حصے میں کئی رقاصائیں بال کھولے جھوم جھوم کر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ یزید ایک اونچی جگہ اپنے تخت پر بیٹھا تھا۔ ایک کنیز اس کے دائیں جانب شراب کی صراحی لئے اس کے اشارے کی منتظر تھی۔ یزید جیسے ہی شراب کا جام تخت پر رکھتا، مستعد کنیز فوراً ہی اس کے جام کو دوبارہ شراب سے بھر دیتی۔

آج یزید کا اعتماد قابل دید تھا۔ وقت اور شراب نے اس کے زخموں کو عارضی طور پر بھر دیا تھا۔ پہلے دن دربار میں اسے جس قدر ذلت کا سامنا کرنا پڑا تھا اس کا تصور اب بھی اس کے ذہن میں آتا تو وہ جھنجھلا کر رہ جاتا لیکن وہ شراب کے ذریعے خود کو دھوکا دینے کے علاوہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

خاندانِ رسولؐ سے اس کی نفرت کی آگ آج دوبارہ بھڑک اٹھی تھی۔ وہ دنیا میں بھی آگ کا ایندھن بنا ہوا تھا۔ اسی آگ کے بھڑکتے الاؤ سے مجبور ہو کر اس نے حضرت علی ابن الحسینؑ کو دربار میں طلب کیا تھا۔ انھیں طنز کا نشانہ بنا کر اپنے وجود میں بھڑکتی آگ بجھانے کے لیے آج اس نے باقاعدہ ایک پروگرام بنایا تھا۔

خود اس کے اندر تو بولنے اور جواب دینے کی نہ صلاحیت تھی نہ طاقت اس لئے آج اس نے شہر کی ایک سرکاری مسجد کے چرب زبان خطیب کو دربار میں بلا رکھا تھا۔ یہ خطیب بلا کا چرب زبان اور حاضر جواب واقع ہوا تھا۔ اس کے آگے بڑے بڑے مقرر خاموش ہو جایا کرتے تھے۔ من گھڑت حدیثیں وہ اس اعتماد سے بیان کرتا کہ سننے والوں کو جھوٹ پر سچ کا گمان ہونے لگتا۔ قرآن کی آیات کا مطلب کچھ سے کچھ بیان کر دینا اس کے لیے معمولی بات تھی۔ وہ شاہی حکومت کا تنخواہ دار ملازم تھا۔ وہ دین کی تعلیمات سے بھی واقف تھا اور سنت رسولؐ کا بھی علم رکھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے لیکن وہ علم کو بھاری تنخواہ، انعامات اور حکومت سے ملنے والی مراعات کے بدلے سستے داموں فروخت کر چکا تھا۔

علم تو بارش کے قطرے کی طرح ہوتا ہے جو سیپ کے منہ میں جا کر موتی بن جاتا ہے اور سانپ کے منہ میں جا کر زہرِ قاتل۔ وہ خطیب اب ایک زہریلے ناگ میں تبدیل ہو کر حکومت کی بانسری پر رقص کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس وقت وہ ایک نچی کرسی پر نمایاں مقام پر بیٹھا یزید کے اشارے کا منتظر تھا۔

اچانک جانے کیا ہوا کہ بربط نواز کی انگلیاں بربط کے تاروں پر جم گئیں۔ دف نے والوں کے ہاتھ بے حرکت ہوئے۔ درباریوں کے قہقہے دم توڑنے لگے اور ہر

شخص چوکنا ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ دراصل ان سب نے باہر سے آنے و
بیڑیوں اور زنجیروں کی جھنکار کو سنا تھا جو آہستہ آہستہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ بیڑیوں
ہتھکڑیوں اور زنجیروں کی انہی آوازوں نے چند روز پہلے اسی دربار یزید کو لرزا کر رکھ د
تھا۔ بہت سے لوگ ان معصوم اور نورانی چہروں والے، پر اعتماد، سربلند قیدیوں کے
عزم و حوصلے، بے باکی، بہادری اور علمیت سے خوف زدہ تھے اور بہت سے لوگ ان کی
بے کسی اور مظلومیت کی وجہ سے ان سے متاثر نظر آتے تھے۔ اسی لئے اس جھنکار کے
ساتھ ہی بربط خاموش ہو گئے تھے۔ رقاصاؤں کے قدم جم گئے تھے، ہونٹوں کی
مسکراہٹ دم توڑ گئی تھی اور ظالموں کے چہرے اتر گئے تھے۔

زنجیروں اور بیڑیوں کی قریب آتی آوازوں نے یزید کو بھی چوکنا ہو کر بیٹھنے پ
مجبور کر دیا۔ اس نے شراب کا بھرا ہوا جام جلدی جلدی حلق سے اتارا اور تکیوں کے
سہارے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

دربار کے غلاموں نے بیرونی دروازوں پر لٹکے ہوئے دبیز سرخ ریشمی پردوں کو
سرکایا۔ سب سے پہلے دو حبشی غلام تلواریں اپنے کندھوں پر رکھے اندر داخل ہوئے۔
ان کے پیچھے قید خانے کا نگراں تھا اور اس کے پیچھے ایک بیس بائیس برس کا نوجوان نپے
تلے قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ حضرت علی ابن الحسینؑ، امام زین العابدینؑ تھے۔
آپؑ قیدیوں کے ملگجے لباس میں تھے لیکن ان کے چہرے کا نور انھیں ہزاروں میں
نمایاں کر رہا تھا۔

اس وقت یزید نے اپنے درباری خطیب کو اشارہ کیا۔ خطیب کا دل تیز تیز
دھڑک رہا تھا۔ اس کی ساری زندگی جھوٹ بولتے گزری تھی لیکن آج نجانے کیا بات

تھی کہ زندگی میں پہلی بار جھوٹ بولنے کے خیال سے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا لیکن وہ یزید کا غلام تھا اور اس کا حکم ماننے سے انکار کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یزید کے اشارے کا مطلب وہ جانتا تھا اس لئے ہمت کر کے اٹھا اور اس منبر پر جا کر بیٹھ گیا جہاں سے اسے خطبہ دینا تھا۔

منبر پر بیٹھتے ہی اس کی زبان کھل گئی۔ پھر اس نے یزید کی حکومت، یزید کے بزرگوں کے کارناموں اور یزید کی شان میں انتہائی پرجوش تقریر کی۔ اس دوران وہ حضرت علی ابن ابی طالبؑ اور ان کی اولاد کے بارے میں جو برا بھلا کہہ سکتا تھا وہ اس نے دل کھول کر کہا۔

تقریر ختم کر کے اس نے زنجیروں میں جکڑے ہوئے نوجوان کی طرف انتہائی غرور کے ساتھ دیکھا۔ حضرت علی ابن الحسینؑ کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا۔ خطیب سمجھ رہا تھا کہ اس کی زبردست تقریر کے بعد یہ نوجوان شرمندگی سے سر جھکائے کھڑا ہو گا مگر حضرت علی ابن الحسینؑ کا سینہ تنا ہوا تھا اور آپ عجیب شان سے سر اٹھائے کھڑے تھے پھر آپ کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ "تو نے مخلوق کو خوش کرنے کے لئے اللہ رب العالمین کی ناراضگی خرید لی ہے۔" حضرت علی ابن الحسینؑ نے اسے مخاطب کر کے کہا۔ آپ کے لہجے میں گہرا دکھ تھا۔

پھر آپ نے یزید کی طرف دیکھا اور بولے۔ "تیرے خطیب نے جو کچھ کہا سو کہا، لیکن اب مجھے بھی اجازت دے کہ میں بھی اس منبر پر جا کر وہ باتیں کروں جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو پسند ہیں۔"

"نہیں تمہیں اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی" یزید کے لہجے میں نفرت اور

غرور کی چنگاریاں تھیں۔

اسی وقت ایک درباری اٹھ کھڑا ہوا۔ ''امیر المومنین! اللہ آپ کا اقبال سلامت رکھے۔ اس نوجوان کو اپنے غموں ہی سے فرصت نہیں۔ یہ کیا بول سکے گا!'' اس نے ادب کے ساتھ یزید سے کہا۔

یزید نے اس درباری کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں شاید معلوم نہیں کہ فصاحت و بلاغت اور بہادری اس خاندان کے خون میں شامل ہے!'' اس نے کہا۔

''بابا جان! یہ ایک کمزور، بیمار اور غم زدہ لڑکا ہے، یہ کیا کہہ سکتا ہے! آپ اسے بولنے کی اجازت دے دیں۔'' یزید کی بات سن کر اس کا بیٹا معاویہ بول اٹھا۔

اسی وقت یزید کا درباری خطیب بولا۔ ''امیر المومنین! اس لڑکے میں اتنی صلاحیت ہی کہاں ہے کہ یہ کوئی پر اثر تقریر کر سکے!'' خطیب کے لہجے کا غرور انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔

''ٹھیک ہے۔۔۔'' یزید نے ہار مانتے ہوئے حضرت علی ابن الحسینؓ کو منبر پر جانے کا اشارہ کیا۔

حضرت علی ابن الحسینؓ اپنی ہتھ کڑیوں اور بیڑیوں کو سنبھالتے ہوئے اس منبر کی طرف بڑھے جسے دراصل آلِ رسولؐ کے لئے مخصوص ہونا چاہیئے تھا لیکن آج اس منبر پر بندر اچھل کود کر رہے تھے۔

حضرت علی ابن الحسینؓ منبر پر سنبھل کر بیٹھے۔ پھر آپؑ نے دربار میں ہر طرف نظریں دوڑائیں۔ قبیلوں کے سربراہوں کی طرف دیکھا۔ درباریوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ زر خرید علماء کے مسخ ہوتے چہروں کو دیکھا اور اللہ رب العالمین کی حمد

و ثناء بیان کرنا شروع کی۔

آپ کی آواز کا اعتماد، لہجے کی سچائی اور چہرے پر پھیلا ہوا ابدی سکون سننے والوں کو حیران کر رہا تھا۔ اللہ کی حمد و ثناء بیان کرنے کے بعد آپ نے محمدؐ و آل محمدؐ پر درود پڑھا۔ درود پڑھتے پڑھتے آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

آل رسول کی مختلف ہستیاں کس کس طرح ظلم کا شکار ہوئیں۔ کسی کو تلوار سے شہید کیا گیا، کسی کو زہر کے ذریعے۔ ان کے بابا کو تو یزید کے لشکر نے ان کے تمام ساتھیوں کے ساتھ صحرا میں بھوکا پیاسا شہید کیا تھا اور آل رسول کی خواتین بے چھت کے قید خانے میں بند تھیں۔ شاید یہی سوچتے آپ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

درود پڑھنے کے بعد آپ چند لمحے خاموش رہے۔ پھر آپ نے دربار میں ادھر سے ادھر نظر دوڑائی۔ سننے والوں کی توجہ اپنی جانب مرکوز کی اور کہا۔

"اے لوگو! جو مجھے جانتا ہے وہ تو جانتا ہے البتہ جو شخص مجھ سے واقف نہیں ہے اس سے میں اپنا تعارف کرائے دیتا ہوں۔ میرا نام علی ہے۔ میں علیؑ ابن ابی طالبؑ کے بیٹے حسینؑ کا بیٹا ہوں۔ اس حسینؑ کا جو حج کرتا تھا اور لبیک کہتا تھا۔ میں صفا و زمزم کا فرزند ہوں۔ میں رسول اسلامؐ کا بیٹا ہوں۔ میں رسول اکرمؐ کی بیٹی فاطمہ زہراؑ کا بیٹا ہوں۔ میں اس حسینؑ کا بیٹا ہوں جس کا سر اس کی گردن کے پیچھے سے کاٹا گیا۔ میں اس حسینؑ کا بیٹا ہوں جسے آخری سانس تک پیاسا رکھا گیا۔ میں اس حسینؑ کا بیٹا ہوں جسے کربلا کی ریت پر لٹا دیا گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کے خاندان کی عورتوں

اور بچوں کو قیدی بنالیا گیا۔ میں اس حسینؑ کا بیٹا ہوں جس کے بچوں
کو بغیر کسی جرم کے ذبح کر دیا گیا۔۔۔"

آپ بولتے بولتے ایک لمحے کو رکے تو دربار کے سناٹے میں ہلکی سی سسکی سنائی دی۔ ایسا لگا جیسے کسی نے بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں پر قابو پایا ہو۔ یزید نے سسکی کی آواز کی سمت دیکھا۔ اسی دوران میں کسی اور طرف سے ایسی ہی آواز بلند ہوئی۔ یزید نے پلٹ کر اس طرف دیکھا مگر وہ اندازہ نہیں کر سکا کہ آواز کس کے ہونٹوں سے بلند ہوئی ہے۔ ابھی وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ حضرت علی ابن الحسینؑ کی آواز نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔

حضرت علی ابن الحسینؑ کہہ رہے تھے :

"میں اس کا بیٹا ہوں جس کے خیموں کو جلا دیا گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کی لاش تپتے صحرا میں بے گور و کفن چھوڑ دی گئی۔ میں اس کا بیٹا ہوں جسے نہ غسل دیا جا سکا نہ کفن۔ میں اس حسینؑ کا بیٹا ہوں جس کا سر نیزے کی نوک پر بلند کیا گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کا پاک و پاکیزہ جسم کہیں پڑا ہے اور سر مبارک کہیں اور ہے۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کے چاروں طرف دشمن ہی دشمن تھے۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کے اہل حرم کو قیدی بنا کر کربلا سے شام تک تماشا بنایا گیا۔"

دربار میں رونے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ یزید کے اعصاب کو شراب کے نشے نے سن کر رکھا تھا۔ اس کی ذہنی حالت اب ایسی نہیں تھی کہ وہ کوئی فیصلہ کر سکے یا

کوئی حکم دے سکے۔

حضرت علی ابن الحسینؑ نے روتے ہوئے لوگوں کو دیکھا تو ان کے سر ندامت سے جھک گئے۔ آپؑ نے درباری علماء کی طرف دیکھا اور کہا۔

"تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو کہ اللہ جل شانہ نے ہمیں پانچ خصوصیات عطا کی ہیں۔ ۱۔ خدا کی قسم رسالت ہمارے خاندان میں تھی اور فرشتے ہمارے گھر میں آتے رہے ہیں۔ ۲۔ قرآن کی آیات ہم اہل بیت کی شان میں نازل ہوئیں۔ ۳۔ ہم ہی نے دنیا میں انسانوں کو صراط مستقیم دکھائی۔ ۴۔ شجاعت اور بہادری ہماری ہی میراث ہے اور ہم کسی مشکل سے نہیں گھبراتے۔ ۵۔ بہترین طریقے سے بات کرنا اور لوگوں تک اپنی بات پہنچانا ہم سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔"

یہ کہہ کر آپ نے پہلے یزید کی طرف دیکھا پھر اس کے درباری خطیب کے چہرے پر نظر ڈالی۔ خطیب کا سر جھکا ہوا تھا اور یزید اسے غصے سے گھور رہا تھا کیونکہ اس نے حضرت علی ابن الحسینؑ کو تقریر کی اجازت دینے کی سفارش کی تھی۔ حضرت علی ابن الحسینؑ نے دوبارہ سارے دربار پر نظر دوڑائی اور فرمایا۔

"سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرنا، علم طلب کرنے والے کو علم کی دولت سے فیضیاب کرنا ہماری عادت ہے۔ زمین و آسمان میں ہمارا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ اگر ہم نہ ہوتے تو خداوند عالم اس دنیا ہی کو تخلیق نہ فرماتا۔ فخر کرنے کا اعزاز صرف ہم ہی کو

حاصل ہے۔ قیامت کے دن ہمارے دوست حوض کوثر سے
سیراب ہوں گے اور ہمارے دشمن اپنے برے اعمال کی سزا پائیں
گے۔۔۔"

ابھی آپؑ کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ دربار میں ہلچل مچ گئی۔ کئی افراد روتے روتے بے قابو ہو کر چیخنے اور اپنا سر پیٹنے لگے۔ یزید ہڑبڑا کر اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ اس کا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔ اس نے چیخ کر درباری موذن کو حکم دیا۔ "۔۔۔اذان شروع کرو۔۔۔اذان شروع کرو"

یزید لوگوں کو روتے اور چیختے ہوئے دیکھ کر ڈر گیا تھا کہ دربار میں کوئی ہنگامہ نہ کھڑا ہو جائے۔ اسی لئے وہ اذان دلوا کر حضرت علی ابن الحسینؑ کی تقریر کو روکنا چاہتا تھا۔ اس کے بزرگوں نے جنگ میں شکست سے بچنے کے لئے علی ابن ابی طالبؑ کے سامنے قرآن نیزوں پر بلند کئے تھے۔ آج یزید، اپنی شکست سے بچنے کے لیے علیؑ کے پوتے کی تقریر کو بے وقت اذان دلوا کر روکنا چاہتا تھا!

موذن کی آواز بلند ہوئی۔ "اللہ اکبر"

حضرت علی ابن الحسینؑ نے کہا۔ "تم نے خدائے بزرگ و برتر کی بزرگی بیان کی، عظیم پروردگار کی عظمت بیان کی اور حق بات کہی۔"

موذن نے بلند آواز سے کہا۔ "اشھدان لاالہ الااللہ۔"

حضرت علی ابن الحسینؑ نے کہا۔ "اللہ کی وحدانیت کی گواہی دینے والے کے ساتھ میں بھی گواہی دیتا ہوں۔"

موذن نے آواز بلند کی۔ "اشھدان محمد رسول اللہ"

یہ سن کر امام علیہ السلام کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جب موذن دوسری

مرتبہ یہ کلمہ ادا کر چکا تو حضرت علی ابن الحسینؑ نے اپنے آنسوؤں کو صاف کیا اور یزید کو مخاطب کر کے بولے۔ "اب ایک بات کا جواب دے یزید! کہ محمد رسول اللہؐ جن کی نبوت کی گواہی تو سن رہا ہے، یہ محمدؐ تیرے جد تھے یا میرے!"

"آپ کے جد تھے..." یزید کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"اگر یہ میرے جدؐ تھے تو پھر ان کے اہل بیت کو تو نے آخر کس جرم میں قتل کیا۔؟" امام نے سوال کیا۔

یزید نے اپنا منہ پھیر لیا۔ اس کے چہرے کی کالک اور گہری ہو گئی تھی۔ وہ اس سوال کا جواب کس طرح دے سکتا تھا۔ اس وقت تو اس کے دماغ میں غصے کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اس نے گردن گھما کر اپنے درباری خطیب کو دیکھا۔ "تم دیکھ رہے تھے ناں کہ یہ لڑکا کیا تقریر کرے گا؟"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ نوجوان ایسی تقریر کر سکتا ہے؟" خطیب نے ندامت سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"کیا تم نہیں جانتے تھے کہ یہ خاندان نبوت کا ایک فرد ہے؟" یزید دانت پیستے ہوئے بولا۔

"اگر یہ بات سچ ہے کہ یہ نوجوان خاندان رسالت کا ایک فرد ہے تو پھر امیر المومنین! آپ نے اس کے باپ کو قتل کیوں کیا؟ خاندان نبوت کی عورتوں کو بے پردہ کر کے تماشا کیوں بنایا؟" درباری خطیب بے ساختہ بول پڑا۔

"تو مجھ سے سوال کر رہا ہے..." یزید جھنجھلا کر چیخا۔ پھر اس نے اپنے ایک جلاد کو اشارہ کیا۔ جلاد تیزی سے اس کے قریب آیا۔ "ہمارا یہ زر خرید غلام شاید اس

قیدی کے ساتھ مل گیا ہے۔ حکومت کے خلاف بغاوت کرانا چاہتا ہے۔۔۔ دیکھتا کیا ہے۔ اڑا دے اس کا۔۔۔ سر۔۔۔ خطابت کے جوش میں اپنی حیثیت بھول گیا۔۔۔"

یزید کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔

اور اس سے پہلے کہ درباری خطیب اپنی صفائی میں کچھ کہتا، جلاد کی تلوار اس کا سر اڑا چکی تھی۔

☆☆☆

یزید کے تنخواہ دار خطیب کی لاش زمین پر بے حرکت پڑی تھی۔ اس کی گردن سے بہنے والا خون سیاہ ہو کر اس کی گردن کے ارد گرد جم گیا تھا۔ درباریوں کی سانسیں ان کے سینوں میں اٹکی ہوئی تھیں۔ وہ یزید کی سفاکی اور درندگی سے اچھی طرح واقف تھے لیکن یزید لاجواب ہو کر اس طرح اپنے درباری خطیب کو موت کے گھاٹ اتار دے گا اس کے بارے میں انھوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی یزید کے چہرے کو دیکھتے کبھی سر جھکائے جھکائے گردن گھما کر حسین ابن علیؑ کے جوان سال اور بہادر بیٹے کی طرف دیکھنے لگتے۔

حضرت علی ابن الحسینؑ کا چہرۂ مبارک ہیبت و جلال سے سورج کی طرح روشن تھا اور آپ انتہائی حقارت کے ساتھ یزید کو دیکھ رہے تھے۔ یزید کی نگاہیں امام کی نگاہوں سے ٹکرائیں تو وہ خالی الذہنی کی سی کیفیت میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

امامؑ کے قدم اب بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ وہ آپؑ کو ٹوک سکے۔ آپؑ انتہائی باوقار انداز سے قدم اٹھاتے ہوئے بیرونی دروازے سے نکل کر دربار سے باہر آ گئے۔

دربار کے باہر بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان میں یزید کے غلاموں، کنیزوں اور پہرے داروں کے علاوہ کئی واقعہ نگار بھی موجود تھے۔ یہ لوگ اس زمانے میں اخباری نمائندوں کی طرح کام کرتے تھے اور روزانہ رونما ہونے والے واقعات کو اپنی ڈائری میں لکھا کرتے تھے۔ حضرت علی ابن الحسینؑ دربار سے نکلے تو ان میں سے ایک شخص آگے بڑھا۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں؟" اس نے حضرت علی ابن الحسینؑ سے سوال کیا۔ اس شخص کا نام منہال بن عمرو تھا۔

حضرت علی ابن الحسینؑ نے اپنی رفتار دھیمی کر دی۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں؟" منہال نے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دوبارہ سوال کیا۔

"میں اس قید خانے کی طرف جا رہا ہوں جہاں یزید نے مجھے اور ہمارے گھرانے کی عورتوں اور بچوں کو قید کر رکھا ہے۔" امام نے جواب دیا۔

"قید خانہ۔۔۔" منہال نے پوچھنا چاہا۔

"ہاں ایسا قید خانہ جس میں اونچی اونچی دیواریں تو ہیں مگر چھت نہیں ہے۔ ہم جب سے اس قید خانے میں بند ہوئے ہیں ہوا اور دھوپ میں رہتے ہیں۔" امام نے منہال کو بتایا۔

"نواسہ رسولؐ آپ کا کیا حال ہے؟" منہال بن عمرو نے آپ سے تاثرات معلوم کرنا چاہے۔

"اس شخص کا کیا حال ہو سکتا ہے جس کے باپ کو شہید کر دیا گیا ہو اور جو بے یارو مددگار ہو؟ کیا تم نہیں دیکھ رہے کہ میں قیدی ہوں۔ ایسا قیدی جس کے سرپرست دنیا میں نہیں رہے۔ میں نے اور میرے خاندان نے موت کا مزا چکھ رکھا ہے۔" امام کے لہجے میں گہرا دکھ تھا۔ پھر آپ چلتے چلتے ایک لمحے کو ٹھہرے اور منہال کی طرف

دیکھ کر بولے۔ ''عرب کے رہنے والے، دوسروں کے سامنے فخر سے کہا کرتے تھے کہ اللہ کے آخری رسول محمدؐ ہم میں سے ہیں اور منہال! تم محمدؐ کے اہل بیتؑ کی حالت خود دیکھ رہے ہو کہ آج ہم مظلوم بھی ہیں اور مقتول بھی۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے ہمارا مرتبہ اور مقام کم ہو گیا اور ہمارا تعلق کسی معمولی خاندان سے ہے۔ جیسے ہماری کوئی فضیلت و عظمت ہی نہ ہو اور ہمارا عمل روشن اور پاکیزہ نہ ہو۔ عزت، شہرت اور حکومت صرف یزید اور اس کے فوجیوں ہی کیلئے مخصوص ہو گئی ہو۔ جیسے محمد رسول اللہؐ کے بیٹے دنیا کے ذلیل ترین لوگوں میں شمار ہونے لگے ہوں۔'' حضرت علی ابن الحسینؑ نے اپنے تاثرات بیان کیے اور قید خانے کے نگراں کے ساتھ قید خانے کی طرف مڑ گئے۔

نبیؐ کی نشانی

عیسائی اپنے نبیؑ کی نشانی کی حفاظت کر رہے تھے اور نام نہاد اسلامی حکومت رسول اسلامؐ کی نشانیاں مٹانے پر تلی ہوئی تھی۔

باب۔ ۲۰

کربلا کے مظلوم قیدیوں کو یزیدی حکومت کے دارالسلطنت دمشق میں آئے ہوئے کئی ہفتے گزر چکے تھے۔ یزید اور اس کی ظالم حکومت کے اہل کاروں کی خوشیاں تھیں کہ کم ہونے ہی میں نہیں آتی تھیں۔ روزانہ فتح کے شادیانے بجتے، محل پر چراغاں ہوتا، شراب کے دور چلتے اور رقص و موسیقی کی محفلیں سجتیں۔ کھیل تماشے دکھانے والوں، موسیقاروں، رقاصاؤں، گانے بجانے والوں اور شراب پینے والوں کی بن آئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے مسلمانوں کی دولت لوٹ رہے تھے۔ انعام و اکرام دینے والے بھی کھلے دل سے انعام دیتے تھے۔ یہ دولت ان کے ہاتھ کی کمائی ہوتی تو وہ کفایت شعاری بھی کرتے مگر یہ تو مسلمانوں کا لوٹا ہوا مال تھا جسے وہ بڑی بے دردی سے ساتھ اپنی عیاشیوں میں اڑا رہے تھے۔

عام مسلمان کی حیثیت تماشائی کی سی تھی۔ ان کے پاس نہ کرنے کو کام تھا نہ کھانے کے لیے روٹی، نہ بیماری کے لئے دوا۔ ملک کی ساری دولت حکمران طبقے کے ہاتھ میں تھی اور وہ اس دولت کو اسلام کا مذاق اڑانے اور دین کی تعلیمات کو مسخ کرنے کے لیے بے دریغ استعمال کرتے تھے۔

جس گھرانے نے انہیں کفر و شرک کے اندھیروں سے نکال کر دین اسلام کی روشنیوں تک پہنچایا تھا اس گھرانے کے مرد قتل کر دیے گئے تھے اور اہل بیت نبوتؐ کی محترم خواتین اور بچے بغیر چھت کے قید خانے میں بند تھے۔ خاندان نبوتؐ کے سربراہ اس وقت حضرت علی ابن الحسینؑ تھے۔ یزید کی دلی خواہش تھی کہ علی ابن ابی طالبؑ کے خاندان کا نام و نشان مٹا دے۔ وہ حضرت علی ابن الحسینؑ کو بھی کسی بہانے سے قتل کرنا چاہتا تھا لیکن واقعہ کربلا کے بعد یزید کی توقعات کے برعکس رائے عامہ جس طرح تبدیل ہوئی تھی اس نے یزید کو اس کے ناپاک منصوبوں سے باز رکھا تھا۔ حسین علیہ السلام کے بیٹے علی ابن الحسینؑ کو قتل کرنے کی خواہش کے باوجود یزید ڈرتا تھا کہ ان کے قتل سے اس کی حکومت کے خلاف کوئی نیا ہنگامہ نہ اٹھ کھڑا ہو۔

وہ اپنے ارد گرد لوگوں کے بدلتے ہوئے رویوں کو محسوس کر رہا تھا۔ حکومت کے جاسوس شہر کے بازاروں، دکانوں اور گلیوں محلوں میں ہونے والی باتوں سے اسے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ عوام میں چہ مہ گوئیاں ہو رہی تھیں۔ جناب زینب صلوات اللہ علیہا اور حضرت علی ابن الحسینؑ نے کوفے کے بازاروں، ابن زیاد کے محل اور یزید کے دربار میں جرأت و بہادری کے ساتھ جو تقریریں کی تھیں انہوں نے ظالم حکمرانوں کے چہروں سے اسلام کی نقاب کھینچ لی تھی۔

ان تقریروں میں جناب زینبؑ اور حضرت علی ابن الحسینؑ نے جو حقائق بیان کئے تھے، وہ حقائق اب ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے تک منتقل ہو رہے تھے۔ یزیدی حکومت نے اپنے بدترین جرائم پر پردہ ڈالنے کے لئے جو پروپیگنڈا کیا تھا

اس کا جادو ٹوٹ چکا تھا۔ بازاروں اور درباروں میں تقریروں کے ذریعے پھیلنے والی حق کی روشنی اندھیروں کو شکست دے رہی تھی۔ سچائی کی باتیں اب سینہ بہ سینہ شہر بہ شہر سفر کرنے لگی تھیں۔

حکومت کی خفیہ ایجنسیاں اپنی پروپیگنڈا مہم کی ناکامی اور عوام میں حکومت کے بارے میں تیزی سے بڑھنے والی نفرت سے خوف زدہ نظر آتی تھیں۔ یزید کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں لیکن وہ علی ابن طالب کے بیٹے حسین ابن علی سے ہار ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ تنہائی میں ہوتا تو اپنا سر پیٹتا کہ حسین ابن علی کو قتل کر کے مجھے روح کی بے چینی، پچھتاؤں اور مسلمانوں کی نفرت کے سوا کیا ملا لیکن جب دربار میں آتا تو حسین ابن علی کا سر اپنے تخت کے نیچے رکھتا اور اپنے درباریوں کے سامنے خوشی کا اظہار کرتا۔ انہیں مطمئن رکھنے اور خاندان نبوت سے اپنی شکست کا غم بھلانے کے لئے کھیل تماشے منعقد کراتا تھا اور ان ہنگاموں میں مصروف ہو کر وہ اپنے ضمیر کی خلش اور عوام کی نفرت کو بھلانے کی کوشش کرتا۔

اس کا دربار روزانہ سجتا، شراب کی محفل جمتی اور خوشامدی لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے۔ وہ شراب اور خوشامد کے نشے کے سہارے اپنی زندگی کے دن گزار رہا تھا لیکن جیسے ہی اسے تنہائی ملتی اس کی روح ایک ان دیکھی آگ میں جلنا شروع ہو جاتی۔ آگ کے شعلے اسے ہر طرف سے گھیر لیتے اور وہ شراب کے گھونٹوں سے اس آگ کو بجھانے میں مصروف ہو جاتا۔

☆☆☆

ایک دن یزید کا دربار سجا ہوا تھا۔ نواسۂ رسول کا سر اس کے قدموں کے قریب سونے کی تھالی میں رکھا تھا۔ دربار میں غیر معمولی رونق نظر آ رہی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ آج شہنشاہ روم کا سفیر دربار میں آنے والا تھا۔ یزید اور حکومت کے اہل کار سلطنت روم کے سفیر کو اپنی طاقت سے مرعوب کرنا چاہتے تھے کہ دیکھو ہماری فوجوں نے حکومت کے ایک باغی کو کس طرح ہلاک کیا اور کس طرح ہم نے حکومت کے خلاف ہونے والی بغاوت کو کچل کر رکھ دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ رومی سفیر یہاں سے جا کر جب اپنے ملک میں یزیدی حکومت کی شان و شوکت کا تذکرہ کرے گا تو رومی حکومت، یزیدی طاقت کے آگے سر اٹھانے کا تصور بھی نہیں کر سکے گی۔ آج دربار کے خصوصی انتظامات اسی سلسلے میں کیے گئے تھے۔

یزید نے آج بہت بھڑکیلا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ خود کو زیادہ سے زیادہ پراعتماد اور خوش و خرم ظاہر کر رہا تھا لیکن اس کی روح کے اندر ایک شعلہ بھڑک رہا تھا اور اندر ہی اندر اس کے وجود کو جلا کر خاکستر کر رہا تھا۔ شراب کا نشہ زیادہ ہوتا تو یزید کے اعصاب کچھ دیر کو پرسکون ہو جاتے لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اس کے وجود کے اندر سلگتے ہوئے انگارے شعلوں میں تبدیل ہونے لگتے۔

لیکن اس وقت یزید کا اعتماد عروج پر تھا۔ اہل بیت نبوتؐ سے اس کی نفرت اس کی حرکتوں سے نمایاں ہو رہی تھی۔ اسی وقت دربان بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوا اور یزید کے آگے رکوع کی حالت میں چلا گیا۔ ''شاہ روم کا سفیر خاص حاضری کی اجازت چاہتا ہے۔'' اس نے اسی طرح جھکے یزید کو اطلاع دی۔

"بلاؤ اس کو اندر۔۔" یزید کے لہجے میں غرور و تکبر کی جھلک نمایاں تھی۔ دربان الٹے قدموں پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ داخلی دروازے کے پاس جا کر اس نے ریشمی پردوں کو سرکایا۔

پردوں کے اس طرف عیسائی مذہبی رہنماؤں کے مخصوص لباس میں ایک ادھیڑ عمر شخص کھڑا تھا۔ اس نے سرخ رنگ کی عبا پہن رکھی تھی جس کے کناروں پر سونے کے تاروں سے خوب صورت پھول بوٹے کڑھے ہوئے تھے۔ سر پر سرخ رنگ کی ایک چوکور اونچی ٹوپی تھی۔ گلے میں چاندی کی صلیب لٹک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبا عصا تھا جس کے اوپر چاندی منڈھی ہوئی تھی۔ اس کی لمبی بے ترتیب داڑھی اس کے سینے تک پھیلی ہوئی تھی۔ یزید کے دربان نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا تو اس نے پروقار انداز سے قدم آگے بڑھائے۔ اس کے کئی اور ساتھی بھی احترام سے سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے قطار بنائے ایک ایک کر کے دربار میں داخل ہونے لگے۔

وہ دربار کے درمیانی حصے میں پہنچے تو انہوں نے یزید کو سلام کیا۔ زرق برق لباسوں میں ملبوس غلاموں نے مخصوص کرسیوں کی طرف ان کی رہنمائی کی۔۔ رومی سفیر نے اپنی نشست سنبھال لی تو اس کے ساتھی بھی اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔۔ رومی سفیر کی توجہ یزید کی طرف مرکوز تھی۔ اس کے ساتھی گردن گھما گھما کر دربار کی شان و شوکت دیکھ رہے تھے۔

اسی وقت یزید نے شراب کا جام ہونٹوں سے لگایا، چند گھونٹ حلق سے اتار ے

اور مکروہ انداز سے ہنستے ہوئے بولا۔ "حسین! تیرے نانا نے ہم پر شراب پینا حرام کیا تھا نا! یہ وہی شراب ہے۔۔۔" یہ کہہ کر وہ جھکا اور جام میں بچی ہوئی شراب سیدالشہداءؑ کے سر مبارک پر انڈ ھیل دی اور رومی سفیر کی طرف دیکھ کر تکبر بھرے انداز سے مسکرایا۔

رومی سفیر نے تخت کے نچلے حصے کی طرف پہلی بار دیکھا تھا جہاں سونے کی تھالی میں کسی انسان کا کٹا ہوا خون آلود سر رکھا ہوا تھا۔ سیدالشہداءؑ کے سر مبارک پر خون جما ہوا تھا لیکن آپ کے چہرۂ مبارک پر زندگی کی تازگی صاف نظر آرہی تھی۔ آنکھیں حرکت نہیں کررہی تھیں لیکن کھلی ہوئی تھیں اور بولتی محسوس ہوتی تھیں۔ ہونٹوں کی سرخی اور تازگی دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ ہونٹ کسی بھی لمحے حرکت کرنے لگیں گے۔

یہ منظر دیکھ کر رومی سفیر کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مرنے والوں کے چہرے پر ایسی تازگی اس نے پہلے کہاں دیکھی تھی! "یہ کٹا ہوا سر کس کا ہے؟" اس نے یزید سے سوال کیا۔

"یہ حکومت کے ایک باغی کا سر ہے۔" یزید نے بڑے فخر سے بتایا۔

"اسے کب قتل کیا گیا تھا؟" رومی سفیر کے لہجے میں گہرا تجسّس تھا۔

"کئی مہینے پہلے اس نے اور اس کے ساتھیوں نے حکومت اسلامی کے خلاف بغاوت کی تھی اور ہماری بہادر فوجوں نے دس محرم کو ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔" یزید نے رومی سفیر کو بڑے فخر سے بتایا۔

"اتنے مہینے گزر گئے اسے قتل ہوئے!" رومی سفیر نے مڑ کر اپنے ساتھیوں سے

سرگوشی کی۔ "مگر تم دیکھ رہے ہو اس کے چہرے کی تازگی۔۔۔ یہ کسی مردے کا چہرہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔!"

رومی سفیر نے دوبارہ یزید کی طرف دیکھا۔ "یہ کس کا سر ہے؟" اس نے سوال کیا۔ اس کا دماغ الجھ کر رہ گیا تھا کہ کسی مردہ شخص کے چہرے پر زندگی کے آثار کس طرح برقرار رہ سکتے ہیں۔

"بتایا تو ہے تمہیں کہ یہ حکومت کے ایک باغی کا سر ہے" یزید کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

"وہ تو میں سمجھ گیا کہ یہ تمہارے ایک باغی کا سر ہے لیکن اس کا نام کیا ہے؟" "اس کے باپ کا کیا نام ہے؟" "کس قبیلے سے تعلق رکھتا تھا یہ؟" رومی سفیر نے ایک ساتھ ہی بہت سارے سوال کر ڈالے۔

"تمہیں اتنی تفصیل میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ بس یہ ایک باغی تھا جسے ہماری فوجوں نے قتل کر دیا۔" یزید کے لہجے کی جھنجھلاہٹ برقرار تھی۔

"میں شہنشاہ روم کا سفیر ہوں۔ جب میں اپنے ملک جاؤں گا تو شہنشاہ مجھ سے تفصیل ضرور پوچھیں گے۔ اس لئے میں آپ سے یہ سوالات کر رہا ہوں۔" رومی سفیر نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"اس کا نام حسین ہے۔ یہ علی ابن ابی طالب کا بیٹا ہے۔ حکومت سے بغاوت کرنے چلا تھا۔" حضرت علی علیہ السلام کیلئے یزید کے سینے میں موجود نفرت اس کے لہجے میں سمٹ آئی۔

"علی ابن ابی طالبؓ۔" رومی سفیر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "اس کی ماں کا نام کیا تھا؟" سفیر نے تخت کے نیچے رکھے ہوئے سر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"فاطمہ۔۔۔بنت محمد۔" یزید نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

رومی سفیر نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ وہ کچھ دیر اس طرح بیٹھا رہا۔ پھر جب اس نے سر اٹھا کر یزید کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس کے رخساروں کو تر کر چکے تھے۔ اس نے رومال سے اپنا چہرہ صاف کیا اور بولا۔ "یزید! اگر میں یہ کہوں کہ ہمارا دین تمہارے دین سے زیادہ اچھا ہے تو یہ غلط نہ ہوگا!" اس کے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔

"یہ بات تم کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟" یزید ناگواری سے بولا۔

"تم مسلمانوں کے اعمال دیکھ کر۔" رومی سفیر نے بے ساختہ جواب دیا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" یزید غرا کر بولا۔

"تم نے کبھی گرجائے خاصر کے بارے میں سنا ہے؟" رومی سفیر نے یزید سے سوال کیا۔

"گرجائے خاصر۔۔گرجا کا تمہاری بات سے کیا تعلق؟" یزید جھنجھلا کر بولا۔

"میری بات سے اس کا تعلق ہے۔ جب میں اپنی بات مکمل کر لوں گا تو تم سمجھ جاؤ گے کہ میں نے اس وقت گرجائے خاصر کا تذکرہ کیوں کیا۔" رومی سفیر نے جواب دیا۔

"نہیں۔ میں نے اس گرجا کا تذکرہ نہیں سنا۔۔ تم آگے بولو۔" یزید نے کہا۔

"ملک چین کے قریب سمندر میں یہ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ اس خوب صورت جزیرے میں کافور کے درخت پائے جاتے ہیں۔ یہ جزیرہ تمام عیسائیوں کے لئے بے حد مقدس اور متبرک جگہ ہے یہاں بہت سارے گرجا موجود ہیں۔ یہاں کے سب سے بڑے گرجا کا نام گرجائے خاص ہے۔"

"اس گرجا میں ایسی کون سی خاص بات ہے؟" یزید نے تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔

"میں وہی بیان کرنا چاہتا ہوں۔" رومی سفیر نے جواب دیا۔ "دراصل اس گرجا کی سب سے مقدس چیز گدھے کا ایک سم ہے۔ یہ سم گرجائے خاص کے ایک طاق میں بڑی عقیدت کے ساتھ سجایا گیا ہے۔ اس طاق کو سونے میں منڈھا ہوا ہے۔ اس کے اندرونی حصے میں انتہائی قیمتی مخمل کے اوپر یہ مقدس سم رکھا ہوا ہے۔ ہر سال ہزاروں عیسائی اس سم کی زیارت کرنے یہاں آتے ہیں۔ اسے چومتے ہیں آنکھوں سے لگاتے ہیں۔" رومی سفیر نے بتایا۔

"اس سم کے اندر آخر ایسی کیا خصوصیت ہے جو تم لوگ اس کا اتنا احترام کرتے ہو؟" یزید نے سوال کیا۔

"اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت تو کسی کے پاس بھی نہیں ہے لیکن سنا ہے کہ شاید یہ اس گدھے کا سم ہے جس پر کبھی یسوع مسیح سوار ہوا کرتے تھے۔" رومی سفیر کی آنکھوں سے دوبارہ آنسو بہنا شروع ہو گئے تھے اور اس کی آواز بھر آئی تھی۔

"یہ بات سنا کر تم ہمیں کیا بتانا چاہتے ہو؟" یزید نے پوچھا۔

"میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے نبی کو گزرے ہوئے صدیاں بیت چکی ہیں لیکن ہم عیسائی اس گدھے کے سُم کا احترام صرف اس لئے کرتے ہیں کہ شاید یہ سم ہمارے نبی کی ایک نشانی ہے۔ صدیوں سے ہم نے اپنے نبی کی اس نشانی کو سینے سے لگا کر رکھا ہوا ہے اور ایک تم مسلمان ہو کہ ابھی تمہارے نبیؐ کا کفن بھی میلا نہیں ہوا کہ تم نے اس کی اولاد کو خون میں نہلا دیا، ان پر ظلم کے پہاڑ توڑ ڈالے! اور اس وقت تم اپنے نبیؐ کے پیارے نواسے حسین ابن علیؑ کے سر کو اپنے تخت کے نیچے رکھ کر فتح کا جشن منا رہے ہو! تم مسلمان اپنے رسولؐ کی نشانیاں مٹاتے ہو ہم اپنے نبی کی نشانیوں کی حفاظت کرتے ہیں اُن کا احترام کرتے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ تم مسلمان زیادہ اچھے انسان ہو یا ہم عیسائی جنہیں تم کافر اور مشرک سمجھتے ہو؟" رومی سفیر نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنی بات مکمل کر کے دربار کی مخملیں کرسیوں پر بیٹھے درباری علماء کو حقارت سے دیکھا جو شرمندگی اور ندامت کے مارے اپنی داڑھیاں کھجا رہے تھے۔ اس کے بعد اس کی نگاہیں یزید کے چہرے پر جم گئیں۔

"ہمارا دین اسلام تمہارے دین سے برتر ہے۔" یزید غرایا۔

ہمارا دین اسلام ۔۔۔! رومی سفیر نے طنزیہ انداز میں یزید کا جملہ دھرایا۔ اس کے لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔ "تمہارا دین اسلام سے کیا تعلق! تمہارا تو اس دین سے وہی تعلق ہے جو ایک کلہاڑی کا کسی درخت سے ہوتا ہے۔ تم نے اس درخت کی سایہ دار شاخیں کاٹ کر پھینک دیں اور اب کہتے ہو ہمارا دین اسلام ۔۔" سفیر کی آواز غصے اور صدمے سے لرز رہی تھی۔ اس کے لہجے کی سچائی نے سننے والوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

یزید کے پاس رومی سفیر کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ سچائی کا مقابلہ کس طرح کر سکتا تھا۔ اس کی حکومت کی ساری طاقت ہی جھوٹ کے سہارے قائم تھی۔ ایسے میں سچائی کا جواب صرف تلوار ہی سے دیا جا سکتا تھا اس طرح کہ سچ بولنے والے کی زبان کو خاموش کر دیا جائے۔ وہ غصے سے بے حال ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اس کے مزاج کو سمجھنے والے حبشی جلاد نے اپنے چوڑے پھل والی تلوار نیام سے باہر کھینچ لی اور یزید کے اشارے کے انتظار میں چوکس ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"دین اسلام کی شان میں گستاخی کرنے والے کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔" یزید نے انتہائی سفاکی سے کہا۔

"کیا تم مجھے قتل کر دو گے؟" سفیر نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

"اس میں کیا شک ہے۔ جلاد میرے ایک اشارے کا منتظر ہے۔" یزید نے جواب دیا۔

اپنے قتل کی خبر سن کر بجائے یوں رومی سفیر کے چہرے پر ایک عجیب طرح کا سکون پھیل گیا۔ اس نے انتہائی اطمینان کے ساتھ اپنی ٹوپی اتاری اور اپنے ایک ساتھی کی طرف بڑھا دی۔ پھر اس نے گلے میں لٹکی ہوئی صلیب نکالی اور اسی ساتھی کو تھما دی۔ اس کے بعد اس نے اپنا عصا [illegible] اپنی جگہ سے چند قدم آگے بڑھ آیا۔ پھر اس نے اونچی آواز میں کہا۔ "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے اور محمد مصطفیٰ اللہ کے بندے اور اس کے رسول برحق ہیں۔"

رومی سفیر کو کلمہ پڑھتے دیکھ کر یزید کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اللہ اور رسول کا کلمہ پڑھنے سے اب تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" اس نے طنزیہ انداز

سے کہا۔

"میں نے تمہارے دادا کی طرح اپنی جان بچانے کیلیے یہ کلمہ نہیں پڑھا۔" رومی سفیر نے بے ساختہ جواب دیا۔ "میں تو اپنی جان دینے کے لیے یہ کلمہ پڑھ رہا ہوں۔ آج صبح ہی سے میری روح بے چین تھی۔ میں نے رات کے پچھلے پہر سردار انبیاء حضرت محمد مصطفیٰؐ کو خواب میں دیکھا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ ان کے ساتھ تھے۔ حضرت عیسیٰؑ نے مجھے دین اسلام کی تعلیم دی اور مجھے یہ خوش خبری بھی سنائی کہ تم کل تک ہمارے پاس جنت میں پہنچ جاؤ گے۔ میں اس خواب کے بعد بہت حیران تھا۔"

"تمہیں حیرت کس بات پر تھی؟" یزید نے پوچھا۔

"حیرت اس بات پر تھی کہ میں بالکل صحت مند ہوں پھر چند گھنٹوں میں اچانک کس طرح اس دنیا سے چلا جاؤں گا!" یہ کہہ کر رومی سفیر تیزی سے یزید کے تخت کی طرف بڑھا اور اس سے پہلے کوئی اسے روک سکے اس نے تخت کے نیچے سونے کی تھالی میں رکھے ہوئے سر کو بڑے احترام کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر اپنے چہرے کے سامنے بلند کیا اور کہا:

السلام علیك یا بن رسول الله!السلام علیك ایھا المظلوم!السلام علیك ایھا الغریب...!السلام علیك یاابن فاطمه الزھرا...!"

یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرانے لگی۔ اس نے سید الشہداءؑ کے سر مبارک کو

چوما اور دوبارہ تخت کے پائے پر رکھ دیا۔

ابھی وہ سر کو نیچے رکھ کر کھڑا ہو رہا تھا کہ جلاد کی چمکتی ہوئی تلوار بجلی کی طرح اس کی گردن پر گری اور وہ کھڑے ہوتے ہوتے زمین پر گرتا چلا گیا۔ اس کی گردن سے نکلنے والے خون کے چھینٹے یزید کے تخت پر بچھے ہوئے قالین کے کناروں کو تر کرتے جا رہے تھے۔

قاتل کون

"یزید کے ایک فوجی سردار نے کہا۔خدا کی قسم!
وہ شخص آپ کے علاوہ کوئی اور نہیں حسین کے
قاتل کا نام یزید ہے۔یزید ابن معاویہ اور وہ آپ ہیں"

باب۔۲۱

ایک آگ تھی جس نے یزید کو ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔وہ اس آگ سے بچنے کیلئے کبھی موسیقی کی محفل سجاتا، کبھی بندروں سے کھیلتا، کبھی خوشامدیوں کو جمع کر کے ان کی باتیں سنتا تاکہ اپنی خوبیوں اور کامیابیوں کا تذکرہ سن کر اس کا دل بہلے لیکن اس کی ہر ترکیب ناکام ہو چکی تھی۔ شراب کا نشہ بھی اب آہستہ آہستہ بے اثر ہوتا جا رہا تھا۔وہ جس آگ میں جل رہا تھا اس کی شدت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

نواسۂ رسولؐ اور ان کے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اُتارنا اس کی سب سے بڑی آرزو اور سب سے بڑی خوشی تھی۔ کیونکہ اس کے خیال میں حسین ابن علیؑ کے بعد مسلمانوں میں کوئی ہستی ایسی باقی نہیں بچی تھی جو اسے شجر اسلام کو زمین پر گرانے سے روک سکے۔ یہ اسلام کے دشمنوں کا برسوں پرانا منصوبہ تھا اور اس منصوبے کی تکمیل یزید کے ہاتھوں ممکن ہوئی تھی۔

کربلا میں حسینؑ ابن علیؑ اور ان کے مٹھی بھر ساتھیوں کی شہادت کے بعد بہ ظاہر یہ شیطانی منصوبہ مکمل ہو چکا تھا۔یزید اور اس کے شیطانی منصوبہ ساز حسین ابن علیؑ کی شہادت کو دین اسلام کی موت سمجھ رہے تھے لیکن اصل حقیقت اس کے برعکس تھی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان شیطانی منصوبوں کو سمجھتے ہوئے دین اسلام

پر اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جانیں اس انداز سے قربان کیں کہ اسلام کی ڈوبتی ہوئی نبضیں تیزی سے دھڑکنے لگیں۔ دین اسلام کی کشتی جو منافقت کے ریتیلے ساحل پر پھنس گئی تھی کربلا کے شہیدوں نے اسے اپنے خون کی موجوں پر اٹھا کر دوبارہ وقت کے بے کراں سمندر کی لہروں پر رواں دواں کر دیا تھا۔

مصر، شام اور عراق پر حکمرانی کرنے والے اسلام کے نقاب پوش دشمنوں کے سارے خواب چکنا چور ہو چکے تھے۔ اپنی ناکامیوں نے یزید کو جھنجھلاہٹ، مایوسی اور چڑچڑے پن میں مبتلا کر دیا تھا۔ اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک نفسیاتی مریض بنتا جا رہا تھا۔

اس کے جاسوس اسے واقعہ کربلا اور کوفہ و شام کے درباروں اور بازاروں میں رونما ہونے والے واقعات اور حضرت علی ابن الحسینؑ اور حضرت زینب بنت علیؑ کی بے باک اور دلیرانہ تقریروں کے ردعمل سے آگاہ کر رہے تھے۔ گلیوں، بازاروں، گھروں اور محلوں میں عوام حکومت سے جس نفرت کا اظہار کر رہے تھے یزید کو عوام کے اس بدلتے ہوئے رویے کی اطلاعات بھی مل رہی تھیں لیکن اب وہ اپنے ہاتھ ملنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ لوگ اسے سفاک انسان کے نام سے پکارنے لگے تھے۔ ایسا سفاک اور لعنتی انسان جس نے رسول اسلامؐ کے خاندان کے مردوں کی گردنوں تک کو ذبح کر ڈالا تھا۔ بدنامی کے اس داغ نے یزید کو جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔

آخر بنی امیہ کی خفیہ ایجنسیوں کے منصوبے کے مطابق ایک دن یزید نے فیصلہ کیا کہ عوام کے سامنے وہ خود کو حسین ابن علیؑ اور ان کے ساتھیوں کے قتل سے بری الذمہ قرار دے۔ وہ عوام کو بتائے کہ حسینؑ کے قتل سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ

سب کچھ محض غلطی کی بنیاد پر ہوا ہے۔ میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

عوام کو مطمئن کرنے اور نواسۂ رسولؐ کے قتل کے الزام کو کسی اور کے سر پر تھوپنے کے لیے اس نے مختلف قبیلوں، محلوں اور آبادیوں کے مسلمانوں کو بڑی تعداد میں طلب کر کے ایک کھلی کچہری کا انتظام کیا۔ اس کھلی کچہری میں عام مسلمانوں کی بڑی تعداد کے علاوہ کربلا کی جنگ میں شریک ہونے والے بہت سے فوجی سردار بھی موجود تھے۔ لیکن یہ ڈراما چونکہ بہت عجلت میں رچایا گیا تھا اس لیے اس ڈرامے کے کئی کردار اپنا رول اچھی طرح سمجھ نہیں پائے تھے۔

اس موقع پر یزید نے عوام سے خطاب کرتے ہوئے بڑا نرم لہجہ اختیار کیا۔ آج اس کے لہجے میں تکبر کی بجائے ہمدردی و غم گساری کا تاثر نمایاں تھا۔ پہلے تو اس نے واقعہ کربلا کے سانحے پر افسوس کا اظہار کیا۔ ”ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ اس نے مصنوعی افسردگی کے ساتھ کہا۔

یہ بھی جابر حکمرانوں کا ایک انداز ہوتا ہے کہ جب ان کی لگائی ہوئی پابندیوں کی وجہ سے عوام کے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگے تو وہ خو[illegible] کے سامنے آکر اپنی کمزوری اور نااہلی کا اعتراف کرنے لگتے ہیں۔ حکمرانوں کی زبان سے ایسی باتیں سن کر عوام کے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے اور کسی تبدیلی کا بڑھتا ہوا طوفان دم توڑ دیتا ہے۔ عوام کے اکثر طبقے حکمرانوں کو ظالم کی بجائے مظلوم سمجھنے لگتے ہیں کہ حکمران تو بیچارہ ہمارے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا ہے مگر اس کے وزیر، مشیر اور انتظامیہ کے افسر ہی نکمے، خود غرض اور ظالم ہیں۔ وہ اکیلا بیچارہ کیا کر سکتا ہے!

آج بنی امیہ کا یہ حکمران ظالم حکومتوں کے استحکام کے اس تیر بہ ہدف

فارمولے کو آزمانے کا آغاز کر رہا تھا۔ جسے مستقبل کے غاصب حکمرانوں کے لیے مشعل راہ بننا تھا۔

سننے والے خاموش تھے۔ وہ یہاں مجبوراً آئے تھے۔ وہ یزید کی سفاکی سے واقف تھے اس لیے بہت کچھ کہنے کی خواہش کے باوجود خاموش بیٹھے تھے۔ یزید چاہتا تھا کہ ان میں سے کوئی بولے تو وہ اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کرے لیکن سننے والے یا خوف زدہ تھے یا غصے کی شدت سے بولنے کے قابل نہیں تھے۔ وہ ڈرتے تھے کہ غصے کی حالت میں ان کے منہ سے نہ جانے کیا بات نکل جائے۔

آخر یزید خود ہی بولا۔ "مسلمانو! میں نے سنا ہے کہ تم مجھے حسینؑ کا قاتل سمجھتے ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ رسولؐ کے نواسے کو میں نے قتل کیا ہے؟" اس نے حاضرین سے سوال کیا لیکن کسی نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ ان کی خاموشی یزید کے اردگرد بھڑکتے ہوئے شعلوں کو ہوا دے رہی تھی۔ یزید نے مصنوعی غصے کے ساتھ اپنے سرداروں کو دیکھا۔ "لعنت ہو تم لوگوں پر۔ تم نے حسین ابن علیؑ کو آخر کیوں قتل کیا؟"

کربلا میں حسین ابن علیؑ اور ان کے ساتھیوں کو تین دن کا بھوکا پیاسا رکھ کر قتل کرنے والے خون آشام درندے اور سفاک قاتل بے اختیار اچھل پڑے۔ ان میں سے بعض لوگوں کو یزید کے منصوبے کا علم ہی نہیں تھا۔ وہ چونکتے ہوئے اٹھ گئے۔

"کیوں قتل کیا تم نے حسین ابن علیؑ کو؟" یزید نے سختی کے ساتھ سوال کیا۔ فوجی سردار ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔ وہ حیران تھے کہ آخر یزید کیا کہہ رہا ہے اور اس کا کیا جواب دیا جائے۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے ہو۔ آخر معاملہ کیا

ہے؟'' یزید نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

چند سردار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ عوام کے اتنے بڑے اجتماع میں آخر انہیں کوئی جواب تو دینا ہی تھا۔ انہوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ ''حسینؓ کو عبید اللہ ابن زیاد نے قتل کیا ہے امیر المومنین۔'' یہ ڈرامے کے وہ کردار تھے جنھیں اپنا رول اور مکالمے اچھی طرح معلوم تھے۔

کوفے کا ظالم گورنر وہاں نہیں تھا لیکن اس کے حمایتی وہاں موجود تھے۔ ان میں سے ایک اٹھ کھڑا ہوا۔ ''امیر المومنین! حسین ابن علیؓ کو ابن زیاد نے نہیں قیس بن ربیع نے قتل کیا ہے۔'' اس نے بڑے ادب سے عرض کی۔

قیس بن ربیع وہاں موجود تھا۔ یزید نے اس سے پوچھا۔ ''کیا حسین ابن علیؓ کو تو نے قتل کیا ہے؟''

''نہیں امیر المومنین! ایسا نہیں ہے۔ میں نے حسین کو قتل نہیں کیا۔'' قیس بن ربیع نے کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''پھر نواسۂ رسولؐ کو آخر کس نے قتل کیا ہے؟'' یزید نے مصنوعی جھنجھلاہٹ کے ساتھ سوال کیا۔

''میں بتا سکتا ہوں نواسۂ رسول کے اصل قاتل کا نام۔'' قیس بن ربیع بولا۔

کھلی کچہری میں بیٹھے ہوئے مسلمان آپس میں سرگوشیاں بھی کر رہے تھے اور فوجیوں کی باتیں بھی سن رہے تھے لیکن جب قیس بن ربیع نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا کہ میں حسینؓ کے اصلی قاتل کا نام بتا سکتا ہوں تو سب لوگ اچانک خاموش ہو گئے وہ سننا چاہتے تھے کہ اس کھلی کچہری میں قیس بن ربیع کس کا نام لیتا ہے!

"کون ہے وہ شخص؟" یزید نے قیس بن ربیع سے سوال کیا۔

"مجھے جان کی امان دیں تو میں اس کا نام بتا سکتا ہوں۔" ماحول کے سناٹے میں قیس کی آواز بلند ہوئی۔

"تجھے جان کی امان ہے تو کسی خوف کے بغیر حسینؓ کے قاتل کا نام ان سب مسلمانوں کو بتا دے جو خلیفۂ وقت کو نواسۂ رسولؐ کا قاتل سمجھتے ہیں۔" یزید کے لہجے میں ہلکی ہلکی خوشی جھلکنے لگی تھی۔ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو رہا تھا۔ قیس بن ربیع کے بیان کے بعد وہ مسلمانوں کے سامنے خود کو نواسۂ رسولؐ کے قتل سے بری الذمہ قرار دے سکتا تھا۔ قیس بن ربیع کے اس بیان کو حکومت کی خفیہ ایجنسیوں اور پروپیگنڈا مشینریوں کو آئندہ کس طرح استعمال کرنا تھا یہ وہ جانتی تھیں۔ وہ تاریخ مسخ کرنے، سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے فن سے آگاہ تھیں۔ اس دور کے زیادہ تر مقرر، محدث، مفکر اور مفسر ان کے تنخواہ داروں میں تھے اور یزید کی خفیہ ایجنسیاں انھیں استعمال کرنے کے فن سے اچھی طرح واقف تھیں۔

"مجھے جان کی امان ہے ناں امیر المومنین؟" قیس بن ربیع نے ادب سے پوچھا۔

"ہاں ہاں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ تم جلدی بتاؤ۔ یہ سب لوگ حسینؓ کے قاتل کا نام جاننے کو بے چین ہیں۔" یزید کے لہجے میں بڑی بے تابی تھی۔

حسینؓ اور ان کے اہلِ بیتؓ کے قتل میں یوں تو ہزاروں فوجیوں نے حصہ لیا امیر المومنین لیکن ان کا اصل قاتل وہ شخص ہے جس نے اس مقصد کے لئے سپاہیوں کو بھرتی کیا، فوجیں تیار کیں، حسینؓ کا قتل کرنے والوں سے مال و دولت اور جاگیریں دینے کے وعدے کئے۔ حسینؓ کا اصل قاتل وہ ہے جس نے فوجیں بھیج کر حسینؓ کا

راستہ روکا اور جس کے حکم پر حسینؓ کو کربلا میں قتل کر دیا گیا۔" قیس بن ربیع نے کہا۔

"اس کا نام بتاؤ۔ کون تھا وہ جس نے یہ کام کیا۔" یزید بے تابی سے بولا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ قیس بن ربیع کوفے کے گورنر عبید اللہ ابن زیادہ کا نام لے گا اور مسلمانوں کے سامنے یزید کو اس الزام سے بری الذمہ قرار دے دے گا۔

"اس کا نام سننا چاہتے ہیں امیر المومنین!" قیس بن ربیع بولا۔ پھر یزید کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے بلند آواز سے کہا۔ "خدا کی قسم! وہ شخص آپ کے علاوہ کوئی اور نہیں۔ حسینؓ کے قاتل کا نام یزید ہے۔۔۔ یزید ابن معاویہ اور وہ آپ ہیں امیر المومنین!"

قیس کے جملے پگھلے ہوئے سیسے کی طرح یزید کے کانوں میں اترے تھے۔ وہ کھلی کچہری میں بیٹھے ہوئے مسلمانوں کے سامنے عریاں ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے لال انگارے کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ اگر وہ قیس کو جان کی امان نہ دے چکا ہوتا تو اس کے جلاد قیس کا سر اڑا چکے ہوتے۔

یزید نے قیس کو کوئی جواب دینے کے بجائے شراب کے گھونٹوں سے اپنے اعصاب کو پر سکون رکھنے کی کوشش کی۔ بزرگوں کی چالاکیاں اس کے مزاج میں شامل تھیں جو وقت اور مصلحت کے تحت کبھی گالی کھا کر بھی مسکرا دیتے اور کبھی محض عوام کو خوف زدہ کرنے کے لیے راہ چلتے بے قصور آدمی کو پکڑ کر ذبح بھی کر ڈالتے تھے۔ وہ قیس بن ربیع کو قتل کرا دینا چاہتا تھا لیکن اس وقت وہ اپنی ذلت غصے اور انتقام کو پی گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس فوجی سردار کا قتل فوجوں میں بغاوت پیدا کر سکتا ہے اسی لئے وہ خاموشی سے اٹھا اور مسلمانوں سے نظریں چراتا ہوا اپنے محل کے رہائشی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔

رہائی

یزید جو کچھ حاصل کرنا چاہتا تھا وہ اب ہمیشہ کے لیے اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ یہی بات اس کے پچھتاوے کا سبب تھی اور اسی ناکامی نے اسے نفسیاتی مریض بنا دیا تھا

باب۔ ۲۲

نواسہ رسولؐ حضرت امام حسینؑ کی قربانی کی اہمیت کو کم کرنے، اس کے عظیم مقاصد کو چھپانے اور اس کے رد عمل میں مسلمانوں کی بیداری کو روکنے کے لیے یزید کی حکومت کی تمام کوششیں، ہر طرح کی سازشیں اور شیطانی منصوبے ایک ایک کر کے ناکام ہوتے جا رہے تھے۔ حکومت کے جاسوس عوام کے بدلتے ہوئے رویے کے بارے میں اپنی رپورٹیں یزید کو پیش کرتے تو اس کا وجود نفرت، بے زاری، بے بسی اور پچھتاوے کی آگ میں جلنے لگتا۔ حسین ابن علیؑ کا قتل اس کی سب سے بڑی خواہش تھا۔ اسے نواسہ رسول کو قتل کرنے پر کوئی شرمندگی تھی نہ پچھتاوا۔ اسے پچھتاوا تھا تو اس بات پر کہ حسینؑ کے قتل سے وہ جو کچھ حاصل کرنا چاہتا تھا وہ سب کچھ ہمیشہ کے لئے اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

کربلا میں اس کی فوجوں نے جس بربریت کا مظاہرہ کیا تھا اس سے خوف زدہ ہونے کے بجائے عوام کے دلوں میں اس کے خلاف نفرت کا لاوا ابل رہا تھا۔ کربلا کے قیدیوں کے اعتماد اور بے باکی نے عوام کو ظلم سے ڈرنے کی بجائے ظلم سے ٹکرانے کا ایک نیا حوصلہ عطا کر دیا تھا۔ پہلے جو لوگ حکومت کے معاملات سے بے خبر اور غیر

جانبدار رہتے تھے انہوں نے بھی اپنے ارد گرد رونما ہونے والے واقعات میں دلچسپی لینا شروع کردی تھی۔

شام کے رہنے والے حکومت کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اب تک بنی امیہ ہی کو رسول اسلام کا رشتے دار سمجھتے رہے تھے۔ اکثر لوگ اسی وجہ سے ان کی عزت بھی کرتے تھے لیکن حضرت علی ابن الحسینؑ اور جناب زینب بنت علیؑ کی تقریروں نے اس فریب کا پردہ بھی ہمیشہ کے لیے چاک کر دیا تھا۔ یزیدی حکومت نے اسلام کی جو نقاب پہن رکھی تھی، کربلا کے قیدیوں نے اس کے چہرے سے وہ نقاب کھینچ کر یزید اور اس کے تمام سرپرستوں کو بے نقاب کر دیا تھا۔ یزید اب اگر کسی پچھتاوے کا شکار تھا تو اس کی وجہ اس کی یہی ناکامیاں تھیں اور انھی ناکامیوں نے اسے نفسیاتی مریض بنادیا تھا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کے خاندان کی عورتوں اور بچوں کو ایک اذیت خانے میں قید کر کے وہ سمجھ رہا تھا کہ قید خانے کی تکلیفوں سے بیزار ہو کر وہ اس سے رحم کی درخواست کریں گے' اپنے شہید ہو جانے والے سرپرستوں کے فیصلوں پر اعتراض کریں گے کہ انہیں حکومت سے ٹکرانے کی کیا ضرورت تھی۔ جس طرح سارے مسلمانوں نے یزید کی بیعت کر لی تھی اس طرح حسین ابن علیؑ اور ان کے ساتھیوں کو بھی زندگی بچانے اور اپنے بال بچوں کے مستقبل کو سنوارنے کے لیے اس کی بیعت کر لینا چاہیئے تھی۔

لیکن یزید کا یہ منصوبہ بھی ناکامی کا شکار تھا۔ قید خانے میں دن رات سخت تکلیفیں برداشت کرنے والی خواتین اور بچے عام عورتوں اور بچوں سے بالکل مختلف تھے۔ وہ

خاندان نبوت کے افراد تھے۔ ان کی رگوں میں نبیوں اور پیغمبروں کا خون دوڑ رہا تھا۔ وہ دنیا کے انسانوں کی رہنمائی کے لئے آنے والے نبیوں اور اماموں کے وارث تھے۔ وہ سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کی عظیم قربانی کے مقصد کی گہرائی کو جانتے تھے۔ انہیں یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ مشکلات و مصائب کے مقابلہ میں انہیں بہر حال ثابت قدم رہنا ہے ورنہ اسلام کے دشمن امام مظلومؑ کی قربانی کو رقابت ضد اور غصے کا رد عمل قرار دے کر اس کی اہمیت کو مسلمانوں کے دماغ سے محو کرانے کی کوشش کریں گے۔ اگر وہ ان مشکلات و مظالم سے ہار گئے تو امام مظلومؑ نے حریت و آزادی کا جو چراغ اپنے لہو سے روشن کیا ہے اس سے دوسرے ہزاروں لاکھوں چراغ نہیں جل سکیں گے۔

حضرت علی ابن الحسینؑ اور بی بی زینبؑ کی دلیرانہ قیادت میں کربلا کے قیدیوں میں شامل ہر عورت اور ہر بچہ اپنی جگہ ایک ناقابل شکست چٹان بن چکا تھا۔ انہیں قید کر کے یزید اب خود اپنے غلط فیصلوں کا قیدی بنا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح یہ معاملہ اب ختم ہو جائے۔ یہ قیدی جب تک شام کے قید خانے میں رہیں گے مسلمانوں کی توجہ اور ہمدردی کا مرکز بنے رہیں گے۔ ان قیدیوں کا عزم و حوصلہ مسلمانوں کے دلوں سے حکومت کے خوف کو روز بہ روز کم کرتا رہے گا اسی لئے یزید چاہتا تھا کہ وہ ان قیدیوں کو آزاد کر کے ذہنی سکون حاصل کرے اور مسلمانوں کی توجہ اور ہمدردی کا رخ اہل بیت کی طرف سے موڑ دے۔

وہ خود اپنے فیصلے کو منسوخ نہیں کرنا چاہتا تھا کیوں کہ اس میں اس کی اپنی ذات تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ قیدی خود اس سے رحم کی درخواست کریں لیکن یہ اس کا ایک خواب

تھا جسے کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہونا تھا۔ حسین ابن علیؑ کے خاندان سے یہ توقع کرنا ہی اس کی کم عقلی کی دلیل تھی۔ یہ قیدی ظلم و ستم کو آخری حد تک برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔

☆☆☆

بے چھت کے اذیت خانے میں سخت تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کرتے کرتے ایک سال گزر گیا۔ یہاں گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ اور راتوں کی شبنم سے بچنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ صبحیں راتوں میں، دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے رہے۔ گرمیاں، سردیوں میں تبدیل ہوئیں، خزاں بہار میں اور بہار خزاں میں بدل گئی لیکن ان قیدیوں کی زندگی میں خزاں کا جو موسم آیا تھا وہ نہ بدلا۔ اسی دوران اپنے باپ کے سینے پر سونے والی حسین علیہ السلام کی ایک بیٹی اپنے مظلوم باپ کو یاد کرتے کرتے اسی قید خانے کی مٹی کا حصہ بن گئی مگر یزید ان قیدیوں کے حوصلے کو شکست نہ دے سکا۔ یزیدی ظلم و ستم اپنی آخری حدود کو چھونے لگا لیکن ان قیدیوں کے ہونٹوں سے کسی نے شکایت نہیں سنی۔ حتیٰ کہ کسی چھوٹے بچے تک نے قید خانے کے دربان سے کبھی کوئی فرمائش کوئی درخواست نہیں کی۔

حضرت امام حسینؑ کی چھوٹی سی بچی نے قید خانے میں دم توڑا تو قید خانے کے اردگرد رہنے والے مسلمان ان قیدیوں کی مظلومیت پر آنسو بہانے پر مجبور ہو گئے۔ یہ خبر سینہ بہ سینہ سارے شہر میں پھیل گئی تھی۔ جو شخص اس خبر کو سنتا قیدیوں کی مظلومیت پر روتا اور بے اختیار حکومت کے کارندوں اور یزید کو برا بھلا کہنے لگتا۔ یہ ساری خبریں یزید تک پہنچ رہی تھیں اور وہ ان خبروں کو سن کر سوائے ہاتھ ملنے کے اور

کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

آخر ایک دن وہ ہار مان گیا۔ اس نے حضرت علی ابن الحسینؑ کو قید خانے سے بلوایا اور انہیں بتایا کہ وہ تمام قیدیوں کو رہا کرنا چاہتا ہے۔ "میں آپ کی تین باتیں مان سکتا ہوں۔ آپ جو چاہیں وہ بتائیں۔" اس نے امام سجادؑ سے کہا۔ آج اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ وہ جلد از جلد ان قیدیوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا جنہوں نے خود اسے اس کے محل میں قید کر رکھا تھا۔

"میں بھی تم سے تین ہی باتیں کہوں گا۔" حضرت علی ابن الحسینؑ نے نپے تلے انداز میں جواب دیا۔ "پہلی بات تو یہ کہ ہمیں اپنے سید و سردار کے سر مبارک کی زیارت کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ ہم آخری بار اپنے بابا کے چہرے کو دیکھ سکیں۔"

"نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ بالکل ناممکن ہے۔" یزید وعدہ کر کے صاف مکر گیا۔

"دوسری بات یہ کہ اگر تم نے مجھے قتل کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے تو کسی نیک آدمی کو اس قافلے کا سردار بنانا جو عورتوں اور بچوں کو مدینے لے کر جائے گا۔" امام علیہ السلام نے کہا۔

"میرا آپ کو قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ آپ خود اپنے خاندان کی خواتین اور بچوں کو مدینے لے جائیں گے۔" یزید نے جواب دیا۔

"ہماری تیسری خواہش یہ ہے کہ یوم عاشور ہمارے خیموں سے جو سامان لوٹا گیا تھا وہ ہمیں واپس دے دیا جائے۔" یہ کہتے کہتے امام علیہ السلام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"علی ابن الحسینؑ ! یہ مشکل کام ہے۔" یزید نے جواب دیا۔ "خیموں کو لوٹنے والے کون لوگ تھے ؟ کہاں سے آئے تھے ؟ کہاں گئے ؟ انہیں تلاش کرنا اور ان سے آپ کا سامان واپس لینا آسان کام نہیں۔" یزید کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ صاف جھوٹ بول رہا ہے۔ "آپ ایسا کریں کہ اس سارے سامان کی تفصیل بتا دیں میں اس کی کئی گنا زیادہ قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔" اس نے کہا۔

"اس کی قیمت ۔۔۔۔" حضرت ابن الحسینؑ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "اس سامان کے بدلے میں اگر تم اس پوری کائینات کو بھی ہمیں دینے کے قابل ہوتے تو ہم اسے ٹھکرا دیتے۔ تم کیا جانو کہ اس کی قیمت کیا ہے ؟" حضرت ابن الحسینؑ نے افسردگی کے ساتھ کہا۔

"آخر ایسی کیا چیز ہے اس میں !" یزید کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"اس میں بنت رسولؐ کا استعمال کیا ہوا چرخہ ہے" حضرت علی ابن الحسینؑ نے جواب دیا۔ "اس میں سیدۃ النساء العالمینؑ کا مقنع ہے۔۔۔ اس میں جنت کے سرداروں کی ماں کے گلے کا ایک ہار ہے جو جناب خدیجۃ الکبریٰؓ نے دنیا سے جاتے وقت ان کے گلے میں ڈالا تھا۔۔۔ اس میں فاطمہؑ بنت محمدؐ کی ایک قمیص ہے جو میری دادی نے اس وقت پہن رکھی تھی جب ان کے پہلو پر دروازہ گرایا گیا تھا۔ تم دے سکتے ہو اس کی قیمت ۔۔۔ !" حضرت علی ابن الحسینؑ کے چہرے پر عجب طرح کا جلال تھا۔

"مگر یہ سامان اب نجانے کہاں ہو گا ؟" یزید نے جواب دیا۔

"تمہیں نہیں معلوم لیکن مجھے معلوم ہے۔ ہمارے خیموں سے جو کچھ لوٹا گیا تھا وہ گیارہ محرم کو عمر ابن سعد کے ذریعے کوفے کے گورنر ابن زیاد اور اس کے ذریعے تم

تک پہنچ چکا ہے۔" حضرت علی ابن الحسینؑ کے لہجے میں ایسا اعتماد تھا کہ یزید نے سر جھکا لیا۔

"خیر ٹھیک ہے یہ سامان آپ کو واپس کر دیا جائے گا۔" یزید بولا۔ پھر اس نے اپنے افسروں کو حکم دیا کہ سارا سامان واپس کر دیا جائے۔

حضرت علی ابن الحسینؑ اسی وقت قید خانے لوٹ گئے۔ وہاں جا کر آپ نے اپنی پھوپھی جناب زینب بنت علیؑ کو ساری صورت حال بتائی۔ رہائی کی خبر سن کر عورتوں اور بچوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"حسینؑ کی بیٹی کو یہاں قید خانے میں کس طرح تنہا چھوڑ جاؤں!" جناب زینبؑ بے اختیار ایک چھوٹی سی قبر کی طرف دوڑیں اور اس پر ہاتھ رکھتے ہوئے زار و قطار رونے لگیں۔ ان کے ساتھ جناب ام کلثومؑ، ام رباب، ام لیلیٰ، فضہ اور دوسری خواتین بھی بلک بلک کر رونے لگیں۔ سارے بچے بھی اس چھوٹی سی قبر کے ارد گرد جمع ہو گئے اور قید خانے میں قیامت برپا ہو گئی۔

رونے کی آوازیں سن کر قید خانے کے محافظ اندر کی طرف دوڑے۔ یزید کے حکام نے انہیں قیدیوں کو رہا کرنے کے فیصلے کے بارے میں پہلے ہی بتا دیا تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ عورتیں اور بچے جو ایک سال سے قید خانے کی سخت اذیتیں برداشت کرتے رہے ہیں رہائی کی خبر سن کر خوشی اور مسرت کا اظہار کریں گے لیکن اندر جا کر جب انہوں نے ساری خواتین اور بچوں کو ایک چھوٹی سی قبر کے گرد حلقہ بنائے آنسو بہاتے دیکھا تو ان محافظوں کے دل بھی پسیج گئے۔ انہوں نے اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کو بہ مشکل روکا اور سر جھکائے باہر کی طرف قدم بڑھانے لگے۔

واپسی

عورتیں اور بچے شہیدوں کی قبروں کا طواف کر رہے تھے
کہ میدان کربلا "یا حسینؑ یا حسینؑ" کی آوازوں سے گونج اٹھا!

باب۔ ۲۳

قیدیوں کی رہائی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی تھی۔ دمشق کے مختلف محلوں سے عورتوں اور بچوں کا ایک سیلاب تھا جو اس گھر کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں مظلوم قیدی قید خانے سے آزاد ہو کر چند دن کے لئے ٹھہرے ہوئے تھے۔

جناب زینبؑ اور جناب کلثومؑ نے قید خانے سے رہا ہونے کے بعد یزید سے کہا تھا کہ ہم مدینے واپس جانے سے پہلے اپنے عزیزوں کو جی بھر کے رونا چاہتے ہیں۔ یزیدی حکام نے قید خانے کے قریب ہی ایک محلے میں ایک کشادہ مکان ان قیدیوں کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ قید خانے سے نکل کر یہ تمام عورتیں اور بچے اس مکان میں آگئے تھے۔ اس مکان میں فرش بچھے ہوئے تھے پانی کے مٹکے رکھے تھے اور زندگی کی تمام سہولتیں موجود تھیں۔

مہینوں کی قید کے بعد ان مظلوم قیدیوں کو پہلی بار آزادی کا سانس لینا نصیب ہوا تھا۔ کربلا کے سانحے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ یہ قیدی اپنی مرضی سے کھانا کھا سکتے تھے، ٹھنڈا پانی پی سکتے تھے۔ پانی کے مٹکے اوپر سے نم ہو رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر آنکھوں کو تراوٹ محسوس ہوتی تھی۔ مٹکوں کی اس نمی اور ٹھنڈک کو دیکھ کر جناب زینبؑ کے

ضبط کے بند ھن ٹوٹ گئے۔ وہ پانی کے مشکوں کو دیکھتی تھیں اور بلک بلک کر رونے لگتی تھیں۔ یہی حال دوسری خواتین کا تھا۔

اس ٹھنڈے پانی کو دیکھ کر کسی عورت کو اپنا بچہ یاد آتا، کوئی اپنے جوان بیٹے کی یاد میں تڑپنے لگتی۔ کسی کو اپنا بھائی یاد آتا جو کربلا میں تین دن کا بھوکا پیاسا شہید ہوا اور کوئی عورت اپنے مظلوم شوہر کو یاد کر کے آنسو بہانے لگتی جسے کربلا کے میدان میں بھوکا پیاسا قتل کر دیا گیا تھا۔

کوئی عورت کسی سے بات نہیں کر رہی تھی۔ بس ہر عورت بلک بلک کر روئے جا رہی تھی۔ چھوٹے بچے اپنی ماؤں کے گرد بیٹھے حیرانی کے ساتھ ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ بڑے بچوں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور وہ بے قراری سے اپنی ماؤں کے ارد گرد گھوم رہے تھے۔

بیرونی دروازے سے دمشق کے مختلف محلوں سے تعزیت کے لیے آنے والی عورتوں کا ایک تانتا بندھا ہوا تھا۔ ہر عورت نے سوگ کا سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ یہ عورتیں قطار در قطار اس گھر میں آ رہی تھیں اور فرش پر بیٹھتی جا رہی تھیں۔ کوئی آنکھ ایسی نہیں تھی جس سے آنسوؤں کی برسات نہ ہو رہی ہو۔ سارا ماحول سوگوار تھا۔ ہر طرف بس آہیں تھیں، سسکیاں تھیں۔

جناب زینبؑ مدینے سے کربلا، کربلا سے کوفہ اور کوفے سے شام تک پیش آنے والے واقعات کو بیان کیے جا رہی تھیں اور زار و قطار روئے جا رہی تھیں۔ صبح عاشور سے شام عاشور تک کے واقعات بیان کرتے کرتے ان کی حالت غیر ہونے لگتی تھی۔ یہی حال اہل بیتؑ کے خاندان کی دوسری خواتین کا تھا۔ جناب زینبؑ کسی شہید کا تذکرہ

کرتیں تو ہچکیاں لے لے کر رونے لگتیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی عظیم قربانی کے مقاصد مسلمانوں کو بتانا ان کی ذمہ داری تھی۔ اپنے مصائب کا بیان کرتے کرتے وہ اپنے اس فرض سے ایک لمحے کو بھی غافل نہیں ہوئی تھیں۔

یزید کے دارالحکومت دمشق میں سید الشہداءؑ کی عزاداری کا یہ سلسلہ کئی دن تک اسی طرح چلتا رہا۔ کسی یزیدی اہلکار کی مجال نہیں تھی کہ وہ ذکر حسینؑ کی ان مجلسوں کو روک سکے۔ دمشق کی عورتیں روزانہ صبح سویرے اپنے اپنے گھروں سے نکل کر یہاں آجاتیں اور جناب زینبؑ اور جناب ام کلثومؑ اپنے عظیم بھائی کی قربانیوں کے مقاصد بیان کرنا شروع کر دیتیں۔ پھر جب کسی مظلوم کی شہادت کا تذکرہ ہوتا تو سننے والوں کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگتے۔ اکثر عورتیں واقعات کربلا سنتے سنتے سوال کر لیتیں، اپنی رائے دیتیں کہ اگر امام حسینؑ یوں کر لیتے، اگر وہ زبانی طور پر بیعت کا وعدہ کر لیتے اور پھر کسی دوسرے ملک کی طرف نکل جاتے۔ اگر اس طرح ہو جاتا، اگر اس طرح ہو جاتا۔

اس طرح کے ہزاروں سوال جناب زینبؑ اور جناب ام کلثومؑ سے کیے جاتے اور اس بہانے واقعہ کربلا کی ترجمانی کرنے والی ان دونوں بہنوں کو موقع مل جاتا کہ وہ عوام کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے سوالوں کے جواب دے سکیں اور یزیدی پروپیگنڈے کے زہریلے اثرات کو دور کر کے امام حسین علیہ السلام کی فکر اور ان کی عظیم قربانی کے مقاصد کو عام لوگوں تک پہنچا سکیں۔

☆☆☆

ماہ صفر کی ابتدائی تاریخوں میں اہل بیت رسولؐ کے ان قیدیوں نے مدینے کی

طرف واپسی کے سفر کا آغاز کیا۔ اس مرتبہ اس قافلے کی شان ہی نرالی تھی۔ جب یہ قیدی کوفے سے شام لائے گئے تھے تو یزید کے دار الحکومت میں عید کا سا سماں تھا۔ مسلح فوجیوں نے کربلا کے شہیدوں کے سر اپنے نیزوں پر ابھار رکھے تھے۔ کربلا کے یہ مظلوم قیدی اونٹوں کی برہنہ کمر پر رسیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ حضرت علی ابن الحسین کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں پاؤں میں بیڑیاں اور گردن میں لوہے کا ایک خاردار طوق پڑا ہوا تھا۔ ہر طرف تماشائیوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ تماشائی مرد، عورتیں اور بچے ان قیدیوں پر پتھر اچھال رہے تھے۔ طنز یہ جملے کس رہے تھے۔ ان کی بے بسی کا مذاق اڑا رہے تھے لیکن آج یہ سارا شہر سوگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بازار کی زیادہ تر دکانیں بند تھیں اور سڑکوں پر خاک اڑ رہی تھی۔

ان قیدیوں نے دمشق میں سارا عرصہ قید خانے میں گزارا تھا لیکن ان کی بہادری، جرات اور حق گوئی وبیباکی نے دمشق میں ایک خاموش انقلاب برپا کر دیا تھا اور اس کا ثبوت ان قیدیوں کی مدینے روانگی کے وقت دیکھنے والوں کو صاف نظر آ رہا تھا کہ آج دمشق سے روانگی کے وقت سارا شہر درد و غم کی تصویر بنا ہوا تھا۔

بہت سارے اونٹ ایک قطار میں بٹھائے گئے۔ ہر اونٹ کے اوپر ایک سیاہ عماری بندھی ہوئی تھی۔ راستے کے دونوں جانب آج بھی بے پناہ ہجوم تھا لیکن آج تماشائی چپ چاپ خاموش تھے، مردوں کے سر جھکے ہوئے تھے، عورتیں دم سادھے کھڑی تھیں۔

قیدی خواتین اور بچوں نے اونٹوں پر بیٹھنا شروع کیا تو دیکھنے والوں کو اپنے دل حلق میں آتے محسوس ہونے لگے۔ عورتوں نے اپنے پلوؤں سے اپنا منہ چھپا کر رونا شروع کر دیا تھا۔

سواری کے اونٹ ایک ایک کر کے کھڑے ہونے لگے اور قافلہ روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔ اس قافلے کو ایک فوجی دستے نے حفاظت میں لے رکھا تھا۔ بشیر ابن جزلم سپاہیوں کے اس دستے کا سردار تھا۔

جناب زینبؑ نے اپنے بھتیجے علی ابن الحسینؑ سے کہہ دیا تھا کہ میں مدینے جانے سے پہلے میں ایک مرتبہ اپنے بھائی کی قبر پر ضرور جاؤں گی۔ اس لئے مدینے جانے کے لیے ایسا راستہ اختیار کیا جائے جو کربلا سے گزر کر مدینے کی طرف جاتا ہو۔

☆☆☆

کربلا کے سانحے کو ایک سال گزر چکا تھا۔ سن باسٹھ ہجری کے ماہ صفر کی بیس تاریخ تھی جب دن کے وقت یہ قافلہ کوفے سے نکل کر کربلائے معلیٰ کے قریب پہنچ رہا تھا۔ دریائے فرات کے کنارے قبروں کے نشان دور ہی سے دکھائی دینے لگے تھے۔

امام سید سجادؑ نے دور سے کربلا کے میدان میں بکھری ہوئی قبروں کو دیکھا تو ان کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور آپؑ بے اختیار رونے لگے۔

قافلے کی رفتار آہستہ ہوئی تو عماریوں میں بیٹھی ہوئی خواتین نے عماریوں کے پردے اٹھا کر باہر جھانکا۔ دریائے فرات کے کنارے انہیں بہت سی قبریں بنی ہوئی دکھائی دیں۔ ان قبروں کو دیکھ کر جناب زینبؑ، جناب ام کلثومؑ، جناب ام لیلیٰ، جناب رباب، جناب فضہ اور دوسری خواتین نے ماتم شروع کر دیا۔ بچے زور زور سے رونے لگے۔

قافلے کے اونٹ ابھی پوری طرح بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ اہل بیت رسولؐ کی ان خواتین اور بچوں نے عماریوں سے اترنا شروع کر دیا۔ یزیدی لشکر کا حفاظتی دستہ سواری

کے اونٹوں سے دور دریائے فرات کے کنارے کی طرف چلا گیا تھا۔ حضرت علی ابن الحسینؑ نے تمام خواتین اور بچوں کو سنبھالا اور ایک نشیب کی طرف اشارہ کر کے بہ آواز بلند کہا:

"السلام علیک یا ابا عبد اللہ" "السلام علیک یا بن رسول اللہ" "السلام علیک یا بن علی المرتضیٰ" "السلام علیک یا بن فاطمہ الزہراؑ"

ان الفاظ کے ساتھ ہی میدان کربلا آہوں اور سسکیوں سے لرز اٹھا۔

حضرت علی ابن الحسینؑ اہل حرم کو ساتھ لے کر نشیب میں بنی ہوئی قبر کی طرف بڑھے۔ قبر کے قریب صحابی رسولؐ حضرت جابر ابن عبداللہ انصاریؓ موجود تھے۔ جناب جابرؓ نابینا ہو چکے تھے اور اپنے ایک غلام کے ساتھ شہیدان کربلا کے دوسرے چہلم کے موقع پر قبر مبارک کی زیارت کرنے کوفے سے کربلا آئے تھے۔ ان کے غلام نے انہیں بتایا کہ حسین ابن علیؑ کے بیٹے علی ابن الحسینؑ خواتین اور بچوں کے قافلے کے ساتھ اپنے بابا کی زیارت کے لیے آئے ہیں۔

حضرت جابر بن عبد اللہ انصاریؓ نے یہ سنا تو بے اختیار اپنا سر پیٹنے لگے۔ انہوں نے چیخیں مار کر رونا شروع کر دیا۔ حضرت علی ابن الحسینؑ نے آگے بڑھ کر انہیں گلے سے لگا لیا۔ "ہمارے جدؐ کے محترم صحابی! آپ کا نام دنیا و آخرت میں ہمیشہ نمایاں رہے گا۔ آپ میرے بابا کی زیارت کے لئے آنے والے پہلے مسلمان اور کربلا کے پہلے زائر ہیں۔" حضرت علی ابن الحسینؑ نے روتے روتے بہ مشکل کہا۔ یہ کہتے کہتے آپ کی ہچکیاں بندھ گئیں اور آپ جابر بن عبداللہؓ کو سینے سے لگائے پھوٹ پھوٹ کر

رونے لگے۔

روتے روتے آپؑ نے میدان کے ایک کنارے سے بہت سے لوگوں کی رونے کی آوازوں کو سنا تو آپ اس طرف متوجہ ہو گئے۔

جابر بن عبداللہ انصاریؓ نے اپنے غلام سے کہا۔ ''میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے یہاں سے دور لے چلو تاکہ حسین علیہ السلام کی بہنیں جی بھر کے اپنے بھائی کا ماتم کر سکیں۔'' ان کے غلام نے سر جھکائے جھکائے ان کا ہاتھ تھاما اور انہیں میدان کربلا کے دوسرے حصے کی طرف لے کر چلا گیا۔

بنی اسد کا قبیلہ قریب ہی آباد تھا۔ بے گور و کفن لاشوں کی تدفین اسی قبیلے نے کی تھی۔ انہوں نے قافلے کو آتے دیکھ لیا تھا مگر وہ یزیدی فوجیوں کو دیکھ کر خوف کے مارے گھروں سے نہیں نکلے تھے لیکن جب انہوں نے قبروں کے گرد رونے اور ماتم کرنے کی آوازیں سنیں اور فوجی دستے کو دریائے فرات کے کنارے کی طرف جاتے دیکھا تو انہیں یقین ہو گیا کہ یزیدی فوجی انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

امام سید سجادؑ کے قافلے میں شریک خواتین اور بچے اپنے اپنے سرپرستوں کی قبروں کو گھیرے ہوئے ماتم کر رہے تھے کہ اچانک کربلا کا میدان ''یا حسینؑ یا حسینؑ'' کی درد بھری آوازوں سے گونجنے لگا۔ یہ قبیلہ بنی اسد کے مرد 'عورتیں اور بچے تھے جو پھاوڑے، بیلچے اور پانی کے مشکیزے اٹھائے اس طرف چلے آ رہے تھے۔

قیدیوں کا یہ قافلہ در حقیقت دین اسلام کو بچانے والے خدائی لشکر کا ایک حصہ تھا۔ اسی لشکر کے ہراول دستے نے کربلا میں شیطان کو شکست سے دوچار کیا تھا۔

باب۔ ۲۴

آنسوؤں کا ایک سیلاب تھا کہ امنڈا چلا آ رہا تھا۔ رونے والوں کی آنکھوں میں اپنے پیاروں کی تصویریں گھوم رہی تھیں۔ یہی جگہ تھی جہاں ایک سال پہلے حسین علیہ السلام اپنے رشتے داروں اور دوستوں کے ساتھ آئے تھے۔ ایک سال پہلے وہ اسی جگہ اپنے چاہنے والوں کے ساتھ چلتے پھرتے، ساتھیوں سے مشورہ کرتے یا عبادت میں مصروف نظر آتے تھے۔ اسی میدان میں کبھی اہل بیتؑ کے خیمے نصب ہوئے تھے جنھیں یزیدی فوجیوں نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔

اس وقت بھوک پیاس تھی، قتل و غارت گری کا خطرہ تھا، وطن سے دوری کا جاں گسل صدمہ تھا لیکن اس وقت عورتوں اور بچوں کو بڑی ڈھارس تھی۔ ان کے باپ بھائی، شوہر، بیٹے، بھتیجے سب زندہ تھے لیکن آج وہ سارے بہادر اللہ کی راہ میں اپنے لہو کا آخری قطرہ تک بہا کر قتل گاہ کی مٹی میں جا سوئے تھے۔ صحرا کی تیز ہوا غریب الوطن شہیدوں کی قبروں کو چومتی ہوئی گزر رہی تھی۔ ہوا کے جھونکوں میں سسکیوں کی آوازیں محسوس ہوتی تھیں۔

ایسے میں جب قبیلہ بنی اسد کے مرد، عورتیں اور بچے ماتم کرتے ہوئے ادھر آئے تو میدان کربلا رونے اور چیخنے کی آوازوں سے گونجنے لگا۔ بنی اسد کے مردوں،

عورتوں اور بچوں نے اپنے کاندھوں پر بیلچے اور پھاوڑے اٹھا رکھے تھے۔ماتم کرتے کرتے وہ بے اختیار ہو کر میدان کربلا کی مٹی اپنے سروں میں ڈال رہے تھے۔ان میں سے کئی عورتوں اور بچوں نے اپنے کاندھوں پر پانی سے بھرے مشکیزے اٹھا رکھے تھے۔وہ ان مشکیزوں کے منہ کھول کر شہیدوں کی قبروں پر پانی کا چھڑکاؤ کرتے کرتے چیخیں مار مار کر رو رہے تھے۔

امام زین العابدینؑ، حضرت علی ابن الحسینؑ کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔اپنی آہوں اور سسکیوں کو روکنے کی کوشش میں آپ کا پورا بدن کپکپانے لگا۔وہ سوچ رہے تھے کہ آج پانی کتنا ارزاں ہو گیا کل اسی پانی کے مانگنے پر پھول جیسے بچے کو خون میں نہلا دیا گیا تھا!

ان کے ذہن میں چند ماہ کے معصوم علی اصغرؑ کا تصور ابھرا۔آنسوؤں سے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے انہوں نے اپنے عظیم المرتبت باپ کی قبر کو دیکھا جہاں ان کی پھوپھیاں سر جھکائے بیٹھی تھیں اور سسک سسک کر روئے جا رہی تھیں۔حضرت علی اصغرؑ کی والدہ ام رباب کی آنکھوں کے تو آنسو ہی خشک ہو چکے تھے۔وہ خاموش بیٹھی خالی خالی آنکھوں سے اپنے وارث کی قبر کو تکے جا رہی تھیں۔

☆☆☆

خاندان رسالتؐ کے یتیموں اور بیواؤں کا یہ قافلہ کربلا میں کئی دن ٹھہرا رہا۔آخر قافلے کے سالار امام سید الساجدینؑ نے اپنی پھوپھیوں کو بڑی مشکل سے مدینے چلنے کے لیے راضی کیا۔ایک شام اس قافلے نے شہیدوں کی قبروں کو آخری مرتبہ سلام کیا اور اپنے سینے میں کبھی نہ بھرنے والے زخم لیے مدینے کی طرف سفر شروع کر دیا۔

مدینہ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ صفر کی آخری تاریخوں میں یہ لٹا ہوا قافلہ مدینے کے قریب پہنچ گیا۔ اس روز جمعے کا دن تھا۔

امام زین العابدین کو مدینے کے آثار نظر آنا شروع ہوئے تو آپ کا دل بھر آیا۔ مدینہ تو ماں کی گود کی طرح تھا۔ ان کے جد رسول اسلام کا روضہ مبارک اسی شہر میں تھا۔ اسی شہر میں ان کی دادی فاطمہ زہرا کی قبر موجود تھی اس شہر میں ان کے چچا حسن آسودۂ خاک تھے۔ اسی شہر سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ان کے والد سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ اپنے وقت کی سب سے بڑی شیطانی حکومت کا مقابلہ کرنے نکلے تھے۔

ان کا مدینے سے نکلنا اس لئے نہیں تھا کہ وہ حکومت و اقتدار حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہ دنیا اور اس دنیا کا مال و دولت ان کی جوتی کے تلے میں چپکی ہوئی مٹی سے بھی زیادہ حقیر تھا۔ ان کے والد اصل اسلام کی تعلیمات رسول اسلام کی سیرت اور قرآن کے احکامات کو بچانے کے لیے اس شہر سے نکلے تھے۔ اسلام کے دشمنوں نے اسلام کی نقاب پہن رکھی تھی۔ عام مسلمان انہیں اسلام کا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھتے تھے۔ حضرت امام حسین مسلمانوں کو ان کے دشمن کا اصل چہرہ دکھانے کے لیے گھر سے نکلے تھے ان کے مشن کی کامیابی کے آثار ساری اسلامی دنیا میں نظر آنا شروع ہوئے تھے۔

مدینے کے قریب پہنچنے والا یہ لٹا پٹا قافلہ بظاہر دردوغم میں ڈوبے ہوئے یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کا قافلہ تھا لیکن درحقیقت یہ قافلہ دین اسلام کو بچانے والے خدائی لشکر کا ایک حصہ تھا۔ اسی خدائی لشکر کے ہراول دستے نے میدان کربلا میں شیطان کے

لشکر سے مقابلہ کر کے قیامت تک کے لیے مظلوم انسانوں کو یہ سبق سکھادیا تھا کہ عزت کی موت، ذلت کی زندگی سے بہتر ہے۔ کسی بھی جنگ میں کامیابی کا اندازہ ظاہری فتح سے نہیں لگانا چاہئیے۔ کامیابی یا ناکامی کا اندازہ نتائج سے کیا جا سکتا ہے۔

شیطانی حکومت سے اس جنگ میں اللہ کا نمایندہ بظاہر ہار گیا تھا۔ یزیدی حکومت ابھی تک اسی طرح قائم تھی لیکن حسین علیہ السلام کی قربانی کے رد عمل میں سارے ملک میں زیر زمین زلزلوں کی لہریں اٹھنا شروع ہو چکی تھیں۔ کربلا' کوفہ' قادسیہ' تکریت' لبنا' جہینہ' موصل' حلب قنسرین' حران' شیزر' کفر طاب' حماۃ' حمص اور ملک کے دوسرے شہروں اور قصبوں میں عیسائی مسلمان ہورہے تھے' مسلمان بیدار ہو رہے تھے۔ مختلف قبیلے' افراد اور گروہ ایک دوسرے سے مل کر اپنی طاقت جمع کر رہے تھے۔ ہر جگہ ہر مقام پر نوجوان یہی کہتے نظر آتے تھے کہ جب حسین علیہ السلام اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ اتنی بڑی حکومت سے ٹکرا سکتے ہیں تو ہم اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود ایسا کیوں نہیں کر سکتے! بزرگ حضرات انھیں مرنے سے ڈراتے تو وہ ایک ہی جواب دیتے۔ ''ہم مرنے سے نہیں ڈرتے۔ ہمارا کام اللہ کے حکم کے مطابق اسلام کے دشمنوں سے جنگ کرنا ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا اس کی ہمیں پرواہ نہیں۔ ہم اپنے حصے کا چراغ ضرور جلائیں گے چاہے اس کی روشنی کفر کے بہت کم اندھیرے ہی کو دور کر سکے۔''

یہ ذہنی انقلاب حسین علیہ السلام کی عظیم قربانی کا نتیجہ تھا۔ ان کے مقدس خون نے ظلم کے خلاف جنگ کرنے والوں کو لافانی طاقت عطا کر دی تھی۔ حسین علیہ السلام کربلا کی سر زمین پر محو خواب تھے لیکن انھوں نے مظلوم انسانوں کو شیطانی

لشکروں سے قیامت تک جنگ کرتے رہنے کی کبھی نہ ختم ہونے والی بے پناہ توانائی اور قوت سے مالامال کر دیا تھا۔ یہی حسین علیہ السلام کی ابدی فتح تھی اور یزید ہی نہیں، قیامت تک پیدا ہونے والے تمام یزیدوں کی ابدی شکست بھی۔

قافلہ حسینؑ کے یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کے اس خدائی لشکر کے قافلہ سالار امام وقت حضرت علی ابن الحسینؑ تھے۔ وہی اس وقت امام وقتؑ تھے۔ مستقبل کا کوئی لمحہ ان کی نگاہوں سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ بنی امیہ کے تاج و تخت کو ہمیشہ کے لیے فنا کر دینے والی میدان کربلا سے اٹھتی ہوئی سرخ آندھی انہیں صاف نظر آ رہی تھی۔

لیکن امام سجادؑ صرف امام وقت ہی نہیں تھے ایک انسان بھی تھے، وہ باپ بھی تھے اور کسی کے یتیم بیٹے بھی۔ وہ بے دردی سے قتل کیے جانے والے بھائیوں اور کربلا سے شام تک رسیوں میں بندھی ہوئی ماؤں، پھوپیوں اور بہنوں کے بیٹے بھتیجے اور بھائی بھی تھے۔ خود ان کی گردن کے طوق، پیروں کی بیڑیوں اور ہاتھوں کی ہتھکڑیوں کے زخم ابھی بھرے نہیں تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے عزیزوں کی جدائی ان کے دل کا کبھی نہ بھرنے والا زخم بن گئی تھی۔

٭٭٭

مدینے کے باہر کھجوروں کے باغات امام علیہ السلام کو دور سے دکھائی دیے تو آپ نے قافلے کے نگران بشیر ابن جذلم کو ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ بشیر ابن جذلم نے اپنے گھوڑے کی باگیں موڑیں اور امام علیہ السلام کے اونٹ کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی سارا قافلہ ٹھہرتا چلا گیا۔

حضرت علی ابن الحسین اپنے اونٹ کو زمین پر بٹھا رہے تھے۔ بشیر ابن جذلم آپ

کے قریب آیا تو آپ نے اس سے کہا۔ "مدینے میں داخل ہونے سے پہلے ہم کچھ دیر یہیں ٹھہریں گے۔"

"جیسے آپ کا حکم۔" بشیر نے سر جھکا کر جواب دیا اور قافلے کے محافظ دستے کو مختلف احکامات جاری کرنے لگا۔ ان احکامات کو سن کر یزیدی سپاہی قافلے سے دور ہٹ گئے۔ غلاموں نے اونٹوں پر سے چند خیمے اور قناتیں اتاریں اور انہیں زمین پر لگانے میں مصروف ہو گئے۔

جناب زینبؑ اور بی بی ام کلثومؑ نے عماریوں کے پردے اٹھا کر باہر دیکھا۔ مدینے کے نواحی علاقے کو دیکھ کر ان کے دل پھٹنے لگے مدینے کی یہی زمینیں تو تھیں جہاں ان کے بابا علی ابن ابی طالبؑ محنت مشقت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنوں اور غیروں کو آب رسانی، شجر کاری اور کھیتی باڑی کے نت نئے طریقے سکھایا کرتے تھے

حضرت علی ابن الحسینؑ نے اپنی ماں جیسی پھوپھیوں کو روتے دیکھا تو جناب زینبؑ کے قریب پہنچ کر کہا۔ "پھوپھی اماں! ہم اپنے گھر لوٹ آئے ہیں۔۔۔" جناب سید سجادؑ کی آواز شدت غم سے بھرائی ہوئی تھی۔ "پھوپھی اماں! آپ عالمہ غیر معلّمہ ہیں۔ آپ سے بس ایک درخواست کروں گا۔۔ آپ کے دل پر جو گزر رہی ہے میں اس کا اندازہ کر سکتا ہوں لیکن پھر بھی ضبط سے کام لیجئے گا۔" امام نے اپنی آنکھوں پر رومال رکھتے ہوئے کہا اور مزید کچھ کہے بغیر بشیر ابن جذلم کی طرف چلے گئے جو خیموں کے اندر فرش بچھوا رہا تھا۔

"بشیر! تمہارا باپ شاعر تھا نا! کیا تم بھی شعر کہتے ہو؟" آپؑ نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"آپ کی دعا سے اکثر میں بھی اشعار کہہ لیتا ہوں۔" بشیر نے جواب دیا۔

"اچھا تو پھر جاؤ اور اپنے اشعار کے ذریعے مدینے والوں کو ہمارے اس لٹے ہوئے قافلے کی آمد کے بارے میں جا کر بتاؤ۔" امام نے رومال سے اپنی آنکھوں کو پونچھا۔

امام علیہ السلام کی یہ بات سن کر بشیر ابن جذلم کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے اپنی آستین سے اپنے آنسوؤں کو صاف کیا اور مزید کچھ کہے بغیر ایک گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ پھر اس نے گھوڑے کو ایڑی لگائی اور مدینے کی گلیوں تک جا پہنچا۔

اس کے گھوڑوں کی ٹاپوں نے راہ گیروں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ روضہ رسولؐ کے قریب پہنچ کر بشیر نے اپنے گھوڑے کو ٹھہرایا اور چیخ چیخ کر اپنے اشعار پڑھنے لگا۔

اے یثرب والو! سکون سے بیٹھے کیا کر رہے ہو؟

حسین ابن علیؑ شہید کر دیے گئے۔ اٹھو اور آنسو بہاؤ!

حسین کا جسم کربلا میں خون آلود پڑا ہے

اور ان کے سر مبارک کو نیزے پر بلند کر کے شہر شہر گھمایا گیا ہے۔

حسین کا بیٹا اپنی پھوپھیوں ، ماؤں ، بہنوں اور بیواؤں کے ساتھ شہر سے باہر ٹھہرا ہوا ہے۔

میں اسی کی طرف سے تمھیں اس کے آنے کی خبر دینے آیا ہوں۔"

بشیر اپنے اشعار پڑھتا جارہا تھا اور اس کی آنکھوں سے لگا تار آنسو بہے جا رہے تھے۔ اس کی آواز کچھ دیر اسی طرح گونجتی رہی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے بازار بند ہونے لگے، گھروں کے دروازے کھلنے لگے اور بشیر کے ارد گرد کا سارا راستہ عورتوں بچوں اور مردوں سے بھر گیا۔ عورتیں ماتم کر رہی تھیں مرد چیخیں مار رہے تھے اور بچے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

ہر طرف ایک کہرام برپا تھا۔ بشیر ابن جذلم کی آواز "ہائے حسینؑ ---ہائے حسینؑ" کی درد بھری آوازوں میں دب کر رہ گئی تھی۔ اسی ہجوم میں کسی نے بشیر ابن جذلم کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر کھینچی تو بشیر نے نیچے دیکھا۔ یہ ایک چھوٹی سی بچی تھی۔ "اے حسین علیہ السلام کی سنائی سنانے والے تو نے ان کی شہادت کی خبر سنا کر ہمارے غموں کو تازہ کر دیا ہے۔ میری آنکھیں فرزند رسولؐ اور اللہ کے ولیؑ کے بیٹے پر آنسو بہا رہی ہیں جو اپنے گھر اور خاندان سے بہت دور غربت کے عالم میں قتل کر دیا گیا۔"

بچی کی باتیں سن کر بشیر کا دل کٹ کر رہ گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ بچی حسین ابن علیؑ کے قریبی رشتے داروں میں سے ہے۔ اس نے بچی کو پرسہ دیا تو بچی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر اس نے روتے روتے سر اٹھایا۔ "اللہ تم پر رحم کرے۔ تم ہو کون؟" بچی نے پوچھا۔

"میں بشیر ابن جذلم ہوں۔ میں کربلا کے مظلوم قیدیوں کے قافلے کو مدینے تک پہنچانے آیا ہوں۔" بشیر نے جواب دیا۔

بچی اس کی بات سن کر روتی ہوئی ہجوم میں گم ہو گئی۔ بشیر نے اپنے گھوڑے کی باگیں اٹھائیں اور روضۂ رسولؐ کی طرف بڑھنے لگا۔

بیعت کی اور پھر خود تم ہی نے مسلم بن عقیل کو شہید کر دیا۔ تمہارا
انجام برا ہو کہ تم نے تو اپنے ہاتھوں سے دنیا و آخرت کی رسوائی
خرید لی ہے قیامت کے دن آخر تم کس طرح اللہ کے رسول کو منہ
دکھا سکو گے جب کہ تم ان کی اولاد کے قاتل ہو!
اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو (اور اس سلسلے میں کسی غلط فہمی یا
خوش فہمی میں نہ رہنا) رسول اللہ قیامت کے دن تم سے
ضرور یہی کہیں گے کہ تم لوگوں نے میرے اہل بیت کو قتل کیا،
میرے گھر کی عورتوں کو بے پردہ کیا، میرے بچوں کو قیدی بنایا۔
(تمہارا یہ جرم قابل معافی نہیں) اس لئے تم میری امت میں سے
ہرگز نہیں ہو۔"

اتنا کہنے کے بعد حضرت علی ابن الحسین خاموش ہو گئے۔ مرد، عورتیں اور بچے آنسو بہاتی آنکھوں سے ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے اور چیخیں مار مار کر رو رہے تھے۔ بے شمار لوگ مجمع کو چیرتے ہوئے امام زین العابدین کے اونٹ کی جانب بڑھنے لگے۔ عورتوں نے اپنے سروں سے چادریں اور مردوں نے اپنے عمامے اتار اتار کر خاندان رسول کی قیدی عورتوں کی طرف پھینکنا شروع کر دیے۔

اچانک قافلے کی حفاظت کرنے والے یزیدی فوجیوں کو ہوش آ گیا۔ انھوں نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور ننگی تلواریں ہوا میں لہراتے ہوئے مجمع کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکانے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مجمع کائی کی طرح چھٹنے لگا۔ عورتوں اور مردوں نے اپنے اپنے بچوں کے ہاتھ پکڑے اور بدحواسی کے عالم میں ادھر ادھر بھاگنے لگے۔

اچانک گھوڑوں کی ٹاپوں سے راستہ گونجنے لگا۔ دارلامارہ کی طرف سے ابن زیاد کی فوج کا خصوصی دستہ اس طرف آرہا تھا۔ قافلے کی حفاظت کرنے والے فوجیوں اور نیزوں پر شہیدوں کے سروں کو اٹھانے والے گھڑ سوار دوبارہ ترتیب کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ وہ سمجھ گئے کہ حاکم کوفہ عبیداللہ ابن زیاد کا دربار سج چکا ہے اور یہ خصوصی دستہ قافلے کو لینے کے لئے ادھر آرہا ہے۔

☆☆☆

دارالامارہ کی عمارت پر نیا رنگ و روغن کیا گیا تھا۔ راہداریوں اور دروازوں پر رنگ برنگے کپڑے لہرا رہے تھے۔ سرکاری حکام اور فوجی افسروں نے خوش رنگ لباس پہن رکھے تھے۔ دربار کے غلام مخصوص وردیوں میں ملبوس تھے۔ ان کی کمر پر سنہری پٹکے بندھے ہوئے تھے۔ دربار میں داخلے کے دروازے کی دونوں طرف ننگی تلواریں لیے ہوئے فوجی مستعد کھڑے تھے۔ قافلے کی ساری گزرگاہ پر جگہ جگہ نقارے، دف اور ڈھول بجائے جارہے تھے۔

ابن زیاد کی فوج کے خصوصی دستے کے گھڑ سوار دارالامارہ کے اندر داخل ہونا شروع ہوئے۔ ان کے سجے سجائے گھوڑوں کے پیچھے ان فوجیوں کا دستہ تھا جو کربلا سے کوفے تک شہداءؑ کے سروں کو نیزوں پر بلند کرکے یہاں لائے تھے۔ یہ فوجی اب پیدل چل رہے تھے۔ شہداءؑ کے سروں کو انھوں نے نیزوں پر بلند کر رکھا تھا۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سمارہے تھے اور بار بار نعرہ تکبیر بلند کر رہے تھے۔

ان وحشی درندوں کے بعد قیدی عورتوں اور بچوں کی قطار تھی۔ ان سب قیدیوں کو اب اونٹوں سے اتار کر ایک لمبی رسی میں باندھ دیا گیا تھا۔ قیدیوں میں سب سے آگے

حضرت علی ابن الحسینؑ تھے جو گردن جھکائے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ اگر آپ سیدھے ہو کر چلتے تو کئی معصوم بچے جن کی گردنیں رسی سے بندھی ہوئی تھیں ہوا میں معلق ہو جاتے۔ یہی حال حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی بیٹیوں اور بہوؤں کا تھا۔ یہ عظیم المرتبت خواتین بھی اسی طرح گردن جھکائے آگے قدم بڑھا رہی تھیں۔

یہ سارے انتظامات یزید کے گورنر عبید اللہ ابن زیاد کے حکم پر کئے گئے تھے۔ اس کا مقصد تھا کہ رسول اسلامؐ کے خاندان کو عوام کے سامنے اس قدر ذلیل و رسوا کیا جائے کہ لوگ ان کی طرف سے مایوس اور بدظن ہو جائیں۔ لوگ یہ سوچنے لگیں کہ رسول اللہؐ تو خود کو اللہ کا حبیب اور دوست کہتے تھے۔ اگر وہ اللہ کے دوست ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان کے خاندان کو اس طرح ذلیل و رسوا کیوں کرتا؟

کچھ دوسرے لوگ اس طرح سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ رسول اللہؐ نے بتایا تھا کہ زمین و آسمان کے لشکر اللہ کے ہیں۔ پھر اس وقت اللہ کے لشکر کہاں گئے کہ اس کے حبیب محمد مصطفیٰؐ کے گھر کی عورتیں بے پردہ اور رسیوں میں بندھی ہوئی ہیں۔ لوگ ان کا مذاق اڑا رہے ہیں لیکن اللہ کے لشکر حرکت میں نہیں آتے۔ شاید محمدؐ کا یہ دین ان کا خود کا بنایا ہوا کوئی ڈراما ہے۔ اگر ان کا ناتا خدا سے ہوتا تو اس وقت زمین پھٹ جاتی، آسمان سے آگ برستی اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتے۔

یزید اور اس کی حکومت کا مقصد کسی نہ کسی طرح دین اسلام کو بدنام کرنا تھا۔ بنوامیہ کی اصل دشمنی دین اسلام سے تھی جس کی آمد کی وجہ سے عربوں پر ان کے خاندان کی سرداری ختم ہو گئی تھی۔ اسلام کے بعد ان کی سب سے زیادہ دشمنی علی ابن ابی طالبؑ کے خاندان سے تھی جنھوں نے اپنی مستقل مزاجی، بہادری اور انتھک

قربانیوں کے ذریعے دشمنان اسلام کی ہر سازش کا مقابلہ کیا تھا۔ اس خاندان نے اپنی جانوں کی قربانی پیش کر کے کفر و شرک کے ہر حملے کو ناکام بنایا تھا۔ علی ابن ابی طالبؑ اس خاندان کے سربراہ تھے اور انہوں نے اپنی خداداد طاقت کے ذریعے یزید کے بہت سے بزرگوں کو مختلف جنگوں میں تلوار سے زیر کیا تھا۔ علی ابن ابی طالبؑ کی تلوار سے مرنے والے وہی مغرور انسان تھے جنہوں نے اللہ سے مقابلہ کرنا چاہا تھا اور جو شخص اللہ سے مقابلہ کرتا ہے اس کا ٹھکانہ جہنم کے علاوہ کہیں اور نہیں ہوتا۔

قیدیوں کو اب عبید اللہ ابن زیاد کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا۔ عبید اللہ ابن زیاد کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔ وہ غرور و تکبر کا مجسمہ بنا ہوا ایک اونچی کرسی پر بیٹھا تھا۔

سب سے پہلے شمر ذی الجوشن آگے بڑھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چاندی کی ایک تھالی پکڑ رکھی تھی۔ اس تھالی میں حضرت امام حسین ابن علیؑ کا کٹا ہوا سر رکھا تھا۔ اس کے پیچھے اٹھارہ فوجی تھے جنہوں نے خاندانِ رسولؐ کے اٹھارہ شہیدوں کے سروں کو نیزوں پر اٹھا رکھا تھا۔ شمر ذی الجوشن نے آگے بڑھ کر امام حسینؑ کا سر ابن زیاد کے سامنے پیش کرنا چاہا۔

"نہیں ایسے نہیں۔" ابن زیاد نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ شمر ذی الجوشن اپنی جگہ ٹھہر گیا۔ "تم نے حسینؑ کے سر کو چاندی کی تھالی میں کیوں رکھا؟ حسین کے نانا نے ہم مردوں پر سونے کا استعمال حرام کیا تھا اس لئے آج حسینؑ کے سر کو سونے کی تھالی میں رکھ کر ہمارے سامنے پیش کرو۔" ابن زیاد وحشیوں کی طرح ہنسنے لگا۔

اسی وقت ایک غلام باہر گیا اور سونے کی تھالی لے کر آ گیا۔ شمر نے امام مظلوم کے سر کو تھالی میں رکھ کر ابن زیاد کے سامنے پیش کیا۔ ابن زیاد نے تھالی کو پکڑا اور

بڑی بے پروائی کے ساتھ اسے ایک طرف رکھ دیا۔ پھر اس نے قیدی عورتوں اور بچوں کی قطار پر نظر دوڑائی۔ خاندان رسولؐ کی محترم خواتین کے چہروں کو ان کے بالوں نے چھپا رکھا تھا۔

"یہ عورت کون ہے؟" ابن زیاد نے ایک دراز قد خاتون کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ زینبؑ ہے۔ رسولؐ کی نواسی، فاطمہ زہراؑ کی بیٹی، حسینؑ کی بہن۔" ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر بڑے فخر سے بتایا۔ وہ جانتا تھا کہ ابن زیاد رسول اسلامؐ سے کس قدر شدید نفرت کرتا ہے۔

ابن زیاد کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے جناب زینبؑ کو مخاطب کیا۔ "اس اللہ کی حمد جس نے تمہیں ذلیل کیا اور تمہارے مردوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور تمہارے بزرگوں نے نئے دین کے ذریعے جو بدعتیں پیدا کی تھیں اللہ نے انہیں غلط ثابت کر دیا۔" اس نے اپنے گلے میں پڑی ہوئی سونے کی زنجیر کو مروڑتے ہوئے کہا۔

جناب زینبؑ کی گردن رسی سے کسا اور چھوٹے بچوں کے وزن سے جھکی ہوئی تھی لیکن آپؑ کا صبر، برداشت، اللہ رب العالمین سے آپ کی محبت، اپنے مذہب پر ان کا بھروسہ اور اعتماد قابل دید تھا۔ آپ نے یزید کی زہریلی باتوں کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی، نبی کریمؐ پر درود پڑھا اور ابن زیاد سے کہا

"یہ اللہ کا احسان ہے ہم اہل بیتؑ پر۔ اس نے اپنے آخری پیغمبر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وجہ سے ہمیں عزت و حرمت عطا فرمائی اور ہمیں اسی طرح پاک رکھا جس طرح پاک

رکھنے کا حق ہے۔ اور یہ جو تو ہماری رسوائی کی بات کر رہا ہے تو کان
کھول کر سن لے کہ رسوا اور ذلیل وہ لوگ ہوتے ہیں جو تیری
طرح بدکردار ہوں اور جھوٹ وہ لوگ بولتے ہیں جو تیری طرح
گناہ کبیرہ کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہوں۔ اللہ کا احسان ہے کہ ایسے
لوگ ہمارے دشمن ہی ہیں۔"

جناب زینبؑ کے یہ جملے ابن زیاد پر بجلی کے کوندے کی طرح گرے تھے۔ سچ کی تلوار کا یہ پہلا وار تھا جس نے ابن زیاد کے مسکراتے چہرے کو بھرپور طریقے پر مسخ کر دیا تھا۔ جناب زینبؑ کے آخری جملے نے بھرے دربار میں وہ حقیقت آشکار کر دی تھی جسے ابنِ زیاد خود اپنے سے بھی چھپانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے دل میں غصے کا الاؤ بھڑکنے لگا تھا لیکن اس نے اپنی ذلت اور شرمندگی کو اپنی مسکراہٹ میں چھپاتے ہوئے کہا۔ "اگر اللہ اہل بیتؑ سے محبت کرتا ہے تو تمہارے اہل بیتؑ کے ساتھ اس نے کیا سلوک کیا؟" اس نے طنز آمیز لہجے میں پوچھا۔

حضرت زینب بنت علیؑ کے چہرۂ مبارک پر یقین و اعتماد کا نور پھیلا ہوا تھا۔

"اہل بیتؑ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟" آپؑ نے اسی کا جملہ دہرایا۔

"میرے مہربان مالک نے میرے اہل بیتؑ کے ساتھ وہی سلوک
کیا جو اس کی رحمت اور اہل بیتؑ کی عظمت کے شایان شان تھا۔
اس نے اہل بیتؑ کو شہادت جیسے عظیم مرتبے پر فائز کیا اور تو کیا
جانے کہ شہادت کسے کہتے ہیں لیکن بہت جلد میرا مہربان مالک
تجھے اور اہل بیتؑ کو (میدان حشر میں) جمع کرے گا۔ وہ اپنا دعویٰ

دائر کریں گے اور اللہ سے انصاف طلب کریں گے۔ اس دن دیکھ لینا مرجانہ کے بد نصیب بیٹے! کہ کون کامیاب ہوتا ہے اور کون ناکام!"

حضرت زینب بنت علیؑ کے اعتماد نے ابن زیاد کے درباریوں کو لرزا کر رکھ دیا۔

مرجانہ، ابن زیاد کی ماں کا نام تھا جو زیاد کی بیوی تھی لیکن طلوع اسلام سے پہلے ایک رات اس نے دشمن اسلام ابو سفیان کے ساتھ گزاری تھی جس کے نتیجے میں ابن زیاد پیدا ہوا تھا اور اسی حرام کے رشتے کی بنیاد پر یزید کے باپ نے ابن زیاد کو اپنا بھائی بنا لیا تھا۔

اپنی ذلت و رسوائی ابن زیاد کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی تھی، وہ کس طرح برداشت کر سکتا تھا کہ ساری دنیاوی کامیابیوں کے باوجود لوگ اسے ایک کمزور اور ناکام آدمی سمجھیں۔ اس نے غصے سے چلا کر اپنے ایک غلام کو اشارہ کیا۔ "اس عورت کی گردن اڑا دو۔"

غلام کے آگے بڑھنے سے پہلے عمر ابن حریث نامی ایک شخص بے اختیار آگے بڑھا اور اس نے ابن زیاد سے کہا۔ "اے امیر! یہ مجبور و بے کس عورت ہے۔ یہ تیرا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ عورتوں سے اس طرح سختی سے پیش آنا مناسب نہیں۔"

ابن زیاد نے غصے میں یہ حکم تو دے دیا تھا لیکن وہ چاہتا تھا کہ کوئی اسے اس کام سے روکے۔ وہ جانتا تھا کہ خاندان رسالت کے مردوں کے قتل کے بعد رسول اللہ کی نواسی کا قتل اس کے لئے کوئی بڑی مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔ اس نے اپنے غصے کو ضبط کیا اور ہاتھ اٹھا کر اپنے غلام کو روک دیا۔

اسی وقت ابن زیاد کے کانوں میں ایک نوجوان کی آواز آئی۔ ''ابن زیاد! اللہ تیرے ہاتھوں اور پیروں کو کاٹے۔ اے ظالم! تو کب تک آخر بنت زہراؑ کا دل جلاتا رہے گا؟''

ابن زیاد نے گردن گھمائی اور اس نوجوان کی طرف دیکھا جو قیدیوں کے لباس میں ہوتے ہوئے بھی عزم و ہمت کی لازوال تصویر بنا ہوا تھا۔ ''تم کون ہو؟'' ابن زیاد نے غرور بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''میں حسین ابن علیؑ کا بیٹا ہوں۔ علی ابن الحسینؑ!'' امام سجادؑ نے بھرپور اعتماد سے جواب دیا۔

''کیا اللہ نے علی ابن الحسین کو قتل نہیں کیا؟'' ابن زیاد نے حیرت سے اپنے فوجی سرداروں کی طرف دیکھا۔ اس کے فوجیوں نے بتایا تھا کہ ہم نے حسینؑ کے بیٹے علیؑ کو قتل کر دیا ہے۔

''اللہ کی راہ میں شہادت پیش کرنے والے وہ میرے بھائی تھے علی اکبرؑ!'' جناب سجادؑ نے جواب دیا۔ ''میں زندہ ہوں۔ اللہ جب چاہے گا مجھے بھی اس رتبے سے سرفراز فرمائے گا۔''

امام سجادؑ کی آواز میں ایسی تیزی تھی کہ ابن زیاد غصے سے بے قابو ہو گیا۔ ''تجھ میں ابھی تک اتنی جرأت ہے کہ مجھے اس طرح دو ٹوک جواب دے سکے!'' اس نے جھنجلاتے ہوئے کہا اور اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر حکم دیا کہ اس نوجوان کو لے جاؤ اور باہر لے جا کر قتل کر دو۔''

یہ سن کر جناب زینب بنت علیؑ اپنے بھتیجے کے سامنے آ گئیں۔ ''اللہ کے دشمن! اگر اسے قتل کرنا ہے تو پہلے مجھے قتل کر دے۔۔۔!'' حضرت زینبؑ کے لہجے میں

چٹانوں کی سی سختی تھی۔

ابن زیاد نے اپنے جلاد کو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ حضرت علی ابن الحسینؑ نے اپنی پھوپی کو اپنے سامنے سے ہٹایا اور آگے بڑھ ابن زیاد سے مخاطب ہوئے۔ "ابن زیاد! تو مجھے قتل سے ڈرانا چاہتا ہے۔ تجھے ابھی تک یقین نہیں آیا کہ اللہ کی راہ میں قتل ہونا ہماری عادت اور شہادت ہمارے خاندان کا طرۂ امتیاز ہے۔"

ان کی بات سن کر ابن زیاد ایسا بن گیا جیسے اس نے یہ بات سنی ہی نہ ہو۔ "تم میں سے ام کلثوم کون ہے؟" اس نے موضوع بدلا۔

"تو کیا چاہتا ہے؟" جناب ام کلثومؑ نے بھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم سب لوگ جھوٹے ہو۔ تمہارا جد (رسول اسلامؐ) بھی جھوٹا تھا۔ اسی لیے خدا نے تمہیں ذلیل و رسوا کر کے میرے قبضے میں دے دیا۔۔۔"

ابن زیاد نے کھل کر رسول اکرمؐ سے اپنی دشمنی اور نفرت کا اظہار کیا لیکن ابھی اس کا جملہ نامکمل تھا۔ علیؑ کی دو سری تلوار نیام سے باہر آ گئی۔ جناب ام کلثومؑ کے لہجے میں بجلی کی سی کڑک تھی۔ "اے گناہ کی وجہ سے نتیجے میں پیدا ہونے والے اللہ کے دشمن! جھوٹ اور بدکاری جیسے گناہوں کے لئے تیری ہی ذات مخصوص ہے۔ میں تجھے جہنم کی آگ میں جلنے کی خوشخبری سناتی ہوں۔" جناب ام کلثومؑ کے لہجے میں ایسی کاٹ تھی کہ ابن زیاد شرمندگی کے پسینے میں نہا گیا۔

ابن زیاد نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کے درباری سکتے کی سی کیفیت میں تھے۔ اس نے اپنی شرمندگی کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم عورت نہ ہوتیں تو میں تمہیں ابھی قتل کرا دیتا۔"

جناب ام کلثومؑ کو جلال آگیا۔ "تیری ماں پر اللہ کی لعنت ہو جس نے تجھے جنم دیا۔ تو بہت جلد ایسی آگ میں جلے گا جس کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔"

ابن زیاد نے اپنی ندامت چھپانے کے لئے ایک قہقہہ بلند کیا۔ "ارے اب اگر میں جہنم میں چلا بھی گیا تو پروا نہیں۔ میں نے تمہارا خون بہا کر اپنا دل تو ٹھنڈا کر ہی لیا ہے۔"

ابن زیاد سمجھ چکا تھا کہ وہ ان قیدیوں سے کبھی نہیں جیت سکتا جن کی زبانیں علیؑ کی تلوار کی طرح چلتی ہیں تو منافقوں کے چہروں کو بے نقاب کر دیتی ہیں۔ اس نے مزید بحث کرنے کی بجائے اپنے فوجیوں کو حکم دیا کہ قیدیوں کو لے جا کر قید خانے میں بند کر دو اور امیر المؤمنین یزید ابن معاویہ کے دشمنوں کے کٹے ہوئے سروں کو لے جا کر کوفے کے بازاروں میں گھماؤ تاکہ دوسرے لوگوں کو عبرت حاصل ہو اور حکومت سے ٹکر لینے کا خیال ان کے ذہنوں سے نکل جائے۔

نیزوں پر شہیدوں کے سروں کو اٹھانے والے فوجی ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگے۔ ان سپاہیوں کے جانے کے بعد قیدیوں کے نگراں ہاتھوں میں ننگی تلواریں اور کوڑے سنبھالے آگے بڑھے۔ آل محمدؐ کے قیدی عورتوں اور بچوں نے قدم اٹھانا شروع کر دیے۔ قید خانے کے نگراں ان قیدیوں کو ایک ایسے قید خانے کی طرف لے جا رہے تھے جس کی صرف چار دیواری موجود تھی۔ نہ کوئی چھت تھی نہ کہیں سایہ۔ زمین پر کنکر پتھر اور کوڑے کباڑ کے ڈھیر پھیلے ہوئے تھے۔

باب۔۱۰

جناب عبداللہ ابن عفیف صحابی رسولؐ تھے۔ ان کا تعلق بنی ازد نامی قبیلے سے جناب عمار یاسرؓ، جناب اویس قرنیؓ اور دوسرے صحابہ رسولؐ کی طرح جناب عبداللہؓ بھی جنگ صفین میں حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی فوج میں شامل تھے۔ اس جنگ میں جو شامی حکومت کی جانب سے حکومت اسلامی پر مسلط کی گئی تھی جناب عمار یاسرؓ، جناب اویس قرنیؓ اور بہت سے صحابہؓ شامی فوجیوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے تھے۔ اس جنگ میں جناب عبداللہؓ کی آنکھوں پر زخم آئے تھے جن کی وجہ سے آپؓ کی بینائی ختم ہو گئی تھی۔ جنگ صفین کے دوران ایک سوچی سمجھی سازش کے ذریعے مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوادی گئی اور حضرت علی علیہ السلام کے بہت سے فوجی گمراہ ہو کر امیر المومنین کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ بعد میں حضرت علی ابن ابی طالبؑ کو ایک پراسرار سازش کے ذریعے شہید کر دیا گیا۔

ان مایوس کن حالات میں اسلام کے بے شمار سچے جانثار ہمت ہار گئے یا مصلحت کے تحت مختلف مقامات پر بکھر کر خاموشی کی زندگی گزارنے لگے۔ جناب عبداللہ ابن عفیفؓ ایسے ہی افراد میں شامل تھے۔ وہ اب ضعیف ہو چکے تھے۔ بینائی سے

محروم ہونے کے بعد آپؓ کوفے میں گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی اولاد میں صرف ایک بیٹی تھی جو ان کی زندگی کا واحد سہارا تھی۔ ان کا قبیلہ بنی ازد کوفے ہی میں رہتا تھا۔ کوفے میں قیدیوں کی آمد اور جشن فتح میں شرکت کے لئے اس وقت جناب عبداللہؓ اور ان کے قبیلے کے تمام افراد دارالامارہ میں موجود تھے۔

جناب عبداللہؓ کو یہاں آنے سے پہلے معلوم نہیں تھا کہ یہ جشن نواسۂ رسول کو قتل کرنے کی خوشی میں منایا جارہا ہے لیکن دربار ابن زیاد میں جناب زینبؑ، جناب ام کلثوم اور حضرت علی ابن الحسینؑ کی گفتگو سن کر جناب عبداللہؓ کا خون جوش مارنے لگا تھا۔ شاید اللہ تعالیٰ نے انہیں آج کے دن ظالم حاکم کے سامنے کلمہ حق کہنے کے لئے زندہ رکھا تھا۔ ان کی آنکھیں خون کے آنسو بہا رہی تھیں۔

قیدیوں کے جانے کے بعد عبید اللہ ابن زیاد ایک اونچے منبر پر جاکر بیٹھ گیا اور اس نے تقریر کرنا شروع کی تاکہ قیدیوں کی جرأت مندانہ تقریروں کے اثرات کو دور کیا جاسکے۔ "اس اللہ کی حمد ہے جس نے حق اور اہل حق کو غلبہ عطا کیا۔ امیر المؤمنین یزید ابن معاویہ اور ان کے ساتھیوں کو فتح سے ہمکنار کیا اور کذاب ابن کذاب اور اس کے ساتھیوں کو قتل کیا۔۔۔"

ابھی وہ یہیں تک کہہ پایا تھا کہ جناب عبداللہ بن عفیفؓ کو جلال آگیا۔ وہ غصے سے کانپتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے:

"اے دشمن خدا! کذاب (جھوٹا) تو تو ہے اور تیرا وہ باپ (یعنی یزید) جس نے تجھے کوفے کا گورنر بنایا وہ سب سے بڑا جھوٹا ہے۔ وہ جھوٹا ہے اور اس کا باپ جھوٹا تھا۔ اے مرجانہ کے بیٹے! تجھے شرم

نہیں آتی کہ تو خلیفہ رسول علی ابن ابی طالب کو برا کہہ رہا ہے اور آل رسول کو قتل کر کے اس منبر پر بیٹھا ہوا ہے جو صدیقوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔"

جناب عبداللہؓ نے گرجدار آواز میں ابن زیاد کو للکارا۔ ابن زیاد کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا جناب عبداللہ دوبارہ گرجنے لگے

"خدا تیرا منہ توڑ دے ابن زیاد اور تیرے باپ دادا پر لعنت کرے اور تجھ پر ایسا عذاب نازل کرے کہ تو دنیا میں ذلیل و خوار ہو اور آخرت میں جہنم تیرا ٹھکانہ قرار پائے۔ کیا حسین علیہ السلام کا قتل تیرے لئے کافی نہیں تھا۔ اب تو ان کے بزرگوں کو برا بھلا کہہ رہا ہے۔ خدا کی قسم! میں نے اپنے کانوں سے رسول خدا کو یہ کہتے سنا ہے کہ جس نے علیؑ کو برا کہا اس نے مجھے برا کہا اور جس نے مجھے برا کہا اس نے اللہ کو برا کہا اور جس نے اللہ کو برا کہا خداوند تعالیٰ اسے منہ کے بل جہنم کی آگ میں ڈال دے گا۔"

ابن زیاد کے لئے ان کا یہ رد عمل بالکل ہی غیر متوقع تھا۔ وہ غصے کی شدت سے آگ بگولا ہو گیا۔ "اس بڈھے کو پکڑ کر میرے پاس لاؤ۔" اس نے تقریباً چیختے ہوئے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔ سپاہی تیزی سے جناب عبداللہ کی جانب بڑھے۔ ابن زیاد کا حکم سن کر جناب عبداللہؓ نے اپنے قبیلے والوں کو آواز دی۔

ان کے قبیلے کے کئی نوجوانوں نے اپنی تلواریں نیاموں سے باہر نکال لیں اور تیزی سے ان کی مدد کے لیے آگے بڑھے۔ "اے عامر! وقد اعبداللہ سے جسم پر آ

خراش بھی آئی تو پھر یہاں کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔" بنی ازد کا ایک نوجوان تلوار ہوا میں لہراتے ہوئے چیخا۔

ابنِ زیاد کے سپاہیوں کے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ وہ ہاتھ میں تلوار تھامے ساکت کھڑے تھے اور ابنِ زیاد کے حکم کے منتظر تھے۔ ابنِ زیاد کے مکروہ چہرے پر ناگواری کے اثرات تھے۔ اس کے سازشی ذہن نے چند ہی لمحوں میں فیصلہ کیا اور اس کے چہرے پر ایک سفاکانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ "پیچھے ہٹ جاؤ"۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔

سپاہی پیچھے ہٹے تو قبیلہ بنی ازد کے نوجوانوں نے جناب عبداللہ ابنِ عفیفؓ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ جناب عبداللہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ بہ آوازِ بلند یزید اور ابنِ زیاد کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ ان کے قبیلے والے انھیں اپنے حلقے میں لئے ہوئے دربار ابنِ زیاد سے باہر نکال لے گئے۔

ابنِ زیاد کے چہرے پر سفاکانہ مسکراہٹ جم گئی تھی۔ اس کے شیطانی دماغ میں ایک منصوبہ تیار ہو رہا تھا اور وہ بے اختیار مسکرائے جا رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی چمک تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دربار برخواست کرنے کا حکم دیا۔ جب سب لوگ چلے گئے تو اس نے اپنے وفادار غلام خولی اصبحی کو قریب بلایا اور اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔

☆☆☆

عبداللہ ابنِ عفیفؓ عشاء کی نماز سے فارغ ہوئے تھے کہ ان کے گھر کی گلی گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونجنے لگی۔ خطرے کا احساس ہوتے ہیں عبداللہؓ نے اپنی تلوار

نیام سے باہر نکالی اور ایک تنگ جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے اپنی چھوٹی سی بیٹی سے کہا۔ "بیٹی! میری بینائی ختم ہو چکی ہے اس لئے تم بس مجھے آواز دے کر بتاتی رہنا کہ دشمن کس طرف سے حملہ کر رہا ہے۔"

وہ ابھی یہ کہہ ہی رہے تھے کہ یزیدی فوجی دروازہ توڑ کر ان کے گھر میں داخل ہو گئے۔ انھوں نے گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہونا شروع کیا تو عبداللہؓ کی تلوار چلنے لگی۔ کئی سپاہی مارے گئے مگر آخر کار ابن زیاد کے فوجیوں نے عبداللہؓ کو ہر طرف سے گھیر کر گرفتار کر لیا۔

خولی اصبحی نے انھیں گرفتار کر کے یزیدی گورنر عبیداللہ ابن زیاد کے سامنے پیش کیا۔ عبداللہ ابن عفیف کا دل کربلا سے اٹھنے والی روشنی سے منور ہو چکا تھا۔ ان کی سانسوں میں کربلا کے گلابوں کی خوشبو مہک رہی تھی۔ رسول کریم کا یہ صحابیؓ نواسہ رسول کی محبت سے سرشار تھا۔ انھوں نے ابن زیاد اور اس کے درباریوں کی طرف حقارت کے ساتھ رخ کیا اور بولے

"ابن زیاد! میں نے اپنے دوستوں کو وصیت کر دی ہے کہ وقت آگیا ہے کہ تم دشمنان اسلام کے سامنے ڈٹ جاؤ۔ اپنے گھوڑوں، تلواروں اور نیزوں کا رخ دشمن کی طرف کر دو۔ اپنے دلوں کو حسینؑ کی محبت سے بھر دو جس کے نانا اور باپ بہترین مخلوق اور تمام دنیا والوں کے لئے راہ ہدایت تھے۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ جب سورج مشرق سے طلوع ہو تو تم حسینؑ کی مصیبتوں پر آنسو بہاؤ اور جب رات کے اندھیرے چھانے لگیں تو امامؑ کی

مظلومیت پر گریہ کرو۔ اس قوم پر اللہ کی لعنت ہو جس نے امام حسینؑ کو خط لکھے جبکہ اس قوم میں نہ کوئی دینِ اسلام کا مددگار تھا نہ اپنے وعدوں کو پورا کرنے والا۔۔۔"

ابنِ زیاد کے ہونٹ نفرت سے بھنچے ہوئے تھے اور وہ بے تابی سے اپنی ڈارھی کے بالوں کو نوچ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عبداللہؓ اب اس کی گرفت سے نہیں نکل سکتے۔ اسے اب کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ عبداللہؓ کے دل کی باتیں سننا چاہتا تھا تاکہ ان کے ایمان اور ان کے قبیلے والوں کے ممکنہ ردِ عمل کا اندازہ لگا سکے اسی لیے وہ خاموشی سے جناب عبداللہؓ کی تقریر سن رہا تھا۔

عبداللہؓ کے لہجے میں بلا کا درد تھا۔ ان کی بے نور آنکھوں میں عجیب سی چمک آگئی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے:

"کربلا میں جنگ کی آگ بھڑکی تو کوئی ایسا نہیں تھا کہ ان بد کردار یزیدی فوجیوں کو امامؑ سے دور کرتا اور کوئی ایسا نہیں تھا جو کہتا کہ اس پاک و پاکیزہ انسان حسینؑ ابنِ علی کو قتل کر کے عذاب میں گرفتار ہونے سے بچو!

اے اللہ! اس قوم کی سزا ذلت و رسوائی قرار دے جس نے انھیں قتل کیا۔ کاش اس وقت میں ان کے ساتھ ہوتا اور جب تک میری جان میں جان رہتی دشمنوں سے جنگ کر کے ان کی حفاظت کرتا لیکن میری مجبوری سب کو معلوم ہے۔ یہ میری بد قسمتی ہے کہ میں نابینا ہو گیا ہوں۔۔۔"

شام کبھی رسیوں سے باندھ کر قیدیوں کی طرح دربار شام میں لائے تھے آج اسی ملک میں "خدا کی بیٹی" کہلاتی ہے۔

اللہ رب العالمین نے دین اسلام کو بچانے والے اپنے خدائی لشکر کے سید و سردار کو اس کی عظیم قربانی کا کیا اجر عطا کیا اس کا احاطہ کرنا کسی انسان کے لیے ممکن نہیں لیکن اس کا کسی قدر اندازہ ان انعامات سے کیا جا سکتا ہے جو کائنات کے مالک نے حسین علیہ السلام کو اس دنیا میں عطا کیے۔

اسلام کے دشمنوں نے فرات کا گدلا پانی بند کر دیا تھا حسینؑ اور ان کے بچوں پر تو محرم کے دنوں میں ساری دنیا گھوم کر دیکھیں کہ کتنا شفاف، پاکیزہ، خوشبودار اور ٹھنڈا پانی حسینؑ اور ان کے بچوں کے نام وقف ہو گیا ہے۔

دشمنوں کے ظلم کی وجہ سے حسینؑ کا چھ ماہ کا بچہ دودھ سے محروم ہو گیا تھا۔۔۔ تو آج اس بچے کے نام پر دودھ کی نہریں جاری ہیں۔

دشمنوں نے حسینؑ کی بہنوں کے سروں سے چادریں چھین لی تھیں۔۔۔ تو آج ملت اسلامیہ کی کروڑوں عورتوں نے ان چادروں کو اپنا حصار بنا لیا ہے۔

حق کا پرچم بلند کرنے پر حسینؑ کا بازو کاٹ دیا تھا دشمنوں نے۔۔۔ تو دریائے فرات کے کنارے گرنے والے اس پرچم کو اب لاکھوں نوجوانوں نے اٹھایا ہے۔ دشمنانِ اسلام اب اگر ان لاکھوں بازوؤں کو کاٹیں گے تو آنے والے زمانوں میں کھربوں بازو اس پرچم کو سربلند رکھنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دیں گے۔

عاشور کے دن اسلام کے دشمنوں نے حسینؑ کے نماز پڑھنے والے، قرآن کو سینوں میں بسانے والے، رکوع و سجود میں راتیں بسر کرنے والے تمام ساتھیوں کو

مارڈالا تھا تو آج نمازوں کے وقت زمین کے چپے چپے پر گونجتی اذان کی آوازیں، نوجوانوں سے چھلکتی مسجدیں، نمازِ شب کے لیے جاگتے لوگ، تلاوت میں مصروف بوڑھے، اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک سفر کرتے عزاداری کے عظیم الشان جلوس اس بات کا ثبوت ہیں کہ اللہ رب العالمین نے حسین علیہ السلام کے تھوڑے سے ساتھیوں کے بدلے میں انھیں ایک پوری قوم عطا کردی ہے۔ ایسی، باعمل، مستعد ، بہادر اور نڈر قوم جو آج کے یزیدوں سے اچھی طرح نمٹنا جانتی ہے۔

بس اس قوم کو کسی کا انتظار ہے۔ جس دن یہ انتظار ختم ہوا، اس دن یزیدوں ہی کو نہیں، ان کے ازلی سرپرست کو بھی کرۂ ارض پر چھپنے کی جگہ نہیں ملے گی۔

"اللھم صل علی محمدؐ و آل محمدؐ عجل فرجھم"

کربلا کے حوالے سے لکھی گئی یہ کتاب آپ کو کیسی لگی؟

مجھے آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔

محمد علی سیّد

F-14 رضویہ سوسائٹی، ناظم آباد، کراچی۔

E-mail: alisyed@hotmail.com
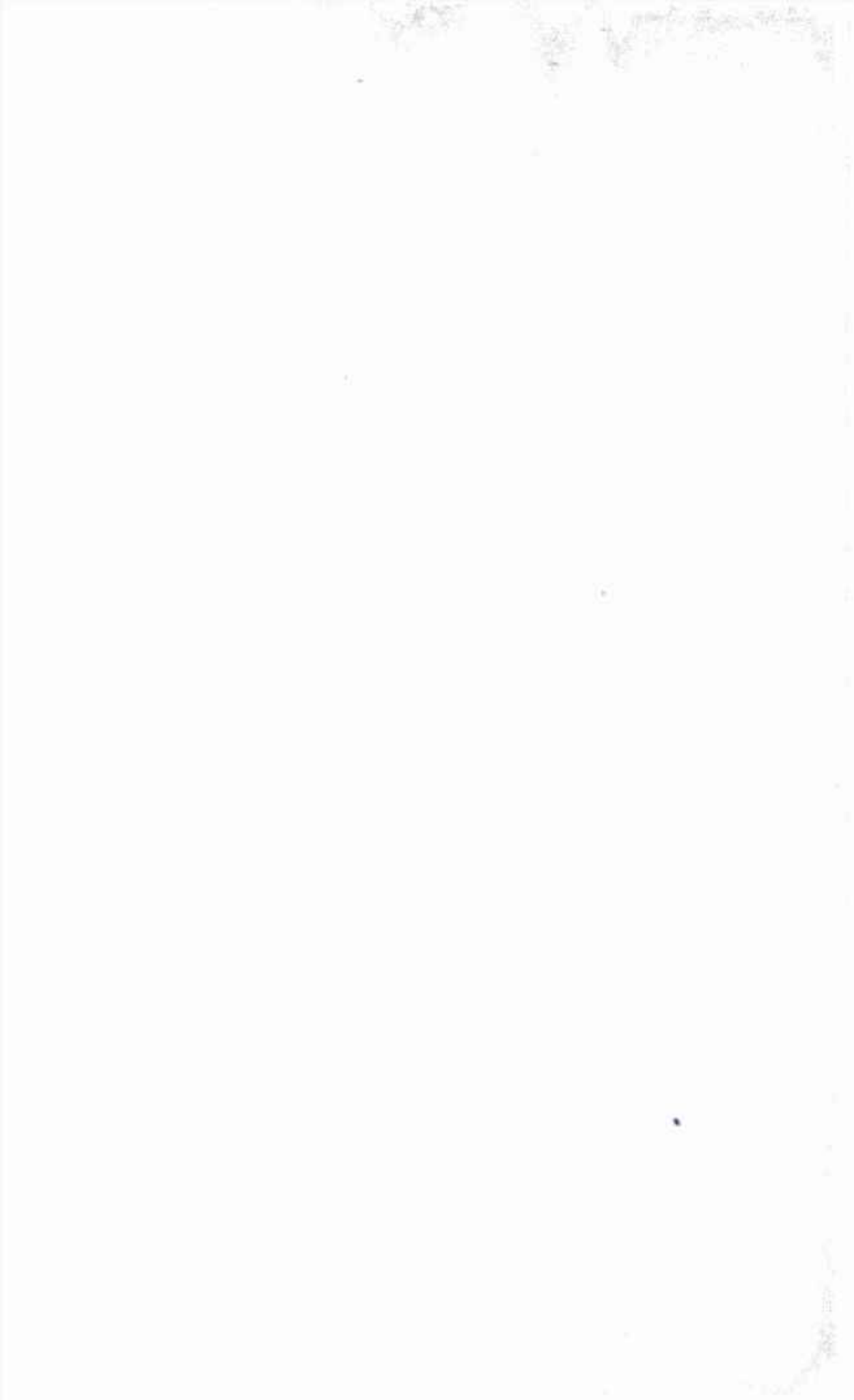
اس کتاب کے بارے میں

حجتہ الاسلام والمسلمین علاّمہ طالب جوہری کی رائے

زیرِ نظر کتاب "لہو کی موجیں" محمد علی سیّد کے قلم کا ایک تازہ نمونہ ہے۔ یہ کتاب ایک ایسے واقعے پر مشتمل ہے جو کائنات کا سب سے سچا اور سب سے انوکھا واقعہ ہے۔ سچی کہانیوں کے بیان کی روایت بہت قدیم ہے۔ شاید تاریخ انسانی کے گمنام ماضی کے اس عہد سے کہانیاں انسان کی ہم سفر ہیں جب تہذیب انسانی گھٹنیوں چلنا سیکھ رہی تھی۔ سچی کہانیاں آسمانی کتابوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ قرآن مجید نے تو خصوصیت کے ساتھ سچے قصوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

ناول کے متعلق عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا مواد فرضی واقعات پر مبنی ہوتا ہے لیکن انسائیکلوپیڈیا کے مطابق "ناول" نثر میں بیان شدہ ایسے قصے کو کہا جاتا ہے جو اپنی طوالت کے سبب ایک یا ایک سے زائد جلدوں پر مشتمل ہو۔ اس کے کردار فرضی یا خیالی بھی ہو سکتے ہیں اور بالکل سچے اور حقیقی بھی۔

اردو زبان کے متعدد ادیبوں نے ناول کی مخصوص فارم سے استفادہ کرتے ہوئے ضخیم تاریخی ناول تحریر کیے ہیں۔ یہ ناول آج بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں لیکن ان میں بیان کردہ واقعات کی سچائی بیشتر صورتوں میں مشکوک نظر آتی ہے۔ بہت سے لکھنے والے انہی تاریخی ناولوں کی مدد سے اصل تاریخ کو مسخ کرنے یا بہت سے حقائق کو مشکوک بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

محمد علی سیّد کا یہ ناول "لہو کی موجیں" تاریخِ انسانی کے ایسے سچے کرداروں پر مشتمل ہے جو اسلام کے اصل ہیرو ہیں اور جن کے سچے جذبوں، بے مثال قربانیوں اور پیغام کو روکنے، مسخ کرنے، حقائق کو دھندلانے یا ان واقعات کی اثر انگیزی کو کم سے کم کرنے کیلئے سرکاری مورخوں کی ایک فوج ظفر موج گزشتہ چودہ سو برس سے بھرپور وسائل اور بے پناہ قوت کے ساتھ مصروفِ عمل رہی ہے۔ اس کے برعکس موجودہ زمانے کے مطابق جدید اسلوب بیان اور عام فہم زبان میں اپنے قلم کے ذریعے حق بیان کرنے والوں کی صفیں غیر منظم اور بے ترتیب نظر آتی ہے۔

گہرے علمی اور تحقیقی مقالوں کی اہمیت اپنی جگہ لیکن آج ہمیں عام فہم زبان اور جدید اسلوب بیان میں لکھنے والوں کی بھی سخت ضرورت ہے۔ تراجم سے قطعِ نظر اردو زبان میں ایسے لکھنے والے مفقود نہیں تو کمیاب ضرور ہیں جن کی تحریریں محمد علی سیّد کی تحریروں کی طرح عام قاری کے دل کو چھو سکیں، اس کی روح کو جھنجوڑ سکیں۔

مجموعی طور پر یہ کتاب عزائی ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے اس لیے کہ جو روح اس پوری کتاب میں جاری و ساری ہے وہ ہے حسینؑ شناسی، کربلا شناسی اور اس کے نتیجے میں خود شناسی۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری نسلِ نو خاص طور پر اس کتاب کا خاطر خواہ خیر مقدم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کتاب کے مندرجات میں بھی غور و فکر کرے گی۔ میں درگاہِ خداوندی میں دست بہ دعا ہوں کہ محمد علی سیّد بہ طفیلِ آئمہ طاہرینؑ بیش از بیش علم و دین کی خدمت کی توفیق حاصل کرتے رہیں۔

طالب جوہری

۱۱ فروری ۲۰۰۱ء